کراچی
ماہنامہ
سچی کہانیاں
January
2016
☆ ''مسئلہ یہ ہے'' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکہ خیز ناول

پرنٹر: حسام محی الدین عباسی' سٹی پریس' OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی / 021-35893121-35893122

... 900 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

تجدید عہد وفا

16 دسمبر 2014ء وہ تاریخ ہے جب پاکستان میں بسنے والا ہر شخص تڑپ گیا تھا، دہل گیا تھا۔ ظلم و بربریت کی وہ داستان رقم کی گئی جو نہ پہلے کبھی سنی اور نہ ہی آئندہ کبھی سنی جائے گی۔ جگر چھلنی چھلنی، ہے آج بھی آنکھوں سے لہو رواں ہے۔ کاش یہ 16 دسمبر آئی ہی نہ ہوتی! کاش 15 کے بعد 17 دسمبر کی تاریخ ہوتی۔ ایک سال قبل جو کچھ آرمی پبلک اسکول میں ہوا اس نے انسانیت کو شرما دیا۔ الفاظ ساکت ہو گئے اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ آج بھی ٹی وی اسکرین پر چلنے والے وہ مناظر ہم سب کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم دور بیٹھ کر بھی اس دکھ کو محسوس کر سکتے ہیں، جس سے لواحقین اب تا حیات گزریں گے۔ یہ دکھ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتا ہی جائے گا۔ بحیثیت پاکستانی اور انسان ، آیئے مل کر جانے والوں کے ایصال ثواب کے لیے دعا کریں، لواحقین کے صبر کی التجا کریں اور یہ عہد کریں کہ ہم ہمیشہ اپنے دشمنوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی مانند کھڑے رہیں گے۔ اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں گے۔ اور کبھی دشمن کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔ ہم اپنے بچوں کا خون ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اپنے دشمنوں کو جہنم واصل کر کے ہی چین کی سانس لیں گے۔

منزہ سہام

ہم اور ہمارے مہمان

ہمارے لکھاری ہمیشہ ہمارے دل کے بہت قریب رہتے ہیں۔ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب قلم برادری کی کہکشاں ثابت ہوتی ہے۔ بھلا کون ہے جو پرل پبلی کیشنز کی قلم دوستی کا معترف نہیں۔ اپنے لکھاریوں کو مان دینا ہماری روایت رہی ہے۔ منزہ سہام اس روایت کی پاسداری بحسن وخوبی نبھا رہی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ان کے صاحبزادے دانیال شمسی اور زین شمسی بھی ہم قدم ہیں۔ پچھلے دنوں اپنے کچھ نئے اور پرانے لکھاریوں کے لیے ایک ظہرانہ دیا گیا' جس کے کچھ یادگار پل بصورت تصاویر قارئین کی نذر......!

منزہ سہام، سنبل، شگفتہ شفیق، فرح اسلم قریشی، رضوانہ پرنس، علی زبیر ظہرانے سے پہلے

سنبل کے شوہر نامدار واجد نور خان، علی زبیر، فرح اسلم قریشی کی صاحبزادی خضراء، نئی لکھاری ساتھی ماریہ یاسر، کاشی چوہان اور نزہت جبیں ضیاء ظہرانے سے پہلے دیگر ساتھیوں کا انتظار کرتے ہوئے

دوران ظہرانہ لکھاری ساتھی خوشگوار موڈ میں...... اپنی مدد آپ کرتے ہوئے

دوران ظہرانہ منزہ سہام، ماریہ یاسر، رضوانہ پرنس، فرح اسلم قریشی اور شگفتہ شفیق

ظہرانے کے بعد...... شائستہ عزیز، منزہ سہام، سنبل، ڈاکٹر الماس روحی، سیمار ضا ردا خوش گوار موڈ میں

رفعت سراج، رضوانہ پرنس، شگفتہ شفیق، منزہ سہام، سیمارضا ردا اور شائستہ عزیز

دانیال شمسی، شگفتہ شفیق، منزہ سہام اور زین شمسی ظہرانے کے بعد

سنبل، فرح اسلم قریشی، نزہت جبیں ضیاء، شگفتہ شفیق، سیمارضا ردا، رضوانہ پرنس، دانیال شمسی
رفعت سراج، منزہ سہام اور زین شمسی ظہرانے کے بعد

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

سارے کام نمٹ جانے کے بعد بس اِک آخری کام! آپ سے ملاقات رہ جاتا ہے۔ ہر روز اِک نئی بات سوجھتی ہے کہ اس ماہ یہ کہنا ہے، وہ کہنا ہے مگر جیسے جیسے دن گزرتے ہیں، آپ کے لیے کہانیوں کی کشید، مجھے آپ سے کی جانے والی نئی باتوں کے سرے اُلجھا دیتی ہے اور آخر میں پھر تہی داماں، یہی سوچنے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ اپنے پیاروں سے کیا کہوں۔ سچ کہنا، سچ سننا اور سچ پر عمل پیرا ہونے کتنا مشکل کام ہے...... مگر کیا کہیں سچ کو بھی اِک سلیقۂ اظہار چاہیے ہوتا ہے، کبھی کبھی کئی گھنٹے قلم کو ہاتھ میں دبائے دبائے گزر جاتے ہیں۔ لگتا ہے لفظ قلم سے قرطاس پر آ کر سچ کہیں گے تو کہیں قرطاس سے گر ہی نہ جائیں۔ سردیاں کتنی پھیکی ہوتی ہیں اور گرمیاں...... اِس سے بھی زیادہ جاں کنی میں غلطاں کرتی ہیں۔ دل کا موسم، بڑا سچا ہوتا ہے۔ دل کا موسم بڑا رس بھرا ہوتا ہے۔ سے پلٹتا ہے نا ملٹے گا۔ مگر سچ اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے۔ بس یہی کہنا ہے۔ نئے سال کا پہلا شمارہ، ساری دیوانگی اور سخن کاری لیے، آپ کی نذر...... کہیے شمارہ کیسا لگا۔ آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

آیئے احوال کی ابتداء کرتے ہیں ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی سنبل کے نام سے ادار یہ معجزہ کے سلسلے میں، میں بھی منزہ کے ساتھ دعا گو ہوں۔ احوال میں سب کے حال احوال معلوم ہوئے الماس روحی کو PHD کی مبارک باد۔ کاشی تمہاری نظم بڑی زبردست تھی۔ نعمان کی دل آباد

بہت اچھی تھی خصوصاً عاشر کا احسن کو اتنے اچھے انداز میں سمجھانا۔ ہانڈی وال کیا کہیں اس اندھے قانون کو۔ می می می بہت خوبصورت کہانی تھی۔ مانوس اجنبی بس ٹھیک تھی۔ بھرم بھی ٹھیک ہی تھی۔ ?اَت خدا داوَیرمکافات عمل پر بڑی اچھی کہانی تھی، دکھ کی فصل بھی مکافات عمل پر ہی تھی یہ بھی اچھی تھی کانچ کی گڑیا بے خبرنا عاقبت اندیش ماں کی اچھی کہانی تھی۔ مصحف ٹھیک تھی۔ قرض ایک لیٹرے کے انجام کی کہانی اچھی تھی اگر کچھ تفصیلات میں نہ جایا جائے تو کہانی کی پاکیزگی مجروح نہ ہو۔ ہم شکل مجھے بہت پسند ہے کیونکہ مجھے ایڈونچر پسند ہے۔ کمپنی بہت اچھی کہانی تھی۔ انصاف اور دھندا بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ کرب ایک مجبور بے بس عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی اچھی کہانی تھی۔ صنم بلوچ مجھے پسند ہے اس کا انٹرویو اچھا تھا۔ دوسری بیوی ایک نا عاقبت اندیش عورت کی اچھی کہانی تھی۔ بیٹا بس ایسی ہی تھی۔ قصور کس کا؟ بہت اچھی تھی۔ ایک چھوٹی سی لو اسٹوری گزارے لائق تھی۔ قدرت بہت کمال کی اسٹوری تھی۔ ندامت واہ بھئی اچھی محبت تھی کہ بندہ ڈاکو بن گیا واپسی بہت اچھی تھی اور زہر عشق یار سلمان پر پہلے کم آفتیں تھیں کہ مزید ہم زاد صاحب اور اوپر سے صنوبر کا بھی دوبارہ پیچ اَپ ہو گیا ہے۔ دیکھیں اب آگے کیا ہوتا ہے۔ ویلڈن کاشی کیپ اِٹ اَپ۔ بابا جی کی تو بات ہی الگ ہے اللہ انہیں زندگی اور صحت عطا کرے (آمین) ہائیڈ پارک بہت اچھا سلسلہ ہے۔ یہ تو ہو گیا تبصرہ اب تم سناؤ کیسے ہو۔ دیکھ تمہارے کہنے پر فوراً وقت نکال کر تبصرہ لکھا ہے حالانکہ ہاتھ میں درد تھا، دسمبر کا شمارہ بھی نہیں آیا تھا سو نومبر پر ہی تبصرہ کر دیا۔ اب اجازت دو اپنا خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا فی امان اللہ فقط نبیل

☆: اچھی سنبل جی! یقین جانیں، جس وقت کوئی بہت اپنا احوال میں شریک ہوتا ہے تو لگتا ہے جیسے محبتیں اپنے تمام رنگوں سمیت احوال میں نئے رنگ بھر رہی ہیں۔ سلامت رہیے اور ہاں اگلے ماہ کے لیے ابھی سے آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✉ ایم اشفاق بٹ۔ لالہ موسیٰ سے لکھتے ہیں۔ ماہ دسمبر 2015 کا پراسرار نمبر 3 خوفناک کھوپڑیوں کی جادوگرنی جس نے اپنے دائیں ہاتھ میں جادوئی چھڑی پکڑ رکھی تھی۔ منزہ سہام جی کا نابینا پڑھا۔ احوال میں پرانے اور کافی چہرے نئے نظر آئے کاشی کی باتیں پڑھیں واقعی کاشی اس پاکستان کو نقصان ہم خود ہی پہنچاتے ہیں۔ احوال میں ممتاز احمد، مقصود احمد بلوچ، مہک، علی رضا، ایم ارشد وفا، مومنہ بتول، سدرہ انور علی، فریدہ فری، عظمیٰ شکور کے احوال قابل تعریف تھے۔ خوفناک کہانیوں میں محمد سلیم اختر، وقاص حسین، ارم ناز، حنا بشریٰ، ابو ہریرہ بلوچ، شائستہ انور، حمیرا خان، ممتاز احمد، شمسہ قمر، شازیہ محسن، نوشین آرا، کاشی چوہان کا ناول زہر عشق، ان سب کی بہت پر اسرار کہانیاں تھیں۔ ان سب کو کاشی صاحب میری طرف سے بہت بہت مبارک باد ضرور دیں۔ ہائیڈ پارک میں زبیدہ اکرم، فرح عالم، ڈاکٹر علی حسنین، شبانہ، مقصود احمد بلوچ، ایم ارشد وفا، نزہت ناز، عظمیٰ شکور، عماد حسین، شاہانہ احمد، صائمہ بشیر، امجد علی، ان سب نے ہائیڈ پارک میں خوب

سانحہ ارتحال

ہماری ہردل شاعرہ اور لکھاری ساتھی گل ملک اب ہم میں نہیں۔ گزشتہ ماہ گل طویل علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں اُن کے اہل خانہ کے ساتھ ہے۔ اور درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے

چہل قدمی کی۔ خوب کرو چہل قدمی صحت اچھی ہو جائے گی۔ خاص طور پر ایم ارشد وفا اور مقصود احمد بلوچ آپ لوگ تھوڑے موٹے ہو جاؤ۔ تیر نیم کش میں سب نے تیر کمان سے خوب نکالے اچھی شاعری کی۔ لو جی خدا حافظ۔

☆: اچھے اشفاق! بھیا آپ اتنے عرصے احوال سے دور کیوں رہے؟ اسی لیے خوب صحت بنالی۔ آپ کو بھی چہل قدمی کی ضرورت ہے۔ ہر ماہ احوال میں آکر چہل قدمی کیا کریں۔

✉ ثناء ابڑو، جیک آباد سے عرض کرتی ہیں محترم کاشی چوہان بھائی کیسے ہیں آپ؟ آپ کا بہت شکریہ کے آپ نے مجھے احوال میں جگہ دی۔ بھائی انشاء اللہ مور شاہد حسین کی طرح ہر ماہ پابندی سے احوال میں شرکت کروں گی۔ بس آپ کی محبت اور حوصلہ افزائی درکار ہے۔ آنٹی منزہ سہام کے اداریہ نابینا سے لے کر تیر نیم کش تک ہر کہانی ہر سلسلہ دل کی آنکھ سے پڑھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے کہ کس کی تعریف کروں کس کی نہیں۔ لکھاری حضرات نے اپنے قلم کا خوب حق ادا کیا۔ آپ سمیت سب کو ثناء ابڑو کی جانب سے مبارک باد۔ مسز نوید ہاشمی، عظمٰی شکور، صائمہ مجید سلام و آداب۔ سدرہ انور علی آپ سے دوستی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مور شاہد حسین دعاؤں میں یاد رکھیں۔ زرینہ جونیجو اور تحسین جونیجو آپ کے فادر کی ڈیتھ کا پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ ہم تمام احوالی کاشی بھائی سمیت آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ انہیں صفحات پر ملاقات ہوگی؟ خدا حافظ۔

☆: پیاری ثناء! بیٹا تم ہمارے مور کی طرح پابند احوال رہنا۔ تم سب کی آمد ہی احوال کی رونق ہے۔

✉ مور شاہد حسین، قمبر شہدا کوٹ سے احوال کو رونق بخش رہے ہیں۔ سب سے پہلے اہل وطن کو سال نو مبارک۔ خدا کرے کے یہ سال ہمارے وطن عزیز کے لیے امن ترقی و خوشحالی بھرا ثابت ہو۔ آمین ثم آمین۔ کاشی بھائی پر اسرار کہانیوں کا مجموعہ (سچی کہانیاں) خوبصورت سرورق کے ساتھ موصول ہوا۔ اداریہ نابینا لفظ لفظ موتی۔ بھیا آپ اپنوں کی محبت بھری محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ سید ملازم حسین صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ مبارک باد۔ جونیجو سسٹر والد کی شفقت سے محروم ہوگئیں خدا ان کو اہل خاندان سمیت صبر دے اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔ بھابی صائمہ مجید آپ کی کہانی کا انتظار ہے۔ سدا سلامت رہیں۔ آپا مسز نوید ہاشمی آپ کی دعاؤں سے میں ایک دم فٹ ہوں۔ رب سائیں آپ کو بے پناہ محبتوں و چاہتوں سے نوازے۔ ثناء ابڑو دل کی

گہرائیوں سے بھلی کرے آیا۔ تمہاری آمد بھلی معلوم ہوئی۔ ممتاز احمد بھیا گڑیا رانی سدرہ انور علی مجید احمد بھیا آپ کیسے ہیں پر خلوص دعائیں آپ کے نام۔ احوال میں تمام نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ آپ سب سے مل کر دلی مسرت ہوئی۔ فیصل ندیم بھیا، محمد عزیز بھائی۔ محمد اسماعیل بروہی آپ سب کہاں ہیں۔ ہم بھی اپنے آشیانے میں واپس آگئے ہیں۔ (کاشی بھائی آپ کا حکم سر آنکھوں پر) اسماء اعوان ہمیشہ کی طرح بے مثال تحریر لائیں۔ پہلی پانچ حیرت انگیز اسرار میں ڈوبی بے مثال تحریریں تھیں۔ بیری کا آسیب، انارکلی، چھپکلی یا...... بے حد اچھی تھیں۔ ہم شکل اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ہولناک کہانیاں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ ناگ کہانیاں اتنی خوبصورت تحریریں پیش کرنے پر مصنفین کو مبارک باد۔ فرعون کے قیدی خاص لگی۔ ممتاز احمد بھیا آپ کی تحریریں دل کو چھو لیتی ہیں۔ مختصر کہانیاں اسرار میں لپٹی جامع لگیں۔ 'زہر عشق' رسالے کی جان ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش پسندیدہ سلسلے ہیں۔ بس بھیا آخر سطر۔ تمام چاہنے والوں کے لیے ڈھیروں پر خلوص دعائیں اور بے پناہ محبتیں و چاہتیں۔

☆: اچھے مور! تم ہمیشہ ہمیں یاد رہتے ہو۔ رابطوں میں دوری، محبت کو کم نہیں کر سکتی۔ خوش رہو۔

✉ سلیمان شبیر، اکوال، تلہ گنگ سے شاملِ احوال ہیں ماہ دسمبر کا ماہنامہ 28 نومبر کو ملا۔ سب سے پہلے آنٹی منزہ سہام کا ''نابینا'' پڑھا۔ ہم تو ہر کام ہی ''نابینا'' بن کر کرتے ہیں۔ خیر اس احوال میں پہنچے جہاں سب بہن بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ احوال اور پرچے کو جس طرح آپ محبت سے چلا رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس گلشن کو سدا مہکتا رکھے۔ (آمین) احوال میں محترم ممتاز احمد بھائی، بھائی زاہد حسین، صائمہ بشیر، مقصود احمد بلوچ، مومنہ بتول، شازیہ گل، پیاری بہن سدرہ انور علی، بہن منزل خان، فریدہ جاوید، آپا مسز نوید ہاشمی، بھائی مور شاہد حسین اور تمام احوالیوں نے اپنے اپنے انداز میں خوب تبصرے کیے۔ اس ماہ کی سب سے اچھی کہانی جو مجھے لگی وہ 'زہریلی کوکھ' حاسم وقاص کی تھی۔ پراسرار نمبر میں اس سے پہلے اتنی منفرد کہانی نہیں چھپی۔ ویلڈن حاسم وقاص 'بلی یا فردوس' محمد سلیم اختر، 'تحفہ' ابوہریرہ بلوچ، 'میں کیا کرتا' شعبان کھوسہ ''جھولی میں شیطان'' حنا فرید ''بھوت ٹرین'' ممتاز احمد اور اس کے علاوہ بھی تمام رائٹرز نے اچھی اسٹوریز پڑھنے کو دیں۔ حضرات سے معذرت۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش میں سب کے انتخاب لاجواب تھے۔ باباجی دکھی انسانیت کی جو خدمت کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دیں۔ (آمین) ہم شکل اور زہر عشق بہت دلچسپ ہوتی جا رہی ہیں۔ دونوں کی موجودہ اقساط پڑھ کے مزا آگیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ تمام احوالیوں، قارئین کرام اور تمام اسٹاف سچی کہانیاں کو نئے سال کی مبارکباد، اس کے ساتھ ہی اگلے ماہ تک اجازت۔

☆: پیارے سلیمان! جیو، تبصرہ زبردست رہا۔ یہ بتاؤ تم کب تک کوئی کہانی ارسال کرو

سانحہ ارتحال

ہماری ہر دل عزیز قاری اور لکھاری ساتھی رضوانہ کوثر کی والدہ محترمہ گزشتہ ماہ اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں اُن کے ساتھ ہے اور مرحومہ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے۔

گے؟

✉ سید ملازم حسین شیزاری، کوہاٹ جیل، خیبر پختونخوا سے ہمارے ساتھ ہیں۔ لکھتے ہیں محمد سلیم اختر کی تحریر 'داری'۔ کہانی میں رومانی اور روحانی کیفیات ملتی ہیں۔ ندیم عباس میواتی کی تحریر ''کتے کی موت'' عبرت ناک کہانی ہے۔ طرزِ تحریر میں روانی ہے بہت اچھے۔ ارم ناز کی ''عزت دار'' میں نیا پن نہیں۔ تحریر جاندار۔ انداز لکھنے کا عمدہ ارم ناز صاحبہ لکھنا کبھی نہ چھوڑنا ایک دن آپ بہت بڑی کامیاب لکھاری ہوں گی۔ راشد لطیف 'پگلی' آفرین انیس کی 'صدقہ' 'نیکی کرتا جا' 'وڈیری' بھی بہتر تھیں۔ زیبا بدر کی 'جیت' بہت اچھی لگی۔ سماج سیوا کی از قلم حمیرا خان آج کل ہر جگہ ایسی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ ممتاز احمد کی قلی سے افسر تک نصیحت آموز تھی۔ ایم۔ اے۔ راحت کا ہم شکل...... کہانی کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے Very impressive کاشی چوہان کی تحریر ''زہر عشق'' کہانی پر تبصرہ کرنے کے لیے ایسی ڈکشنری کی تلاش ہے جس سے بہترین الفاظ کا چناؤ کر کے کاشی چوہان صاحب کو خراج تحسین پیش کیا جائے۔

☆ عزیز بھائی! تبصرہ کر کے دل خوش کر دیا۔ خدا آپ کو آپ کو صعوبتوں سے نجات عطا کرے۔

✉ نزابت اِفشال۔ مہورہ فتح جنگ سے لکھتے ہیں۔ سلام عقیدت کاشی بھائی! آپ کیسے ہیں۔ تمام احوالیوں کو بھی سلام اور دعا، نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید خصوصاً حسن نیازی، عثمان بلوچ، اور یاسر کے تبصرے بھی بہت اچھے تھے۔ کراچی سے مائی ایلڈر سسٹر فرح انیس آپی آپ کیسی ہیں؟ شکر ہے کہ دو ماہ کے بعد آپ نے حاضری دی، بہر حال اتنی تاخیر ہمارے لیے وجہ پریشانی ہے۔ آپ کا تبصرہ اور شاعری کا انتخاب بہت اچھا ہوتا ہے۔ اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آپ کا یہ چھوٹا بھائی ہمیشہ آپ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتا ہے کہانیوں میں 'وہ مانوس اجنبی'، بھرم، می می، قرض، دکھ کی فصل کٹ گئی، اور دیر ہے اندھیر نہیں سب کہانیاں اچھی تھیں۔ باقی احتیاط ضروری ہے۔ بہت سبق آموز کہانی تھی، ایسی گھٹیا حرکت ایک اُستاد کو نہیں جچتی، اللہ سب کو ہدایت کاملہ عطا فرمائے۔ اور آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ کاشی بھائی ایک تو شمارہ دیر سے ملا اور دوسرا یہ کہ کل 9 نومبر گزر گیا مگر آہ۔ مقام افسوس ہے کہ اِقبال جیسی عظیم ہستی کے جنم دن کی چھٹی منسوخ کر دی گئی حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

☆: پیارے نزابت! سلامت رہو۔ بہت ساری اور بھی ایسی دل دکھانے والی باتیں ہیں۔ تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔ اپنے کرم اچھے ہوں۔ تو زمانہ بھی خود ہی اچھا ہو جاتا ہے۔ تبصرہ مختصر مگر جامع تھا،

زبردست لگا۔

✉ جھنگ صدر سے ہماری پیاری بہن سدرہ انور علی لکھتی ہیں۔عزیز از جان بھیا کاشی چوہان، ڈیئر سسٹر، برادرز اینڈ آل اسٹاف السلام وعلیکم! اس امید کے ساتھ محفل میں آئی ہوں کہ تمام پڑھنے والے انشاء اللہ سلامت ہوں گے۔ دلکش و پراسرار ٹائٹل کے ساتھ 28 تاریخ کو دسمبر کا پرچہ ملا۔ منزہ آنٹی کا اداریہ، نابینا دل کی آنکھ سے پڑھا احوال میں سبھی نے بہت اچھا لکھا ماشاء اللہ۔ فرمان علی، علی رضا، ایم تحسین، عثمان رضا، سندس صبا، ثناء ابڑو کو احوال میں خوش آمدید نئے احوالی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا خط پڑھ کر بہت حیرانگی ہوئی ایک ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایٹم بم بناتے ہیں اور ایک......؟ ڈیئر ملکہ احوال تحسین جونیجو آپ کے والد کی ڈیتھ کا سن کر بہت افسوس ہوا اللہ رب العالمین انہیں اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے آمین۔ ابوذر غفاری، مومنہ بتول، سلیمان بشیر، سونیا خان، منزل خان آپی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ منزل خان آپی آپ کے بیٹے کی صحت کے لیے بہت ساری دعائیں۔ اسماء اعوان کی لائف بوائے اب کی دفعہ بہت ہی دلچسپ لگی ویلڈن۔ انکل محمد سلیم اختر کی بلی یا فردوس پسند آئی، وقاص حسین کی پری زاد، اس شمارے کی بیسٹ اسٹوری ہے۔ ارم ناز کی، کالا حبشی، بہت سنسنی خیز تحریر ہے۔ اجازت حنا بشری نے بہت خوبصورت کہانی لکھی بہت خوب۔ ابوہریرہ بلوچ کی، تحفہ پسند آئی، شائستہ انور کی، بیری کا آسیب، بہت رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانی تھی۔ نزہت جبیں ضیاء کی انارکلی بہت دلچسپ لگی۔ فوزیہ احمد کی چھپکلی، پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے کمانڈو شعبان بھیا ویلڈن، میں کیا کرتا، بہت اچھی کہانی لکھی۔ چمگادڑ کی مورتی، ملک محمد آھیر جھولی میں شیطان، حنا فرید احمد، خونی ڈنگل، سکندر حبیب، پردے میں رہنے دو، علی حسنین تابش حاسم وقاص، زہریلی کوکھ، مسٹر پرفیکٹ مجید احمد بھیا ناگن دوست ویلڈن، سانپ کا مذاق، زرغام محمود، حمیرا خان فرعون کے قیدی، محمد اسمعیل بروہی بھیا، جنوں والا بنگلہ، شمسہ قمر فلائٹ ٹو تربت، فیروز آباد کی انوری نوشین آراء، ہم نے گھر چھوڑ دیا فرح انیس، کیوں بھئی؟ نفیسہ فضل آنٹی کی، ہوٹل کی وہ رات، شازیہ محسن کی تین صدیوں بعد، منزل خان کی، کچھ انہونی یادیں سب کہانیاں اسرار میں لپٹی رونگٹے کھڑے کردینے والی دلچسپ وخوبصورت تحریریں لگیں۔ زہر عشق بہت کمال کی قسط لگی۔ سلمان ابراہیم چاروں طرف سے بری طرح مشکلات میں گھر چکا ہے بھیا اس کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونے پائے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش میں تمام لوگوں کے انتخابات پسند آئے۔ ثمینہ ناز آپی شائستہ جمال، ملکہ احوال تحسین جونیجو روبینہ آپی کنول عمران خان کمانڈو شعبان بھیا، عبدالعزیز انکل محمد عزیز بھیا آپ سب کدھر غائب ہیں پلیز واپس لوٹ آئیں۔ اسی بات کے ساتھ اجازت زندگی نے مہلت دی، سانسیں چلتی رہیں تو پھر ہوگی ملاقات تب تک اپنا ڈھیر سارا والا خیال رکھیے گا اللہ نگہبان

☆: پیاری گڑیا تمہارا برجستہ تبصرہ ہمیں بہت پسند ہے۔ تم بھی اپنا بہت سارا والا خیال

رکھنا۔

✉ کراچی سے ہماری نئی شاعرہ اور لکھاری ساتھی شمسہ قمر کی احوال میں پہلی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔آپ کی محفل میں پہلی دفعہ شرکت کر رہی ہوں۔ پراسرار نمبر میرے ہاتھ میں ہے۔ سرورق بہت اچھا ہے کھوپڑیوں کے ڈھیر کے ساتھ بیٹھی ہوئی حسینہ واہ! کیا زبردست آئیڈیا ہے۔ پراسرار کہانیوں کے بالکل مطابق۔منزہ سہام صاحبہ نے بالکل صحیح فرمایا۔ یقین مانیں کہ بیرون ملک جا کر دل بہت کڑھتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں ہارنوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور کہاں دوسرے ممالک میں ہارن بجانا ایک طرح سے جرم اور باعث شرمندگی ہے۔ یہاں لوگ اس شورشرابے کی وجہ سے بھی چڑچڑے ہوگئے ہیں۔حمیرا خان کی فرعون کے قیدی اچھی لگی اس کے علاوہ بھوت ٹرین، جنوں والا بنگلہ، ہوٹل کی رات بھی مناسب تھیں۔ وقاص حسین کی پریزاد بہت اچھی اور منفرد لگی۔سب نے اپنی اپنی جگہ اچھا ہی لکھا۔کاشی صاحب آپ کی زہر عشق، نزہت جبیں کی انارکلی غرض تقریباً ہر مصنف نے اچھا لکھا اور کسی کہانی کو بھی برا نہیں کہا جا سکتا۔اس دفعہ میں نے بھی فلائٹ ٹو تربت لکھی۔ اپنی کہانی کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی یہ تو قارئین ہی رائے دے سکتے ہیں۔ سرِ تسلیم خم جو مزاج یار میں آئے، ہمیں تو سب کی رائے کا احترام کرنا ہے اور تنقید کو تعمیر کے طور پر لینا ہے۔سعدیہ صاحبہ نے لندن سے جو غزل بھیجی وہ بھی اچھی تھی۔

☆: شمسہ جی! خوش آمدید! اچھی تحریر اپنی جگہ آپ بناتی ہے۔ آپ کا شمار بھی جلد معروف لکھاریوں میں ہوگا۔

✉ محمد قاسم خان بلوچ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، چک 184 گ ب سے شاملِ احوال ہیں، لکھتے ہیں: دسمبر کا شمارہ پراسرار نمبر 3 خوفناک اور حقیقت میں دل کو ڈرا دینے والے ٹائٹل کی صورت میں ملا۔ احوال میں سب سے پہلے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ پیارے شہر کراچی میں اب امن اور سکون کی فضا پھیل رہی ہے اور وہاں کے لوگ اب خود کو محفوظ اور پرامن محسوس کر رہے ہیں جو ایک چمتکار سے کم نہیں ہے، احوال میں اپنا تبصرہ پا کر بہت خوشی ہوئی۔کاشی بھائی آپ کا شکریہ کہ مجھے سچی کہانیاں میں جگہ دی۔ آپ ایک زندہ دل انسان ہو جو آپ کی طرف ایک قدم چل کر آتا ہے تو آپ اس کی طرف دو قدم چل کر جاتے ہو۔ سدا سکھی رہو باقی آپ پریشان نہ ہوں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آپ کے پرچے کی تعداد اب بڑھے گی انشاء اللہ بس آپ کا ساتھ چاہیے۔ کہانیوں میں اس دفعہ سب کی تحریریں قابل تعریف تھیں بس ہر کہانی پڑھتے ہوئے ایک عجیب سا خوف دل میں اٹھتا رہا کہ کہیں کوئی آفت ہی نہ دبوچ لے بھی کو سلام کرتا ہوں کہ جن کی کوششوں سے آج سچی کہانیاں شہرت کی طرف گامزن ہے اور ہوگا۔ہائیڈ پارک میں حدیث نبوی، نزہت ناز کا مرسلہ، عادل حسنین کی غزل، جنگلی لڑکی اور انمول موتی پسند آئے، تیر نیم کش میں صائمہ جی کا شعر اچھا لگا اور امید ہے آئندہ شمارہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر پسند آئے گا۔ آخر میں سچی کہانیاں کے تمام چاہنے اور لکھنے والوں کو نیک

دعاؤں کے ساتھ سلام سب سکھی رہے امن میں رہے خدا حافظ۔

☆: قاسم! خدا ہمارا آپ کا ساتھ برقرار رکھے۔ تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ ممتاز احمد، سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ پیارے کاشی! السلام علیکم! سب سے پہلے سچی کہانیاں کی پوری ٹیم، تمام رائٹرز اور قارئین کرام کو نئے سال عیسوی **2016** ء کی مبارک باد اس دعا کے ساتھ کہ اللہ کرے آنے والا سال سب کے لیے ڈھیروں خوشیوں، کامیابیوں کا پیغام لے کر آئے۔ سب بیماروں کو شفاء ملے، پریشان حال لوگوں کی پریشانیاں دور ہوں۔ بے اولادوں کو اولاد کی نعمت اور رحمت ملے۔ ہر طرف امن ہو عافیت ہو سلامتی ہو آمین۔ سال **2015** ء کا آخری شمارہ پراسرار نمبر **3** جاذب نظر اور دیدہ زیب ٹائیٹل کے ساتھ اور خوبصورت حسینہ کے دائیں پہلو میں کھوپڑیوں کے ڈھیر اور حسینہ کے ہاتھ میں پکڑے سنہری ماسک سے واقعی پراسرار لگ رہا تھا۔ اداریے میں منزہ سہام نے نابینا کے عنوان کے ساتھ ٹریفک کانسٹیبل اور ٹریفک کی مثال کے ساتھ بے ضمیروں کے ضمیر جھنجوڑنے کی عمدہ کاوش کی۔ احوال میں کاشی چوہان کے خوبصورت الفاظ اپنی خوشبو سے احوالیوں کو مہکار رہے تھے۔ عہد کے اظہار اور دعا پڑھ کر دل سے آمین نکلا۔ کوہاٹ کے سید ملازم حسین صاحب دعا ہے اللہ کریم آپ کو جلد از جلد قید و بند کی صعوبتوں سے رہائی نصیب فرمائے آمین۔ یہ آپ کی علم اور ادب سے سچی محبت کا بھرپور ثبوت ہے کہ آپ پابند سلاسل ہو کر بھی اپنی آمد سے احوال کو رونق بخشتے ہیں۔ سب سے پہلے محترمہ زرینہ جونیجو اور تحسین جونیجو کے والد محترم کے لیے دل سے دعا ہے۔ اللہ کریم ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے ان کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین یہ امر ربی ہے۔ جو دنیا میں آیا ہے اس نے پلٹ کر ایک دن اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔ والدین کا سایہ بہت بڑی نعمت ہے۔ یقیناً یہ آپ دونوں بہنوں کے لیے بہت دکھ، صدمے اور غم کی گھڑیاں ہیں اللہ پاک ہم سب پر فضل و کرم اور رحم میں اضافہ فرمائے، آمین۔ جن بہن بھائیوں دوستوں نے میری کہانی کو پسند فرمایا تہہ دل سے ان سب کا ممنون و مشکور ہوں۔ لاہور کے محترم جناب زاہد حسین صاحب نے اپنے بہترین اور خوبصورت الفاظ کے ساتھ میری کہانی پر مفصل تبصرہ لکھا یقین کیجیے مجھے اپنی تخلیق اور محنت کا پھل اور انعام مل گیا۔ تمام نئے احوالیوں کو خوش آمدید صفحہ نمبر **13** پر پہنچا تو دیکھ کر ایک دم ٹھٹک گیا۔ ارے یہ کیا......؟ کیا واقعی تین انعام یافتہ کہانیوں پر اتنا بڑا انعام دیا جائے گا......؟ سب دوستوں نے احوال میں بہت خوب لکھا۔ کراچی سے محترمہ نزہت ناز صاحبہ کا تبصرہ بہت خوبصورت اور شاندار تھا، نئے سال کی آمد کے حوالے سے جو نظم لکھی وہ دل کو چھوگئی بہت پسند آئی۔ منزل خان دعا ہے اللہ پاک آپ کے بیٹے کو صحت تندرستی عطا فرمائے۔ آمین مجید احمد جائی، محترم انیس الرحمٰن، میانوالی کے ملک محمد اکرم آھیر، مقصود بلوچ، ایم افضل آزاد، مور شاہد حسین السلام علیکم آپ سب کیسے ہیں......؟ کاشی بھیا احوال کے اختتام میں آپ کی نظم نے چار چاند لگا دیے بہت عمدہ نظم تھی کہانیوں میں سب سے پہلے مجید احمد جائی کی ''ناگن

دوست'' پڑھی حسب سابق اس بار بھی بہترین کہانی تھی۔ ملک محمد اکرام آھیر شاندار کہانی 'چمگادڑ کی مورتی' کے ساتھ موجود تھے۔ بہترین کاوش تھی ویلڈن، ارم ناز کی ''کالا حبشی'' حنا بشری کی ''اجازت'' فرح انیس کی ''ہم نے گھر چھوڑ دیا'' نفیسہ فضل کی کہانی ''ہوٹل کی وہ رات'' حاسم وقاص کہانی ''زہریلی کوکھ'' زبردست کہانیاں تھیں، تحفہ، بیری کا آسیب، انارکلی، چھپکلی یا...... میں کیا کرتا، جھولی میں شیطان، خونی دنگل چترہاری سانپ کا مذاق، فرعون کے قیدی، جنوں والا بنگلہ، فلائٹ ٹو تربت، تین صدیوں کے بعد بھی بہت اچھی کہانیں تھیں۔ مجموعی طور پر موضوع کے اعتبار سے پر اسراریت کے حوالے سے بس لکھاروں نے اچھا لکھا۔ ہائیڈ پارک میں سب سے بہترین انتخاب ''دعا'' نزہت ناز کا تھا۔ باجی صائمہ بشیر کی چھوٹی سی کہانی بہت لاجواب اور شاندار تھی۔ تیرنیم کش میں آپا رضوانہ کوثر کا انتخاب بہت شاندر تھا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اللہ نگہبان۔

☆: بھائی ممتاز! آپ کراچی آئے بہت اچھا لگا۔ آپ کی محبت صفحۂ قرطاس سے نکل کر ہمارے روبرو آ گئی، آپ سے ملاقات کے حسین پل یادوں کی پٹاری میں انمول ہو گئے ہیں۔ سلامت رہیے۔

✉ ہماری لکھاری اور شاعرہ بہن ارم خان! ڈی جی خان سے احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ اس ماہ رسالہ جلدی مل گیا اور دل خوش ہوگیا۔ رسالہ ملتے ہی احوال کی طرف بھاگی احوال کے آغاز میں آپ کی باتیں پڑھ کر اپنے پیارے وطن کی محبت مزید جاگ اٹھی۔ پھر آگے چل کر احوالیوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر ماہ کی طرح اس ماہ بھی کچھ نئے بہن بھائی شامل تھے۔ خوش آمدید اب ذرا بات ہو جائے ان بہن بھائیوں کی جنہوں نے میری کہانی اور تبصرے کو پسند کیا۔ ممتاز احمد، مجید احمد جائی۔ محمد ندیم، مور شاہد حسین، عثمان بلوچ، ملک محمد اکرم، زاہد حسین، شازیہ گل' سدرہ انوار علی، صائمہ مجید، سونیا خان، فرید جاوید فری، آپا مسز نوید ہاشمی، بہنا منزل خان، آپ سب کا بہت بہت شکریہ آپ سب نے میری کہانی اور تبصرے کو پسند کیا۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ اور ڈیئر سسٹر عظمی شکور میں آپ سے بس اتنا کہوں گی۔

باد پے زور کون چلائے ☆☆ جب چاہے وہ چلی آئے

کہانیوں میں بلی یا فردوس، کالا حبشی، اجازت، تحفہ، بیری کا آسیب، انارکلی، زہریلی کوکھ، ناگن دوست، فلائٹ ٹو تربت، بس اتنا پڑھ پائی اور پسند بھی آئے۔ تیرنیم کش میں سب نے خوب لکھا بھیا جی یہاں تو آپ نے مجھے گم ہی کر دیا بھلا کیوں پلیز اس ماہ گم نہیں ہونا مجھے۔ اور اک گذارش میری ایک اور کہانی جلدی سے لگا دیں نا...... اب اجازت انشاء اللہ اگلے ماہ پھر آؤں گی اگر زندگی نے وفا کی تو...... اللہ حافظ

☆: اچھی بہن! انشاء اللہ دوسری کہانی بھی نمبر آنے پر شائع ہو جائے گی۔ تبصرہ بہت اچھا

لگا آپ کا۔

✉ راولپنڈی سے فرزانہ نگہت عرض کرتی ہیں۔ ''انصاف'' کی اشاعت (ماہ اکتوبر) پر دلی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جلد شکریہ ادا کر دیتی۔ مگر ناسازیٔ طبع کا زور رہا...... معذرت خواہ ہوں۔ اب یہ ایک اور معصوم سی کہانی حاضرِ خدمت ہے۔ ماضی واقعی خوب ڈھیروں ڈھیر واقعات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہوتا تھا۔ اس کی راکھ میں کرید کرید کر آپ کو ایسی ہی 'معصوم' سی سچی کہانیاں بھیجتی رہوں گی۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور تعریف نے سیروں خون بڑھا دیا۔ قارئین کے اظہارِ پسندیدگی نے بھی۔ 'سچی کہانیاں' کی کہانیوں، مضامین کی کیا تعریف کروں؟ مجھے تو اس میں لکھنے والے تمام مصنفین سے بے پناہ محبت ہے اور ان کی تحریروں سے بھی۔ اپنے وطن کے ہر لکھاری سے جذبہ حب الوطنی کے تحت اور ہم قلم ہونے کے سبب ایسی محبت ہونی ہی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے زیرِ سایہ سچی کہانیاں کو ہمیشہ روبہ عروج رکھے۔ آمین ثم آمین۔

☆ بہت اچھی فرزانہ جی! آپ کہانیاں بھیجتی رہیے ہم لگاتے رہیں گے۔ مگر احوال میں لازمی شریک ہوں۔ اس سے ہمارا مان بڑھتا ہے۔

✉ کراچی سے نفیسہ فضل احوال میں شریک ہیں لکھتی ہیں۔

بیٹی منزہ اور آپ کی کاوشیں رنگ لا رہی ہیں۔ سچی کہانیاں دن بدن کامیابیوں کی جانب رواں دواں ہے۔ ہر طرف اس کے چرچے ہیں! پراسرار نمبر کی تو بات ہی کیا ہے۔ میری کہانی ہوٹل کی وہ رات شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ! اپنے حج کا حال تیسری بار ارسال کیا ہے بیٹھے بیٹھے میری حاضری ہوگئی امید ہے اس مرتبہ ضرور سچی کہانیوں کی زینت بنے گا؟ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف! زہریلی کوکھ حاسم وقاص زبردست کہانی ہے یہ سب ممکن ہے۔ تحفہ ابو ہریرہ بلوچ اچھی کہانی ہے۔ بیری کا آسیب یہ کہانی بھی مزہ دے گئی۔ جنوں والا بنگلہ محمد اسماعیل، فیروز آباد کی نوری نوشین آراء، انارکلی نزہت جبیں ضیاء، اجازت حنا بشریٰ، کالا حبشی ارم ناز، چمگادڑ کی مورتی ملک محمد اکرام آھیر، جھولی میں شیطان حنا فرید، تقریباً سب ہی کہانیاں اچھی تھیں۔ دو ایک کہانیاں صرف کہانیاں لگتی ہیں سچی نہیں لگتیں۔ لکھاری بیٹے بیٹیوں سچے واقعات لکھا کریں۔ اس کا مزہ ہی اور ہے۔ امید ہے میری بات کا برا نہیں مانیں گے۔ فرعون کے قیدی حمیرا خان اچھی کاوش ہے۔ ہائیڈ پارک، تیرنیم کٹس، ہم شکل راحت صاحب کا تو جواب نہیں اور زہر عشق کاشی چوہان کا اچھا ناول ہے۔ مسئلہ یہ ہے تو میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ قابل احترام بابا جی کے مفید مشورے اور وظائف پڑھ کر دلی سکون ملتا ہے۔ اللہ رب العزت بابا جی کو صحت و لمبی عمر عطا فرمائے آمین! میں بھی آجکل موسم کے اثرات کی زد میں ہوں دعا کیجیے گا۔

☆: آنٹی جی! آپ کا تبصرہ ہماری محنت پر ایک تھپکی ہوتا ہے، جو آگے مزید محنت اور لگن کرنے کا حوصلہ بنتا ہے۔ ہمیں ہر ماہ اس محبت کی ضرورت ہے۔

خواتین کی محبوب قلم کار

'رفعت سراج' کا تازہ ترین شاہکار 'دام دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں۔

''ایمن'' ایک ایسی بہو کی کہانی، جسے دو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں ہر لحہ ساس، سسر کے طنز اور طعنوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

تازہ ترین قسط سے کچھ لائنیں

اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھیلنے کو دیتی ہے۔ مشکل سے پچاس ہزار کا جہیز لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے ڈال دیے ہم پر۔'' فردوس کی بڑبڑاہٹ زہر کی کڑواہٹ کے برابر تھی۔

''ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔'' حامد حسین نے لقمہ دیا۔

''پ......پ...... پندرہ لاکھ......'' فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ یوں گویا کوئی ان پر بندوق تانے کھڑا ہو اور کہہ رہا ہو۔ نکالو پندرہ لاکھ۔

''ارے کہاں سے لائے گا ہمارا بچہ تیس لاکھ؟'' وہ گویا پچھاڑیں کھانے لگیں۔

''آسرا رکھو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہوگا۔'' حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمن کی پشت پر تاک کر نیا تیر چھوڑا۔ ایمن کو پاؤں اٹھانا دوبھر ہو گیا۔

جی تو چاہا پلٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں کے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی ذمہ دار ہے۔ جسے رب العالمین کہتے ہیں۔ جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔ جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔''

آج کے جدید دور میں بھی ایسے کردار ہر دوسرے گھر میں موجود ہیں۔ رفعت سراج عام بات کو خاص بنانا جانتی ہیں۔

'دام دل' ہر ماہ دوشیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

فیصل آباد سے روبینہ ناز روبی عرض کرتی ہیں۔ السلام وعلیکم کاشی بھیا و دیگر تمام کارکنان! پراسرار نمبر ہمارے ہاتھ کیا آیا کہ اس کی پراسراریت میں ایسے گم ہوئے کہ ہم خود ہی اپنے اہل خانہ کے لیے پراسرار ہو گئے۔ اس کی ایک ایک کہانی کو اتنے اہتمام سے پڑھا کہ خود پر طاری کر لیا۔ یہ تو ہمیں صبح پتا چلا جب میاں صاحب نے ہمیں غصے سے گھورتے ہوئے کہا خبردار جو آج کے بعد رات سونے سے قبل مافوق الفطرت کہانیاں پڑھیں تو۔ ساری رات جانے کن کن جنات اور پریوں کی منگنیاں اور شادیاں کروائی اور تڑوائی رہی ہو۔ ہم ساری رات ہڑبڑا کر اٹھ جاتے کہ جانے کیا ہوا تمہیں اور جناب بچے بھی بوجھل بوجھل آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جی تو اب رائے کی طرف ادار یہ زبردست لگا۔ بلی یا فردوس۔ انار کلی۔ میں کیا کرتا۔ جھولی میں شیطان، خونی دنگل، بھوت ٹرین اچھی تھیں مگر پری زاد، کالا حبشی اجازت، بیری کا آسیب اور زہریلی کوکھ نے بہت متاثر کیا۔ باقی کہانیاں تقریباً ملتی جلتی تھیں۔ نومبر میں آپ کو بذریعہ Email تحریریں سینڈ کی تھیں جو شاید آپ کو نہیں ملیں اس میں گڈی آپا کی وفات پر اظہار افسوس کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گڈی آپا سچی کہانیاں کا ایک قیمتی سرمایہ تھیں۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند کرے اور اہل خانہ کو صبر عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: بہت عزیز روبی جی! آپ کا تبصرہ کمال رہا۔ اگلے ماہ کے تبصرے کا ابھی سے میں نے انتظار شروع کر دیا ہے۔

✉ ساہیوال سے امتیاز عاصم پہلی بار احوال میں شریک ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔

کاشی بھائی۔ السلام وعلیکم! سر میں کافی رسالوں کا مطالعہ کر چکا ہوں مگر جو چیزیں سچی کہانیاں میں پڑھنے کو ملی ہیں۔ وہ کسی بھی رسالے میں بات نہیں ہے۔ مگر میں نے بہت بار لکھنے کی کوشش کی۔ مختلف رسالوں میں مگر میری حوصلہ افزائی نہیں کی گئی اور آخر کار تھک ہار کر میں نے ان سے منہ ہی موڑ لیا۔ اور پھر اچانک میں ندیم عباس ڈھکو سے ملاقات ہو گئی۔ مجھے پتا بھی نہیں تھا اور دو ماہ سے ندیم عباس ڈھکو ساہیوال مکڈونلڈز سے میرے ساتھ کام کر رہا ہے مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی اور پھر انہوں نے مجھے پھر حوصلہ دیا کہ مجھے لکھنا چاہیے اپنے جذبات قارئین سے شیئر کرنے چاہیے۔ اس لیے قلم اٹھا کر اس عزم سے شریک ہو رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ مجھے مایوس نہیں کیا جائے گا۔ میرے بہت سے دوست رسالے پڑھتے ہیں مگر سچی کہانیاں اکثر شہروں سے نہیں ملتا اس پر توجہ دی جائے۔ خیر شکوے شکایات اپنوں سے کیے جاتے ہیں۔ آئندہ ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا آخر میں ساہیوال مکڈونلڈز کے سر عدیل، سعد صاحب، سدرہ، شگفتہ، میڈم اور وسیم ڈھکو کو میری طرف سے دل کی گہرائی سے سلام قبول ہو۔

☆: بھائی امتیاز! خوش آمدید! دل چھوٹا نہ کرو۔ اب تم ہمارے احوالی بن گئے ہو۔ خوش۔

✉ بڈالی سے نعیم اللہ عرض کرتے ہیں۔ ماہنامہ سچی کہانیاں کا دسمبر کا شمارہ یکم دسمبر کو ملا۔ پراسرار نمبر کی مناسبت سے سرورق بہت زبردست تھا۔ اس کے بعد اشتہارات کو کراس کرتے

ہوئے' 'نابینا' پر پہنچے منزہ سہام نے بہت خوب لکھا۔ احوال کے اختتام پر کاشی چوہان صاحب نے 31 دسمبر' نظم لکھی۔ بہت خوب کاشی چوہان۔ میری کامیابی لائف بوائے کے ساتھ اماں اعوان کا ایک مستقل اچھا سا سلسلہ ہے۔ اس کے بعد ایک خوبصورت کہانی 'بلی یا فرودس' محمد سلیم اختر لائے۔ بہت خوب محمد سلیم اختر۔ اور پھر پری زاد' کالا حبشی' اجازت' تحفہ حیرت ناک کہانیاں تھیں۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ خوب لکھا۔ اس کے بعد پری کا آسیب' انارکلی' چھپکلی یا خوفناک، دہشت ناک، حیرت میں ڈال دینے والی تحریریں تھیں۔ پھر خوفناک پانچ کہانیاں پر اسرار نمبر کو پڑھنے کو ملیں۔ میں کیا کروں؟ شعبان کھوسہ، چمگادڑ کی مورتی ملک محمد اکرام آجیر، جھولی میں شیطان حنا فرید، خونی دنگل سکندر حبیب، پردے میں رہنے دو علی حسنین تابش اچھی کہانیاں تھیں۔ پھر شاہکار کہانیاں پڑھنے کو ملی جن میں زہریلی کوکھ حاسم وقاص، ناگن دوست مجید احمد جائی زبردست کہانیاں تھی۔ فرعون کے قیدی بہت ہی زبرست کہانی تھی۔ پلیٹ فارم سے بھوت ترین ممتاز احمد لے کر آئے۔ ایک بہتری تحریر تھی۔ اس کے بعد مختصر مختصر کہانیاں آئی۔ جن میں جنوں والا بنگلہ' فلائٹ نو رتربت' فیروز آباد کی انوری' ہم نے گھر چھوڑ دیا' ہوٹل کی وہ رات' تین صدیوں بعد بھی' وہ لڑکا کون تھا' کچھ انہونی یادیں' کی کہانیاں تھیں۔ جو بہت ہی اچھی لگیں پر اسرار نمبر اس مرتبہ تو شاندار کہانیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور مسلسل سلسلے ہم شکل' ایم اے راحت اور زہر عشق کاشی چوہان زبردست جارہے ہیں۔ بہت خوب ایک کہانی آپ کو ارسال کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ اب اجازت اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ماہ نامہ سچی کہانیاں دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین

☆ پیارے نعیم! تبصرہ بہت شاندار کیا۔ ہماری خواہش ہے کہ اسی طرح کہانیاں بھی بہترین لکھو۔ بھیا تمہیں بہت محنت کی ضرورت ہے۔ محنت کرو محنت کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے۔

☆ کراچی سے ام عادل عرض کرتی ہیں۔ ایک خط احوال کے لیے اور دوسرا پیارے ممتاز بھیا کی محبت بھری پکار کے جواب میں ان کی جانب روانہ کیا تھا اور آپ سے اسے بھی شائع کرنے کی التماس کی تھی۔ مگر احوال میں اپنے خطوط نہ پا کر دکھ ہوا۔ اگر وہ خط محکمہ ڈاک کی سستی وجہ سے آپ تک لیٹ پہنچے ہیں اور آپ نے ضائع نہیں کیے تو آپ سے التماس ہے کہ کم از کم ممتاز بھائی کی خدمت میں لکھا گیا خط شائع کر دیجیے۔ باقی ہمارا پیارا رسالہ آپ کی ہم راہی میں بہترین طریقے سے محوسفر ہے۔ باقی سب سیٹ ہے بلکہ سپر سیٹ ہے۔ احوال میں آپ کا احوالیوں سے پیار بھرا تعلق بہت مسرور کن ہے۔ آپ کا ناول بھی سپر ہٹ جا رہا ہے ممتاز بھیا کی ہر کہانی لاجواب ہوتی ہے۔ اب اجازت دیجیے۔

☆ اچھی بہن ام عادل! آپ کی تنقید سر آنکھوں پر مگر آپ جیسے لکھاری پرچے سے دور ہوں تو یہی ہوتا ہے۔ بھائی ممتاز تک آپ کا پیغام پہنچایا جا چکا ہے۔

صائمہ بشیر سرگودھا سے عرض کرتی ہیں۔ پیارے کاشی بیٹا السلام وعلیکم! دسمبر کا شمارہ جلدی مل گیا ٹائٹل تو بہت ہی عمدہ تھا سب سے زیادہ دکھ تحسین جونیجو کے والد صاحب کی وفات کا پڑھ کر ہوا۔ باپ تو بیٹیوں کے سر کی چھت ہوتی ہے۔ دنیا کے سرد و گرم سے بچانے والی چھت۔ خدا آپ سب اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

اس ماہ تو لکھاری ابوذر غفاری بلوچ کا تبصرہ پڑھ کر تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کیا الفاظ تھے کیا ہی تاثیر تھی۔ میرے خدا میں تو سوچنے لگ گئی کہ اردو کی لغت نکال کر پاس رکھ لوں بہر حال سب کے تبصرے سب اچھے تھے۔ سب لکھنے والوں کو بہت دعائیں اور کاشی بیٹا آپ کے لیے خاص طور پر میں بہت دعا کرتی ہوں۔ کہانیوں میں ممتاز احمد کی کہانی اس بار بھی بہت اچھی تھی لیکن بھوتوں کے ساتھ جو سفر کیا ہے وہ مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا یاد آئے تو ڈر لگتا ہے۔ ممتاز بھائی آئندہ اتنی ڈراؤنی کہانی لکھنا پلیز باقی لکھنے والوں نے بھی اپنی کہانیوں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ بہت ہی اچھی ہیں لیکن معلوم نہیں کیوں مجھے پراسرار اور بھوت بنگلے والی کہانیاں بہت ڈراؤنی لگتی ہیں۔ تمام نئے آنے والوں کو صائمہ آپی کا بہت پیار۔ عادل حسین اور عماد حسین انصاری کی شاعری پسند آئی۔ کاشی آپ کا زہر عشق بہت اونچا جارہا ہے۔ آخر میں بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں۔

☆: اچھی آپی! آپ کا تبصرہ جامع اور خوبصورت لگا۔ ہر ماہ آپ کی آمد ہمیں مہمیز کرتی ہے۔ سلامت رہیے۔

[✉] ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، رجب والا، ملتان سے برقی نامے کے ساتھ موجود ہیں۔ آتی سردیوں کے ساتھ اُمید کرتا ہوں کہ حفاظتی اقدام کے ساتھ لحافوں میں، جرسیوں میں خوش باش ہوں گے۔ بدلتے موسم میں خود کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ ماہ نومبر کا سچی کہانیاں چوک کمہاراں والے سے خریدا۔ 30 اکتوبر کی شام تھی، یوں سمجھیں اکتوبر رخت سفر باندھ چکا تھا اور ہم سچی کہانیاں کے درشن کر رہے تھے۔ سرورق دیدہ زیب تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام ''معجزے'' کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ اللہ کرے ان کی دعائیں قبول ہو جائیں۔ احوال میں آپ کو حادثہ پیش آیا، پڑھ کر شاک سا لگا، اللہ تعالیٰ رحمتوں کی برسات ہر قدم برسائے آمین۔ حنا بشریٰ، ممتاز احمد، عائشہ نور، سعدیہ عابد، تحسین جونیجو، منعم اصغر، احمد ندیم، سدرہ انور علی، یمیں غزالہ، شین ماہا، نزابت افشاں، انیس الرحمٰن، حسن عباس نیازی، رانا مجاہد، مسز نگہت غفار، فرزانہ نگہت، علی حسنین تابش، عثمان بلوچ، چوہدری ابوذر، نزہت ناز، مور شاہد حسین، جمیل احمد، اشفاق شاہین، سلیمان شبیر، ارم خان، منزل خان، عظمیٰ شکور، مسز نوید ہاشمی، فریدہ جاوید فری، ایم افضل آزاد، فیصل ندیم بھٹی، فرح انیس، راشد لطیف صبرے والا، میرے سوہنے، من موہنے بھائی مجید احمد جائی، ہماری بھابھی صائمہ مجید، سونیا خان، کنزہ ملک، نفیسہ فضل کے تبصرے جاندار تھے، بندہ ناچیز کو یاد رکھا، بہت شکریہ۔ آپ کی نظم انجام بہت پسند آئی۔ کہانیوں میں مجید احمد جائی، ممتاز احمد، ملک عاشق حسین

ساجد، عمارہ خان، اعجاز احمد فکرال، محمد سلیم اختر، ارم خان، نعمان اسحق، سید افتخار بھٹی، منعم اصغر، کشاف اقبال، کنول عمران خان، ذیشان فراز، رئیسہ خالد، ابو ہریرہ بلوچ، تازیہ بتول رضا، جاوید راہی، شاندار کہانیاں تھیں، میری طرف سے مبارک باد۔ زہر عشق اور ہم شکل خوب رواں دواں ہیں۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش سچی کہانیاں کو روشن و کامیاب کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

☆: ڈاکٹر صاحب! آپ کا تبصرہ، آپ کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اگلے ماہ آپ کا تبصرہ سب سے پہلے ہمارے پاس آئے۔

✉ کنزہ ملک، قاسم پور کالونی، ملتان سے عرض کرتی ہیں۔ اُمید کرتی ہوں ہنستے مسکراتے، گول گپے کھاتے ہوں گے۔ آپ کے منہ میں پانی کیوں آ رہا ہے، میں نے کاشی بھیا سے پوچھا ہے۔ امی، نانو کے ہاں گئیں اور میری عید ہوگئی، سہیلی کو کہہ کر سچی کہانیاں منگوایا اور بن گئی کتابی کیڑا۔ جب تک ورق ورق نہیں پڑھ لیا جان نہیں چھوڑی۔ سرورق پہ کھڑی لڑکی ہمیں گھورتی رہی اور ہم بھی ڈھیٹ وارد ہوئے ہیں، اُس کی بات نہیں مانی، اپنی کرتے رہے، ورق الٹایا تو بیچاری منہ بسورے رہ گئی۔ منزہ سہام کے اداریہ ''معجزہ'' پڑھا اور ہم احوال میں جا نکلے۔ کاشی بھیا یہ حادثہ کیسے ہوا۔؟ اور ہاں موت دو قدم پر تھی تو، اس کی شکل وصورت کیسی تھی، مجھے اُس سے لازمی ملنا ہے۔ ہر کسی کو ڈراتی رہتی ہے، میں نے اُسے نہ ڈرایا تو میرا نام بھی کنزہ نہیں۔ بڑی آئی، مجھے اس کا اتا پتا دینا۔ احوال میں سبھی تبصرے میٹھے میٹھے تھے، ظاہر ہے جب سبھی لوگ چینی کھا کر لکھنے بیٹھیں گے تو تبصرے میٹھے ہی ہوں گے ناں۔ ممتاز احمد، مجید احمد جائی، حنا بشریٰ، منعم اصغر، ارم خان، سدرہ انور علی، مسز نوید ہاشمی، مور شاہد حسین، علی حسین تابش، صائمہ مجید، راشد لطیف، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، منزل خان، عائشہ نور، تحسین جونیجو، شاندار تبصرے فرما رہے تھے، اس کے علاوہ نئے احوالیوں کو ست بسم اللہ، تے جی آیاں نوں۔ کہانیوں میں زہر عشق پڑھی، رگوں میں زہر بھرتی تحریر نے اپنی قید میں جکڑے رکھا، مجید احمد جائی کی 'قرض' کمال تحریر تھی، وحشی درندوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں شرافت کا لبادہ اوڑھے کئی درندے پھرتے ہیں ان کو کیفر کردار تک پہنچانا ہوگا، پگلی، سر کے اوپر سے گزر گئی اور مفاد، میں مرد ہوتے ہی مفاد پرست ہیں، اس کے علاوہ ندامت، قدرت، ایک چھوٹی سی لو اسٹوری، دیر ہے اندھیر، دوسری بیوی، بیٹا، احتیاط ضروری ہے، کمینی، کانچ کی گڑیا، بھرم، وہ مانوس اجنبی، دل آباد، ہانڈی وال، می می می، اعلیٰ تحریریں تھیں، صنم بلوچ سے ملاقات خوب رہی، اور نیا سلسلہ اچھا رہا۔ سبھی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، مسئلہ یہ ہے، کرشل کہانی لائف بوائے، اچھی چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کو دن دوگنی، رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین کروڑ آمین

☆: اچھی گڑیا! تمہارے خط سے محبت اس قدر ٹپکتی ہے کہ...... دیگر احوالیوں کے منہ بھی آپ ہی میٹھے ہوجاتے ہیں۔ خوش رہو۔ امید ہے اب اپنے بھائی کے ہم قدم رہو گی۔

ملتان شریف سے ہمارے بہت عزیز ساتھی مجید احمد جائی لکھتے ہیں۔ ماہ دسمبر 2015 کا آخری رسالہ ملا۔ دسمبر کے آغاز نے ہی زخموں سے چور چور کر دیا۔ اب مرہم پٹیاں کرا کر سچی کہانیاں پڑھ رہے ہیں۔ سب سے پہلے تمام اہل وطن، سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف، لکھاریوں اور قارئین کو سال نو کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سال ہمارے لیے امان کا ہو۔ پُراسرار نمبر 3 کا سرورق خاص نہیں تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام کا "نابینا" خوب رہا۔ کاشی بھائی، سچ بولنے والے کے دشمن زیادہ کیوں ہوتے ہیں۔؟ آپ کے الفاظ پہ کاش! ہر پاکستانی عمل کرلے۔ پہلے احوالی سید ملازم حسین تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو رہائی عطا فرمائے آمین۔ محترم ممتاز احمد، مقصود احمد بلوچ، اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے، ہمیں اولاد کی دولت سے مالا مال فرمائے، (بابا) کا خطاب اِس لئے ملا کہ میں چہروں کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ سامنے والے کے دل میں کیا ہے۔ آواز سُن کر نام بتا دیتا ہوں کہ کون بات کر رہا ہے۔ آپ بھی آزما لو اور باباجی کی گردان کرنے لگو گے۔ پیارے علی رضا، سچی کہانیاں میں ست بسم اللہ۔ سدرہ انور علی بہنا نے ہمیں مسٹر پرفیکٹ کا خطاب دیا۔ دل خوش ہو گیا، بہت سے لوگ جل بھن گئے ہوں گے، اُن کا خیال بھی رکھیں۔ علی حسنین تابش میری کہانیوں کو پسندیدگی کی سند دینے کا شکریہ۔ سونیا خان،، عظمیٰ شکور، محمد ندیم عباس میوانی، منزل خان، ابوہریرہ بلوچ، فریدہ جاوید فری (جو دلوں میں بستے ہوں اُنہیں کیسے بھول سکتے ہیں، آپ ہمارے دلوں میں، ہماری دعاؤں میں ہر وقت رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ آمین) ارم خان، پیاری حجاب فاطمہ، مسز نوید ہاشمی، عثمان بلوچ، سبھی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری کہانیوں کو پسندیدگی کی سند سے نواز، ابو ذر غفاری، مومنہ بتول، عظمیٰ شکور، سدرہ انور، کے احوال زبردست تھے، نئے احوالیوں کو ست بسم اللہ! فیصل ندیم بھٹی، منشی عزیز مئے غیر حاضری نہیں چلے گی۔ کہانیوں میں۔ چتر ہاری سانپ کا مذاق نے حیران کر دیا، فرعون کے قیدی، آج بھی ہمارے اردگرد موجود ہیں، پردے میں رہنے دو، چڑیل کی محبت کمال تھی۔ انارکلی، اور میں کیا کرتا، نے حیرتوں کے پہاڑ توڑ دیے۔ بھوت ٹرین، ٹرین فضا میں اڑتی رہی اور میں خیالوں میں اِس ٹرین کا سفر کرتا رہا۔ اِس کے علاوہ فلائٹ ٹو تربت، فیروز آباد کی انوری، ہم نے گھر چھوڑ دیا، ہوٹل کی وہ رات، تین صدیوں بعد بھی، وہ لڑکا کون تھا، انہونی یادیں، زہریلی کوکھ، خونی دنگل، بلی یا فردوس، پری زاد، کالا حبشی، بیری کا آسیب، تحفہ، اجازت، چھپکلی یا۔۔۔ چمگادڑ کی مورتی، جھولی میں شیطان، لائف بوائے شاندار تحریریں تھیں۔ زہر عشق واقعی رگوں میں خون جما رہی ہے، اِسے جلدی سے کتابی شکل میں لائیں، انتظار نہیں ہوتا ناں۔۔۔ ہم شکل خوب جا رہی ہے۔ مستقل سلسلے ہائیڈ پارک، تیر نم کش، مسلہ یہ ہے شاندار رہے۔ صفحہ نمبر 13 نے خوش خبری سُنا کر حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اب

آئے گا مزہ، انعامات کی بارش میں نہانے کا۔ زرینہ جونیجو، اور تحسین جونیجو بہن کے والد محترم کی وفات کا سُن کر دلی دُکھ ہوا، دُکھ کی اِس گھڑی میں ہم برابر شریک ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر وجمیل عطا فرمائے آمین۔ اِس بار پُر اسرار نمبر نے دل خوش کر دیا۔ شاندار اشاعت پر ڈھیروں مبارک باد قبول ہوں۔

☆: پیارے مجید! تمہارے شاندار تبصرے نے بھی ہمارا دل خوش کر دیا۔ خدا ہمارا مان اور تمہاری محبت سلامت رکھے۔ (آمین)

✉ راشد لطیف، صبرے والا، ملتان سے عرض کرتے ہیں ماہ نومبر کا سچی کہانیاں بہت جلد مل گیا۔ ٹائٹل خوبصورت تھا۔ منزہ سہام کا اداریہ زبردست تھا، احوال میں کاشی بھائی کے ساتھ حادثہ ہوا، جان کر دل ڈوب سا گیا۔ اللہ تعالیٰ لمبی عمر عطا فرمائے آمین۔ ڈھیروں دعائیں آپ کے لئے، احوال کی صدارت کی کرسی حنا بشریٰ کے نام ٹھہری۔ مبارک باد قبول ہو۔ پیارے ممتاز احمد، فیصل ندیم بھٹی، عائشہ نور، منعم اصغر، ارم خان، منزل خان، مسز نگہت غفار، مسز نوید ہاشمی، کافی عرصے بعد مور شاہد حسین، سونیا خان، کنزہ ملک، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، ہماری بھابی صائمہ مجید، علی حسنین تابش، عزیز مجید احمد جائی، نفیسہ فضل، سدرہ انور علی، کے تبصرے بہت پیارے تھے۔ اس کے علاوہ نئے احوالیوں کی شاندار انٹری تھی۔ میری طرف سے ویلکم۔

کہانیوں کی نگری میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اپنے محترم بھائی مجید احمد جائی کی قرض پڑھی، کیا کمال لکھتے ہیں۔ ممتاز احمد کی واپسی، بہت کچھ کہہ گئی، ندامت، جاوید راہی بھی خوب رہے۔ اس کے بعد قدرت، قصور کس کا، پھکی، مفاد، بیٹا، دوسری بیوی، دیر ہے اندھیر نہیں، ایک چھوٹی سی لو اسٹوری، کرب، دھندا، کمینی، وہ مانوس اجنبی، بھرم، ہانڈی والی، می می، دل آباد، لائف بوائے پیاری کہانیاں تھیں۔ سلسلے وار کہانیاں زہر عشق نے دھوم مچا رکھی ہے۔ ہم شکل بھی اچھی جا رہی ہے۔ دسمبر کا سچی کہانیاں، بہاولپور سے ملتان جاتے ہوئے خریدا۔ ملتان میں پیارے بھائی مجید احمد جائی کے ساتھ ایک دن میں دو حادثے ہوئے۔ یکم دسمبر صبح نو بجے اُن کا ایکسڈنٹ ہوا اور ایک گھنٹے کے وقفے میں اُن کی بہن کا ایکسڈنٹ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی سسٹر کو صحت یابی عطا فرمائے۔ آمین۔ احوال میں زرینہ جونیجو اور تحسین جونیجو کے والد محترم کی وفات کا سن کر دلی افسوس ہوا۔

کہانیوں میں بھوت ٹرین، اور ناگن دوست مجید احمد جائی، میں کیا کروں، فرعون کے قیدی، بہت زبردست تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ اجازت، تحفہ، چمگادڑ کی مورتی، زہریلی کوکھ، فلائٹ ٹو تربت، بلی یا فردوس، پری زاد، وہ لڑکا کون تھا اچھی رہیں۔ زہر عشق جادوئی تحریر ہے۔ جو اپنے جادو میں قید کیے ہوئے ہے۔ ہم شکل میں بھی ساتھ ساتھ چاشنی بڑھ رہی ہے۔ مستقل سلسلے زبردست تھے۔

☆: راشد! تم سب کی محبت ہی ہمارے پرچے کو چار چاند لگاتی ہے۔ تبصرہ اچھا کیا تم نے۔

جنوری 2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: --

مکمل پتا: --

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جنوری 2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: ------------- تعداد صفحات: -------------

نام: --

مکمل پتا: --

فون/سیل نمبر: ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جنوری 2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ------------- مصنف: -------------

دوم، عنوان: ------------- مصنف: -------------

سوم، عنوان: ------------- مصنف: -------------

نام: ------------- شہر: -------------

✉ ہماری بھابی صاحبہ صائمہ مجید ملتان شریف سے شریک احوال ہیں۔ لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے میری طرف سے سال نو مبارک ہو۔ اس بار کچی کہانیاں وقت پر مل گیا۔ پرچہ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ بھلا لگا۔ سرورق پر ننھی حسینہ کی ویران ، عمدہ منظر پیش کر رہی ہے۔ یہاں جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں ہیں۔ اداریہ میں منزہ سہام نے بالکل درست کہا کہ ہمیں صبر اور برداشت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ سبھی کام حکومت سے ہی نہیں ہوتے۔ کچھ فرائض ہمارے بھی ہوتے ہیں۔ کاشی بھیا! نے خوب ہی تو کہا ہے کہ ہم اپنے اندر ایک سچے پاکستانی کی پرورش کریں۔ سید ملازم حسین اور اُن جیسے جتنے قیدی جیلوں میں ہیں اللہ تعالیٰ اُن پر آسانیاں فرمائے اور رہائی نصیب میں لکھ دے۔ آمین۔ پیارے انکل ممتاز احمد، زاہد حسین، بہن صائمہ بشیر، مقصود احمد بلوچ، ملک علی رضا، ابوذر غفاری بلوچ، مومنہ بتول، منزل خان، عظمیٰ شکور، ارم خان، مسز نوید ہاشمی، علی حسنین تابش، شازیہ گل، سلیمان شبیر، سدرہ انور علی، نزہت ناز، سونیا خان، اعجاز احمد فکرال، ندیم عباس میوانی، ابوہریرہ بلوچ، سبحان شاہ، انیس الرحمن، حجاب فاطمہ، یاسر وکی کے ساتھ ساتھ سبھی احوال خوب رہے۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ کچھ لوگ غیر حاضر ہیں، لوٹ آئیے۔ بہن زرینہ جونیجو، تحسین جونیجو، کے والد محترم کی وفات کا سن کر دلی صدمہ ہوا، اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبر و جمیل عطا فرمائے آمین۔ انعامات کے اعلان کا سن کر اب کہانی بھیجنی ہی پڑے گی۔ کہانیوں میں انارکلی، میں کیا کرتا، بھوت ٹرین، ناگن دوست، زہریلی کوکھ، چترباری سانپ کا مذاق، فلائٹ نو تربت، بلی یا فردوس، کالا حبشی، پری زاد، چمگادڑ کی مورتی، پردے میں رہنے دو، بہت زیادہ پسند آئیں باقی کہانیاں بھی خوب تر تھیں۔ زہر عشق اپنے سحر میں قید کیے رکھتی ہے، ہم شکل اچھی جا رہی ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نم کش، اچھے جا رہے ہیں۔ 2015 کا آخری پرچہ کامیابیوں کی ایک اور سیڑھی عبور کر گیا۔ بہت خوب۔ کاشی بھیا! آپ کی محنت رنگ لائی اور ہر طرف سچی کہانیاں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مزید ترقی سے ہمکنار کرے اور سدا سلامت رکھے۔ آمین۔

☆: اچھی بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی بھی مرادیں پوری کرے۔ پرچے کے لیے آپ سب کی محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔

✉ سونیا خان، بستی شاہ گردیز سے لکھتی ہیں۔ بھائی مجید احمد جائی کے ایکسڈنٹ کا سُن کر شاک سا لگا۔ ہماری دعائیں، آپ کے لئے۔ جاتے سال کا سچی کہانیاں بہت جلد مل گیا۔ ٹائٹل خوبصورت تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام خوبصورت نصیحت فرما رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کاشی بھیا! آپ سچ ہی تو کہتے ہیں، ہمیں سب سے پہلے پاکستان کے لئے سوچنا ہے۔ احوال میں سید ملازم حسین، ممتاز احمد، علی حسنین تابش، عظمیٰ شکور، سدرہ انور علی، ارم خان، نزہت ناز، مسز نوید ہاشمی، صائمہ مجید، صائمہ بشیر، ملک علی رضا، اعجاز احمد فکرال، عثمان

بلوچ، مقصود احمد بلوچ، انیس الرحمان، مجید احمد جائی کے تبصرے بہت پیارے تھے۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ ہمیں تو کسی نے خوش آمدید نہیں کہا تھا (ہم نے تو کہا تھا نا!) ڈاکٹر خادم حسین، کنزیٰ ملک، فیصل ندیم بھٹی، رانا شاہد علی، منشی عزیز مٹھے اور بہت سے ساتھی غیر حاضر ہیں۔ کہانیوں میں مجید احمد جائی کی ناگن دوست، سبق آموز اور اصلاحی تحریر تھی۔ بھوت ٹرین، دل کو چھوگئی، فرعون کے قیدی، زہریل کوکھ، چترہاری سانپ کا مذاق، بلی یا فردوس، کالا حبشی، تحفہ، بیری کا آسیب، انارکلی، خونی دنگل، میں کیا کرتا، جھولی میں شیطان، ہوٹل کی وہ رات، انہونی یادیں، اجازت، چمگادڑ کی مورتی اچھی تحریریں تھیں، باقی ابھی پڑھنی باقی ہیں، سو تبصرے سے معذرت، زہرعشق، خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے، تجسس سا ہے کہ آگے آگے کیا ہونے والا ہے۔ ہم شکل اچھی چل رہی ہے۔ ہائیڈ پارک، تیرنیم کش، اچھے رہے۔ جاتے سال کے سچی کہانیاں نے خوش کر دیا۔ شاندار اشاعت پر مبارک باد قبول کریں۔

☆: اچھی لڑکی! تمہارا تبصرہ بہت اچھا لگا خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ خوش رہو۔

✉ چشتیاں سے یہ آمد ہے ہمارے ننھے منے رائٹر علی حسنین تابش کی۔ لکھتے ہیں۔ پراسرار نمبر جلد مل گیا ٹائٹل لاجواب تھا۔ منزہ آنٹی کا اداریہ بہترین تھا۔ کاشی بھائی اسٹوری شائع کرنے کا شکریہ۔ احوال میں سب دوستوں نے خوب لکھا۔ ذرینہ جونیجو، تحسین جونیجو خداوند کریم آپ کے والد محترم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ سب ہی بے حد پسند آئیں۔ پیارے مجید بھائی سدا خوش رہو اسٹوری بہترین تھی۔ کاشی بھائی جان آپکا ناول بے حد خوبصورت جا رہا ہے۔ سلیم صاحب کی اسٹوری بے حد پسند آئی۔ کاشی بھائی صرف مٹھائی نہیں پوری دکان ہی حاضر ہے۔ آپ کھانے والے بنو۔ سارا پرچہ ہی اپنی مثال آپ تھا۔ بہت پسند آیا۔ اور ہاں میری طرف سے تمام قارئین، دوستوں، اور سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کو نیا سال مبارک ہو۔ خداوند کریم سے دعا ہے یہ سال سب کیلئے خوشیوں اور امن کا سال ہو۔ 2015ء میں جن کے پیارے ان سے بچھڑ گئے رب کریم ان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

☆: ننھے حسنین! تم بھی خوش رہو۔ تبصرہ مختصر ہے مگر اتنا بھی مختصر کیوں؟ اللہ کرے تمہارے لیے بھی یہ سال خوشیوں کا سال ثابت ہو۔

ساتھیو!

اس ماہ تک ہماری اور آپ کی ملاقات اختتام پذیر ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایوارڈ (سرٹیفکیٹس) پانے والے ساتھیوں کی مکمل فہرست بھی یقیناً آپ کی نئے سال کی خوشیوں میں مزید اضافے کا باعث بنے گی۔ اپنا بہت خیال رکھیں اور تمام ایوارڈ یافتگان کو ہماری طرف سے بہت مبارکباد، اس کے ساتھ ہی اجازت دیں۔ اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2015ء کے ایوارڈ یافتگان

ایوارڈ ماہ	ایوارڈ یافتہ کہانی	مصنف/مصنفہ	شہر
دسمبر 2014	آئیڈیل	علی رضا عمرانی	ٹھٹھہ
	ماں جایا	معاویہ عنبر وٹو	ہڑپہ
جنوری 2015	تن کی کالی من کی اُجلی	ضرغام محمود	کراچی
	شش! خاموش	نسیم سحر	کراچی
فروری 2015	اکلوتی	مسز نوید ہاشمی	کراچی
	کُتیا	شمع حفیظ	کراچی
	دُھوپ چھاؤں	ڈاکٹر ایم صغیر احمد	جہلم
مارچ 2015	وہ کہانی	صفدر علی حیدری	اُچ شریف
	موت کا پروانہ	نصرت سرفراز	اسلام آباد
اپریل 2015	کون مانے گا میری	م۔ص ایمن	کراچی
	دنیا اک بگلا بھگت	اقرا سیف	فیصل آباد
	ڈھونڈوں کہاں امان	محمد علی روشن	اسلام آباد
	عہد وفا نبھایا ہے (خصوصی)	ڈاکٹر محمود الرحمان	گجرات
	اگھورانفس مورا	نسیم سکینہ صدف	سیالکوٹ
مئی 2015	ٹشو پیپر پہ لکھے دکھ	مومنہ بتول	کراچی
	گردِ صحرا ہوں بس!	دستگیر شہزاد	ٹوبہ ٹیک سنگھ
	وہ مرا طبیب خاص	مجید احمد جائی	ملتان
جون 2015	تقدیر نے لوٹا ہے	گڈی آپا	لاہور
	کوا اور سویرا	اُم عادل	کراچی

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2015ء کے ایوارڈ یافتگان

دبئی	ڈاکٹر راحیلہ خان	دوسرا ووٹ		
لڈن، وہاڑی	منشی محمد عزیز مے	یہ آگ کب بجھے گی		
کراچی	جیجل میتلو	بھاگوں والی	جولائی 2015	
لاہور	ثمینہ طاہر بٹ	خوش ہو کے بھنور باندھ لے		
چیچہ وطنی	عبدالغفار عابد	خود اپنے ہاتھوں		
لیہ	محمد یوسف لغاری	مٹھی بھر ریت ہے بس	اگست 2015	
اسلام آباد	عظمیٰ شکور	پریاں لے گئیں		
لاہور	اعجاز احمد نکرال	بہلا		
جھنگ	سدرہ انور علی	اور میں مرگیا	ستمبر 2015	
کوئٹہ	شعبان کھوسہ	دیدہ عبرت		
لاہور	بشریٰ سعید احمد	عامر، امر اور علی		
کراچی	نزہت ناز	لاعلاج		
کراچی	سیمیں غزالہ نہاں	کینسر	اکتوبر 2015	
سرگودھا	نبیل جاوید	روگ عمر بھر کا ہے		
حیدرآباد	زیبا بدر	جیت		

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2015ء کے ایوارڈ یافتگان

شہر	مصنف / مصنفہ	ایوارڈ یافتہ کہانی	ایوارڈ ماہ
شاہ کوٹ	حمیرا خان	سماج سیوا	
فیصل آباد	نعمان اسحاق	دلِ آباد	نومبر 2015
ڈی جی خان	ارم خان	وہ مانوس اجنبی	
کراچی	شاذلی سعید مغل	انسانوں کے جنگل میں	
کراچی	سید افتخار بھٹی	ہانڈی وال	
خانیوال	وقاص حسین	پری زاد	دسمبر 2015
لاہور	حنا بشریٰ	اجازت	
لاہور	حاسم وقاص	زہریلی کوکھ	
گوجر خان	فوزیہ فرید احمد	چھپکلی یا...	

سچی کہانیاں اسپیشل ایوارڈز

☆ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔ ایم اے راحت (لاہور)

☆ بیسٹ رائٹر آف دی ایئر۔ احمد سجاد بابر۔ (لودھراں)

☆ بیسٹ رائٹر آف دی ایئر۔ اقبال بانو (وہاڑی)

☆ موسٹ پاپولر رائٹر آف 2015ء ممتاز احمد (سرگودھا)

☆ موسٹ پاپولر رائٹر آف 2015ء ارم ناز (کراچی)

☆ جاوید راہی (اوکاڑہ) کی ہر کہانی اپنی کاملیت کے باعث ایوارڈ سے بالاتر قرار دی گئی ہے اس لیے جیوری کے فیصلے کے مطابق جاوید راہی کو سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ 2015ء کی شیلڈ عطا کی جائے گی۔

نوٹ: سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈز (سرٹیفکیٹس) 2015ء بہت جلد اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ مصنفین کو دیے جائیں گے۔

لائف بوائے... محبت کا راز بتائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

ناجیہ کتنی ہی دیر سے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ کھلی کھلی رنگت اور بڑی بڑی کٹورا آنکھوں میں اُسے مستقبل کا کوئی عکس تیرتا نظر نہ آ رہا تھا۔ مفلسی سب سے بڑا امتحان ہے۔ حسن کو کھا جاتا ہے۔ اپنے لانبے سیاہ بالوں کو ہاتھ میں لیے وہ کتنی ہی دیر سے کھڑی تھی۔

''خیر تو ہے؟'' راجیہ نے اُسے اِس حالت میں دیکھ کر ہلایا۔

''آں...... ہاں سب OK ہے۔''

''تو پھر یہ اتنی دیر سے آئینے کے روبرو کس کے دیدار ہو رہے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''سوری میں تو بھول ہی گئی تھی۔ میرے جاسوس مجھ پر اتنی گہری نظر رکھتے ہیں۔'' جواباً اُس نے بھی راجیہ کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اُف! جاسوس! کیا بات ہے آپ کی آپی۔''

''تم کیوں اتنی دیر سے مجھے گھور رہی تھیں۔'' ناجیہ نے کنگھا اُٹھا کر چوٹی کھولتے ہوئے کہا تو اُس کی ناگن زلفیں اُس کی پشت کو ڈھانپ گئیں۔

''مابدولت آپ کے دربار میں یہ لائف بوائے شیمپو کا حقیر نذرانہ لے کر پیش ہوئی تھی۔ وہی لائف بوائے شیمپو حضور! جو کہ ہمارے حسین بالوں کی چمک بڑھائے، دو موہے بالوں سے نجات دلائے اور بالوں میں مضبوطی لائے اور......''

''اور کاش ایسا ہو جائے کہ اِس میں سے سونے کے سکے بھی نکلنے لگ جائیں۔ میں تو کب سے ایسی اسکیم کا انتظار کر رہی ہوں۔ تم کیا بھول گئی تھیں۔''

''ہاں یاد آ گیا، تم تو ہو ہی ناشکری لڑکی! جو تھوڑے پیسوں میں لائف بوائے بالوں کے لیے کرتا ہے۔ وہ سونے کے سکوں سے بڑھ کر قیمتی ہے لڑکی!''

☆......☆......☆

''ناجیہ! ارے او ناجیہ بیٹا' کہاں ہو تم؟ ذرا بڑے کمرے میں جا کر بیڈ کی چادر تو بدل دینا وہ جو میں کچھ روز پہلے نئی لائی تھی' شاید وہ میں نے بکس میں رکھ دی ہے' نکال کر بچھا دو۔'' فریدہ بیگم نے ناجیہ کو ہدایات دیتے ہوئے کہا تھا۔

''جی اچھا امی جان! ارے آپ کہیں جا رہی ہیں؟'' اس نے انہیں برقع اوڑھتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

''ہاں' میں ذرا پچھلی گلی میں حاجرہ کے گھر تک جا رہی ہوں۔ اس سے شام کے لیے کچھ برتن وغیرہ لے آؤں اس کے پاس بڑا خوب صورت ڈنر سیٹ ہے۔''

''رہنے دیں امی! ہمارے گھر میں برتن موجود ہیں' کیا ضرورت ہے پھر کسی سے لینے کی؟''

''ارے بیٹا! وہ برتن تمہارے پھوپھی اور پھوپھا کے معیار کے مطابق نہیں۔ تمہیں تو پتا ہی ہے اپنی پھوپھو جان کا مزاج' کیسے ہر چیز میں نقص نکالتی ہیں اور ہر بات پر اعتراض کرنا تو ان کی فطرت میں شامل ہے۔ جب پچھلی دفعہ آئی تھیں تو کیسے باتوں باتوں میں جتا گئی تھیں ہماری حیثیت۔''

''امی! ان کی تو عادت ہے ہر چیز میں مین میخ نکالنے کی' وہ ہمارے معیارِ زندگی سے واقف ہیں۔ انہیں تو خود ہی خیال کرنا چاہیے۔ آپ کو حاجرہ آنٹی سے برتن لانے کی کوئی ضرورت نہیں' دوسروں سے مانگنا اور اپنی خودداری کھونا اچھا نہیں ہوتا۔''

''لیکن بیٹا! تم سمجھ نہیں رہیں' زمانے میں رہنے کے لیے زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔''

ناجیہ کو اگرچہ اپنی ماں کی بات سے اتفاق نہیں تھا مگر احتراماً خاموش رہی تھی۔ وہ ان کے جانے کے بعد بیڈ شیٹ تبدیل کرنے لگی۔ امی نے نہ جانے کیوں نئی بیڈ شیٹ بچھانے کو کہا تھا حالانکہ پھوپھو کے بچے انتہائی بدتمیز قسم کے تھے۔ پچھلی بار کی چادر پر گرائی چائے کے نشانات جابجا ابھی تک قائم تھے۔ وہ لوگ جب بھی آتے ہیں' گھر کی حالت ابتر ہو جاتی مگر امی جان ان کی ہر بار کی آمد پر خوش ہوتی ہیں حالانکہ پھوپھو جان کو کون سا ہم لوگوں سے ملنا ہوتا ہے۔ وہ تو ان کے سسرالی اس شہر میں ہیں' اُدھر آنا ہوتا ہے تو اِدھر بھی آجاتی ہیں ورنہ تو پھوپھو کو کبھی ہمارا خیال بھی نہ آئے۔ ناجیہ نے دکھ سے سوچا تھا۔

''کوئی ایک سوٹ بھی تو اچھا نہیں ہے۔ اب کل کیا پہنوں؟'' راجیہ الماری سے تمام جوڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کرنے کے بعد بڑبڑاتے ہوئے سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

ناجیہ چائے لے کر آئی تو اسے سر پکڑے دیکھ کر فکرمندی سے استفسار کرنے لگی۔

''اب کیا ہوا؟''

''وہی پرانا مسئلہ' کل کالج میں اتنا بڑا فنکشن ہے اور میرے پاس ایک بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں ہے جو میں پہن کر فنکشن میں جاسکوں۔ سوچ رہی ہوں' اپنی دوست غزالہ سے اس کا شاکنگ پنک کلر والا سوٹ مانگ لوں۔ بہت ہی خوب صورت سوٹ ہے۔ میں زیبِ تن کروں گی تو کالج کی لڑکیاں دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیں گی۔''

''مانگنے تانگنے کا خیال دل سے نکال دو۔ جھوٹی شان و شوکت انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔'' ناجیہ کا انداز ناصحانہ تھا۔

''اچھا بابا' خدا کے واسطے' لیکچر مت دو' چائے کا کپ دو' پہلے ہی سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' راجیہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

''راجیہ! تم میرا پرپل والا نیٹ کا سوٹ پہن لو۔'' ناجیہ نے اسے راہ دکھائی تھی۔

''نہیں بھئی' مجھے وہ سوٹ نہیں پہننا۔'' راجیہ نے چڑ کر کہا تھا۔

''کیوں؟ اس سوٹ میں آخر ایسی کیا برائی ہے؟''

''برائی تو کوئی نہیں ہے مگر پرپل کلر تم جیسے گورے حسین لوگوں پر ہی بجتا ہے' میری سانولی رنگت پر کیا خاک اچھا لگے گا؟''

''تم تو پاگل ہو' پہن کے تو دیکھو' تم پر بھی پرپل کلر بہت اچھا لگے گا۔ اور ہاں! یہ اسٹینس کا مپلیکس تمہیں کیوں ہو گیا بھئی۔ تمہارے اِن لائف بوائے شیمپو سے لہراتے سیاہ بالوں کے آگے بھلا کسی اور جادو کی کیا ضرورت ہے؟'' ناجیہ نے سمجھایا تو راجیہ نیم رضامند ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

بوا اصغری شٹل کاک برقع سر پر رکھتے ہوئے چلی گئیں تو فریدہ بیگم آنگن سے کمرے میں آگئیں جہاں ان کے شوہرِ نامدار عظیم صاحب بے چینی سے ان ہی کے منتظر تھے۔

''کیا ہوا؟ کیا جواب دیا ان لوگوں نے؟'' انہوں نے سوالیہ انداز میں فریدہ بیگم سے پوچھا تھا۔

پچھلے دنوں بوا کے ساتھ کچھ خواتین ناجیہ کو دیکھنے آئی تھیں اور انہوں نے اسی کے متعلق جاننا چاہا تھا۔

''وہی جواب ملا جو اس سے پہلے لوگ دیتے آئے ہیں۔'' فریدہ بیگم اداس سی سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''ارے' کچھ بتاؤ تو سہی......'' عظیم صاحب نے اصرار کیا تھا۔

''انہیں بھی ہماری غربت اور حیثیت پر اعتراض ہے۔ بوا بتا رہی تھیں کہ وہ لوگ اچھی فیملی میں رشتہ کرنے کا کہہ رہے ہیں۔''

''اچھی فیملی سے ان کا کیا مطلب؟'' انہوں نے ناگواری سے پوچھا تھا۔ ''بس یہاں تو ہر شخص دولت کی ہوس میں اندھا ہو رہا ہے۔ شرافت اور سچائی کی تو کوئی قدر ہی نہیں

رہی۔'' ان کا لہجہ بہت زیادہ تلخ ہو گیا تھا۔ اسی وقت ناجیہ' راجیہ اور انس بھی کمرے میں داخل ہوئے تھے اور ماں باپ کو بتایا تھا کہ رمضان کا چاند نظر آ گیا ہے۔

''عظیم صاحب' آپ بھی تو سچ کی تفسیر بن جاتے ہیں' نہ صرف اپنی انکم بتادی بلکہ صاف لفظوں میں یہ بھی بتادیا کہ ہماری کوئی زمین' جائداد وغیرہ نہیں حالانکہ لوگ ان معاملات میں جھوٹ سے کام لیتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر اپنی بڑائی پیش کرتے ہیں' کرائے کے مکان کو اپنا ذاتی مکان بتاتے ہیں۔''

''ابو! ویسے امی کچھ غلط نہیں کہہ رہی ہیں۔ آپ نے تو تایا ابو کا بھی ذکر نہیں کیا کہ میرا بھائی امریکا میں مقیم ہے۔ لوگ تو یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا فلاں رشتے دار باہر ہے' ہم لڑکے کو باہر بھجوا دیں گے وغیرہ وغیرہ۔'' انس بھی ماں کا ہم نوا بنا ہوا تھا۔

''ارے بیٹا! جب ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں تو میں کیسے اتنا بڑا جھوٹ بول دوں؟ پھر تمہارے تایا ابو نے کب ہم سے کوئی تعلق رکھا ہے؟'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولے تھے۔

''مگر ابو......!''

''ابو نے بالکل ٹھیک کیا انس! رشتے وہی مضبوط و پائیدار ہوتے ہیں جن کی بنیاد خلوص اور سچائی پر رکھی جاتی ہے۔'' ناجیہ نے بھائی کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور کچھ بولتا' دروازے پر بیل ہوئی تھی۔

''میں دیکھتا ہوں جا کر۔'' انس نے اٹھنا چاہا تھا۔

''نہیں بیٹا! بیٹھو' مجھ سے ملنے کسی کو آنا تھا۔'' عظیم صاحب اٹھ کر باہر کی طرف چل دیے۔

''دیکھنے میں کیسے معصوم اور شریف لوگ لگتے تھے' مجھے امید نہ تھی کہ وہ ایسا جواب دیں گے۔'' فریدہ بیگم ابھی تک ناجیہ کے رشتہ کو لے کر افسردہ تھیں۔

''ہاں امی! معصوم تو وہ بہت تھے' پہلے تو نہایت خاموشی سے چائے پانی' دیگر لوازمات کو ٹھونسا پھر کھانے کا کہا گیا تو بھی انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر لڑکی پسند نہیں تھی تو خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے' اتنی خاطریں کروانے کی کیا ضرورت تھی؟ خدا ایسے معصوموں اور شریف لوگوں سے بچائے۔'' راجیہ نے استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔

''ناجیہ......! اب تم بھی کان کھول کر سن لو' اب سچائی اور خلوص کا طلب گار کوئی نہیں رہا' سب دولت اور امارت کے متلاشی ہیں لہٰذا تم بھی خوابوں کی دنیا میں رہنے کی بجائے دنیا کے چلن کو سمجھو۔ سچائی خلوص کا پرچار کرنے کی بجائے بناوٹ و جھوٹ کو اپناؤ کہ یہی دنیا کا دستور ہے۔'' راجیہ خاصی تلخ ہو رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ ناجیہ کوئی جواب دیتی' عظیم صاحب پریشان سے چلے آئے تھے۔

''فریدہ بیگم' تمہاری بڑی بہن مجیدہ آپا کا ڈرائیور ہم دونوں کو لینے آیا ہے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے' ہاسپٹل میں ہیں وہ۔ ہمیں جلدی چلنا چاہیے۔ ویسے بھی اس شہر میں ان کا ہمارے علاوہ ہے بھی کون؟ بیٹے تو دونوں باہر سیٹل ہو چکے ہیں۔''

''ایسے موقعوں پر صرف غریب رشتے دار ہی یاد آتے ہیں۔'' انس نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ زمانے کے چلن اور رشتے داروں کے غلط رویوں نے انہیں ہر ایک سے بدظن کر دیا تھا۔

''نہ بیٹا! ایسا نہ کہو' وہ تمہاری خالہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ ہر اچھے برے وقت میں تعلق رکھا' کبھی اپنی دولت و حیثیت پر غرور نہیں کیا' بس ان کے لیے دعا کرو۔'' عظیم صاحب نے نرمی سے سمجھایا تھا۔

''سوری ابو!'' انس نے فوراً معذرت کر لی تھی۔

''اچھا اب ہم چلتے ہیں' تم لوگ پریشان نہ ہونا' جانے وہاں کتنی دیر ہو جائے' فریدہ! آؤ' تم پریشان مت ہو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔''

ان کے جانے کے بعد ناجیہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ کل پہلا روزہ تھا اور سحری کی تیاری بھی کرنا تھی مگر اس وقت اس کی طبیعت پر بہت اداسی طاری تھی۔

''مجھے کیا ہوا ہے' میں اتنی اداس کیوں ہوں؟ پہلی مرتبہ تو ایسا نہیں ہوا' لوگ تو ہمیشہ مجھ سے نہیں' میری حیثیت سے ہی تعلق جوڑتے آئے ہیں۔ گاڑی' بنگلہ' بینک بیلنس' یہ سب چیزیں بے جان ہو کر بھی کتنی اہم اور معتبر ہیں سب کے لیے' وقت کس ڈگر پہ گامزن ہے' کیا کم حیثیت ہونا جرم ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا تھا پھر اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کیں۔ ایسا تو کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ لوگ اس کی معصوم صورت' اعلیٰ اخلاق سے متاثر ہو کر اس کے

طلب گار بن کر آتے لیکن یہ جان کر کہ تنگ و تاریک گلی میں واقع دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں رہنے والی ناجیہ پوسٹ آفس میں ملازم معمولی سے شخص کی بیٹی ہے' ان کی پسندیدگی' ناپسندیدگی میں ڈھل جاتی۔ لوگ اسے ریجیکٹ کر کے چلے جاتے' تب حساس' خوددار ناجیہ اپنی اس بے توقیری پر بہت دنوں اداس و نڈھال رہتی۔

☆......☆......☆

امی ابو کی رات ہاسپٹل میں گزری تھی۔ ان کی آمد صبح سحری سے تھوڑی دیر قبل ہی ہوئی تھی۔

''ناجیہ' تم سحری کرلو اور جلدی سے اپنے جانے کی تیاری کرو۔'' فریدہ بیگم نے اس سے کہا۔

''کہاں جانے کی؟'' سحری کے لیے پراٹھے بناتے ہوئے ناجیہ نے بڑی حیرانی سے پوچھا تھا۔

''مجیدہ خالہ کے ہاں جانے کی۔ ان کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے انہیں گھر بھیج دیا ہے لیکن گھر میں کوئی نہیں ہے جو ان کی دیکھ بھال کر سکے۔ ملازموں پر تو انہیں چھوڑا نہیں جاسکتا۔ ان کا بیٹا آنے کا پروگرام بنا تو رہا ہے مگر شاید ابھی کنفرم نہیں ہے۔ بیٹے انہیں اپنے پاس بلا رہے ہیں مگر وہ باہر جانا نہیں چاہتیں اور نہ ہی مستقل ان کے پاس رہنا چاہتی ہیں کیونکہ ان کا دل وہاں نہیں لگتا۔ اب یہاں تنہا ہیں۔ تمہارے ابو نے تو ان سے کہہ بھی دیا کہ ناجیہ کو بھیج دوں گا۔ بیٹا' تم اپنی خالہ جانی کا بہت خیال رکھنا۔ اب جلدی سے تیاری کرلو' تمہارے ابو آفس جانے سے پہلے تمہیں وہاں چھوڑ دیں گے۔'' فریدہ بیگم نے تفصیل سے ہر بات بتائی تھی۔

''مگر امی! اب تو رمضان بھی شروع ہو چکے ہیں اور سحری و افطار میں کتنا کام ہوتا ہے' آپ اکیلی یہ سب کیسے کریں گی؟'' ناجیہ نے ماں کا خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے بیٹا' شادی کے بعد جب تم نہیں ہوگی' تب بھی مجھے ہی سب کچھ کرنا ہوگا' تم میری فکر مت کرو۔ راجیہ ہے میرے پاس' ہم دونوں مل کر کرلیں گے اور تم کون سا مہینے بھر کے لیے جارہی ہو۔ جیسے ہی ان کی طبیعت میں بہتری نظر آئے گی' میں تمہیں بلوا لوں گی۔'' فریدہ بیگم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''جاؤ اب جلدی سے جاکر تیاری کرلو۔''

''امی جان! آپ کیوں گھبرا رہی ہیں؟ تیاری میں کون سا وقت لگے گا؟ ناجیہ کے پاس کون سے ڈھیروں جوڑے ہیں جو اسے سلیکٹ کرنے میں دیر لگے گی۔'' راجیہ نے ان کی بات سن کر ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا تھا۔ جواباً ناجیہ اسے ناراضگی سے گھور کر رہ گئی تھی۔ ناجیہ لائف بوائے شیمپو اٹھا کر بال دھونے چل دی تھی۔ کیونکہ اُس کے بغیر وہ خود کو ادھورا محسوس کرتی تھی۔

☆......☆......☆

''خالہ جانی! یہ دودھ پی لیں۔'' ناجیہ نے بہت محبت سے دودھ کا گلاس آگے بڑھایا تھا۔

''جیتی رہو بٹی! تم میرا کس قدر خیال رکھتی ہو' اللہ تمہیں خوش رکھے۔ عظیم بھائی نے میری تنہائی کا احساس کیا اور تمہیں میرے پاس چھوڑ دیا۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ دیکھو بیٹا! اسے اپنا ہی گھر سمجھنا اور کوئی تکلف نہ کرنا' افطار اور سحری میں جو تمہارا دل چاہے' بنوا لینا۔ اب میں تو تمہارا ساتھ دے نہیں سکتی۔''

''نہیں خالہ جانی! تکلیف کیسی' مجھے تو آپ کے ساتھ رہنا' آپ کا خیال رکھنا بہت اچھا لگ رہا ہے کیوں کہ ہمارے اکثر رشتے دار تو ویسے ہی ہمارے ہاں بہت کم آتے ہیں اور ہمیں بھی اپنے ہاں بلانے یا اپنی خوشیوں میں شامل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ خالہ' میں اکثر سوچتی ہوں' یہ دولت بھی کیسی شے ہے' اس کا نشہ انسانی رگوں میں شامل ہو کر خون کے رشتے تک بھلا دیتا ہے۔''

''ہاں بیٹا! یہ تو لوگوں کی اپنی سوچ ہے۔ بے جان چیزیں راحت ضرور دیتی ہیں مگر آسودگی اور محبت نہیں۔ اصل خوشی تو اکٹھے مل بیٹھنے اور آپس میں دکھ سکھ بانٹنے میں ہے۔'' مجیدہ خالہ نے ناجیہ کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

''بیگم صاحبہ! عفت صاحبہ کا ڈرائیور یہ کچھ کپڑے لایا ہے۔'' ملازم کرمو شاپر اٹھائے چلا آیا تھا۔

''ہاں' میں نے ہی منگوائے ہیں۔'' کرمو شاپرز ان کے پاس رکھ کر چلا گیا۔

''ناجیہ! ان شاپرز میں موجود تمام سوٹ تمہارے ہیں۔''

''مگر خالہ جانی! مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے میرے پاس کپڑے موجود ہیں۔'' ناجیہ نے انکار کرنا چاہا تھا۔

''بیٹا! میں نے بڑی محبت و شوق سے تمہارے لیے یہ کپڑے اپنی دوست عفت سے منگوائے ہیں۔ اس کی اپنی

ہوتیک ہے' تم انہیں پہنو گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔'' خالہ نے نہایت محبت سے اصرار کیا تو ناجیہ ان کا دل نہ توڑ سکی تھی۔

☆......☆......☆

ناجیہ کی مسلسل دیکھ بھال نے خالہ کو بڑی جلدی صحت یابی کی طرف گامزن کردیا تھا۔ وہ دراصل تنہائی کی مریضہ تھیں۔ خالی گھر انہیں کاٹنے کو دوڑتا تھا مگر جب سے ناجیہ آئی تھی' ان کی تنہائی ختم ہوگئی تھی۔ آج ان کے بیٹے کا ایک دوست ڈاکٹر فائنل چیک اپ کے لیے آیا ہوا تھا۔

'' ارے واہ بھئی آنٹی! آپ تو بالکل ٹھیک ہیں لہٰذا یہ بیڈ چھوڑیں' گھومیں پھریں اور خوش رہیں۔'' ڈاکٹر عاصم نے انہیں چیک کرنے کے بعد بڑی بشاشت سے کہا تھا۔ '' ویسے آنٹی! ماشاءاللہ' آپ نے بہت جلدی امپروو کرلیا؟''

'' بس بیٹا! اس میں خدا کا فضل اور میری بچی ناجیہ کی کوشش شامل ہے۔ جس نے دن رات ایک کرکے میری خدمت کی۔'' خالہ نے چائے لاتی ناجیہ کو پیار سے دیکھ کر کہا تھا۔

'' آنٹی! بائی دا وے' آپ کو یہ اتنی پکی پکائی خدمت گزار بیٹی اچانک کہاں سے مل گئی؟ آپ کے تو صرف دو ہی بیٹے ہیں' وہ بھی نافرمان و ناخلف۔'' قریب ہی بیٹھے شرجیل نے ہنس کر لقمہ دیا تھا۔

'' خبردار' جو میرے بیٹوں کو کچھ کہا۔ نعمان' عفان کا فون آیا تو بتادوں گی کہ تمہارے دوست تمہیں کن خطابوں سے نواز رہے ہیں۔'' خالہ نے انہیں ڈرایا تھا۔

'' آؤ ناجیہ بچی! ڈاکٹر عاصم سے تو تم واقف ہو' ان کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ ساتھ میں یہ شوخ و شرارتی سا شرجیل ہے۔ یہ نعمان' عفان کا بہت اچھا دوست ہے۔ یہ بھی مجھے اپنے بچوں کی طرح ہی عزیز ہے۔''

ناجیہ عاصم سے متعارف تھی لیکن شرجیل سے آج اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے خوش خلقی سے اسے سلام کیا تھا۔

'' ناجیہ صاحبہ! ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ نے اپنی خدمت گزاری سے ہماری آنٹی کو جلد صحت یاب کردیا۔ اب انہیں اس کمرے سے نکالیں' کھلی فضا میں گھمائیں بلکہ شام میں روز سیر پر لے جایا کریں۔''

'' عاصم بیٹے! کس سے کہہ رہے ہو' یہ تو خود گھومنے پھرنے کے معاملے میں مجھ پر گئی ہے' بہت کم باہر نکلتی ہے۔''

'' اچھا' پھر تو کچھ سوچنا پڑے گا۔''

'' ڈونٹ وری' یہ ڈیوٹی میں سنبھال لیتا ہوں۔ کیوں آنٹی؟'' شرجیل نے اپنی خدمات پیش کرکے تائید چاہی تھی۔

'' تمہیں مشکل تو نہیں ہوگی؟''

'' ارے نہیں' مجھے حقیقتاً خوشی ہوگی بلکہ مجھے تو اب یہاں سے جانا مشکل لگ رہا ہے۔'' شرجیل نے سامنے بیٹھی ناجیہ کو دیکھ کر ذومعنی لہجے میں کہا تھا۔ اور اب وہ کمرے سے جاتی ناجیہ کے گھنے سیاہ بالوں میں خود کو کھوتا ہوا محسوس کررہا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن ٹھیک شام پانچ بجے شرجیل وہاں موجود تھا۔

'' شرجیل بیٹے! تم تو وعدے اور وقت کے بہت پابند نکلے ورنہ میرا تو خیال تھا کہ تم بھول جاؤ گے۔'' خالہ نے حیرت و استعجاب سے کہا تھا۔

'' آنٹی! یہ کوئی بھولنے والی بات ہے؟ آپ کو پتہ ہے کہ یہاں آنا میرے لیے کس قدر خوشی کا باعث ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ پچھلے دنوں آپ بیمار رہیں اور میں شہر سے باہر رہا۔ وہ تو عاصم نے مجھے کال کرکے بتایا تو میں بھاگا چلا آیا۔''

'' جیتے رہو بیٹا!'' خالہ اس کی محبت پر مسکرادیں۔ ناجیہ کو اس کی نظریں ڈسٹرب کررہی تھیں لہٰذا اس نے وہاں سے اٹھنے کا بہانہ ڈھونڈا مگر شرجیل سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کا اندازہ اسے چند دن میں ہی ہوگیا تھا۔ وہ نہ صرف روزانہ باقاعدگی سے آتا بلکہ ہر پروگرام' ہر بات میں بہانے بہانے سے ناجیہ کو ضرور شامل کرتا۔ اس کے معنی خیز جملے' شریر نگاہیں اسے پریشان کردیتیں۔ آج تو اس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ چاہے جو بھی ہو' وہ شرجیل کے سامنے ہرگز نہیں جائے گی۔ وہ اس کی آمد کا سن کر باہر لان میں چلی آئی تھی مگر کچھ ہی دیر بعد وہ اسے ڈھونڈتا ہوا وہیں چلا آیا تھا۔

'' مان لیں کہ آپ بہت ظالم ہیں۔'' اس نے خفگی سے کہا تھا۔

'' کیوں' میں نے کیا کیا ہے؟'' ناجیہ نے تجاہل برتا تھا۔

'' یہ بھی مجھے بتانا پڑے گا' ہر روز شام ہونے کا انتظار کرتا ہوں تاکہ محترمہ کا دیدار نصیب ہو اور آپ کو میری کچھ پرواہ ہی نہیں ہے۔'' شرجیل نے جیسے گلہ کیا تھا۔

'' کیوں کرتے ہیں ایسا' مت کیجیے۔'' ناجیہ نے

آہستگی سے کہا تھا۔

''ناجیہ! کیا آپ واقعی میرے احساسات و جذبات سے بے خبر ہیں؟ یہ سچ ہے کہ میں نے ابھی تک اپنے جذبات کو لفظوں کا پیراہن نہیں دیا مگر کیا میری نگاہیں آپ کو کچھ نہیں سمجھا سکیں اگر آپ میری زبان سے ہی سننا چاہتی ہیں تو یوں ہی سہی، مجھے آپ پہلی نظر میں ہی بے حد اچھی لگیں۔'' شرجیل نے قریب آ کر سرگوشی کی تھی تو ناجیہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی خاموشی گواہ تھی کہ صرف شرجیل ہی اسیر محبت نہیں ہے، وہ بھی گھائل ہے۔ زیست میں محبت کے رنگ جھلملائے تو ناجیہ کے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے تھے۔

☆......☆......☆

شرجیل! آپ نے یہ کیا کہہ دیا کہ دن میرے انتظار میں بے چینی سے گزرتا ہے تو رات کو میری یاد سونے نہیں دیتی۔ ناجیہ نے اپنے خوب صورت لمبے سیاہ بالوں میں برش کرتے ہوئے مسکرا کر سوچا تھا پھر چوڑی باکس میں سے اپنے سوٹ کے ساتھ میچ کرتی بلیو کلر کی چوڑیاں نکال کر پہننے لگی تھی۔

''بی بی جی! آج افطار میں کیا بناؤں؟'' ملازمہ اختری نے پوچھا تھا۔

''تم اس کی فکر نہ کرو، میں نے رول بنا کر فریج میں رکھ دیے ہیں۔ کباب بھی پڑے ہیں وہ فرائی کر لیتی ہوں۔ تم فروٹ چاٹ اور تھوڑے سے پکوڑے بنا لو۔'' ناجیہ دراز بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور اختری کے ساتھ کچن میں چلی آئی۔

''یہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' ناجیہ، اختری اور کرمو باتیں کرتے ہوئے افطار کا اہتمام کر رہے تھے کہ شرجیل بھی وہیں آ گیا تھا۔

''صاحب جی، آپ کی بڑی عمر ہے۔ ابھی آپ کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ اختری کہہ رہی تھی کہ آپ کی گارمنٹس فیکٹری ہے، اس لیے آپ روز نیا سوٹ پہنتے ہیں۔ اب آپ ہی بتا دیں کہ آپ کیا کرتے ہیں؟'' کرمو نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

''ارے یار! ایسی راز کی باتیں سر محفل نہیں پوچھتے، تم بتاؤ کیا بنا رہے ہو بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے اسی لیے ادھر ہی چلا آیا۔'' شرجیل نے ایک دم بات کا رخ بدل دیا تھا۔

''...... رول اور کباب بنا رہی ہیں۔''

''یہ تو ہم چیک کر کے ہی بتا سکیں گے کہ کتنے مزیدار ہوں گے۔'' وہ اس کے قریب چلا آیا تھا۔

''اچھی لگ رہی ہو۔'' اس نے آہستگی سے ناجیہ سے کہا تھا اور جلدی سے کچن سے باہر نکل کر آنٹی مجیدہ کے پاس چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

''عظیم بھائی! ناجیہ اب میری بیٹی ہے، آپ کو اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے آپا! مگر لڑکے والے میری جان پہچان کے ہیں۔ حیثیت بھی ہمارے جیسی ہے۔ وہ ناجیہ کو صرف ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اصل میں عید کے فوراً بعد وہ رسم بھی کرنا چاہتے ہیں اسی لیے میں ناجیہ کو لینے آیا ہوں، ایک دو روز میں پھر چھوڑ جاؤں گا۔ میرے خیال میں تو انکار مناسب نہیں، لڑکا کسی پرائیویٹ فرم میں ملازم ہے۔'' عظیم صاحب نے انہیں سمجھانا چاہا تھا۔

''عظیم بھائی! میں آپ کو کسی ایسے ویسے سے اپنی بچی کی شادی نہیں کرنے دوں گی۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں، میں اس کا بیاہ خود دیکھ بھال کر اچھی جگہ کروں گی۔''

''اچھا آپا! جیسی آپ کی مرضی، اب مجھے اجازت دیں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جاتے ہوئے ناجیہ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔

''اچھا بیٹا! اپنا خیال رکھنا۔'' عظیم صاحب اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے تھے۔ ناجیہ اندر جانے کی بجائے وہیں لان میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

''اتنی بے چینی بھی اچھی نہیں۔ ذرا سا لیٹ کیا ہوئے، محترمہ انتظار میں گیٹ کے سامنے ہی دھرنا دے کر بیٹھ گئیں۔'' شرجیل کی آواز پر اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دی تھیں اور بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

''آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں آپ ہی کا انتظار کر رہی ہوں؟'' ناجیہ نے بشاش لہجے میں کہا تھا۔

''ارے، ہمیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں، ویسے یہ بندہ خاصا عقل مند ہے اس لیے سب کچھ جان جاتا ہے، ویسے آج مجھے آنے میں دیر آپ ہی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ سارے جہاں کی دکانیں چھان ماریں مگر افسوس کہ ایسا

خوب صورت تحفہ نہ مل سکا جو آپ کی شان کے مطابق ہو۔''
وہ اس کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔
''یہ آپ کن فضولیات میں پڑ گئے ہیں؟'' ناجیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ حالانکہ آج اُس کا پورا پروگرام تھا کہ وہ شرجیل کو اُس کے ہر بار کیے گئے سوال کہ آپ کے لیے، حسین بالوں کا راز کیا ہے؟ کا جواب ضرور دے گی اور اُسے بتا دے گی کہ اُس کے حسین، سیاہ، چمکدار، مضبوط بالوں کا راز کوئی اور نہیں بلکہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا ''لائف بوائے شیمپو'' ہے۔ مگر شرجیل تو کچھ اور ہی سوچ کر آیا تھا۔ سو وہ اپنا یہ راز بتاتے بتاتے رہ گئی۔
''آنٹی بتا رہی تھیں کہ تمہاری برتھ ڈے آنے والی ہے' سو ایک امیر کبیر خاتون مجیدہ شاہ کی بھانجی جو یقیناً کسی لکھ پتی باپ کی بیٹی ہے' کے مزاج اور پسند کے مطابق تحفہ خریدنا کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔''
''کیا مطلب؟'' ناجیہ نے چونک کر شرجیل کی طرف دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے جواب دیتا' اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ شاید کوئی ایمرجنسی کال تھی۔ وہ عجلت میں چلا گیا تھا اور ناجیہ حیران و پریشان تھی۔
''یہ کیا ہو گیا؟ اس کا مطلب کہ محترم شرجیل احمد میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں چونکہ آنٹی مجیدہ کی بھانجی ہوں' لہٰذا میں بھی کسی امیر کبیر فیملی سے تعلق رکھتی ہوں مگر میں تو...... میں انہیں اپنی اصلیت بتا دوں گی...... اور اگر انہوں نے بھی میری اصلیت جان کر باقی لوگوں کی طرح ہی ہو کیا' مجھے ریجیکٹ کر دیا یا مجھے چھوڑ دیا تو؟ پھر کیا ہوگا؟ جن راہوں پر میں قدم رکھ چکی ہوں' وہاں سے پلٹنا میرے لیے مشکل ہی نہیں' ناممکن ہوگا۔'' شرجیل کے جانے کے بعد ناجیہ ان ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔
''لیکن میں اتنا کیوں پریشان ہو رہی ہوں؟ خالہ جانی کہہ تو رہی تھیں کہ میں اب ان کی ذمے داری ہوں۔ جب سب کچھ انہیں ہی کرنا ہے تو شرجیل کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ نہیں...... نہیں' میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گی کیوں کہ میں انہیں کھونا نہیں چاہتی۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' اپنے کمرے میں آ کر وہ فیصلہ کر کے بیڈ پر دراز ہو گئی اور آنکھیں موند لیں مگر آج تو نیند بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے [illegible] سکون نہ آ رہا تھا۔

''سچائی کے اصولوں پر چلنے والی اور خلوص کا پرچار کرنے والی ناجیہ کیا اپنی زندگی کے اس اہم ترین خوب صورت رشتے کی بنیاد جھوٹ و فریب پر رکھ کر خوشی سے جی پائے گی؟'' دل نے جیسے صدا دی تھی۔
''تم نے تو زندگی بھر کبھی کسی سے مانگے کا سوٹ تک پہننا گوارا نہیں کیا' اب کیا اپنی خوشیاں غیروں کے نام و رتبے سے خریدو گی؟ کہاں گئے تمہارے وہ سارے اصول' تمہاری سچائی اور خودداری' کیا وہ تمام باتیں اور دعوے ایسے ہی تھے؟'' اس کا ضمیر بار بار اسے ملامت کر رہا تھا۔
پوری رات ناجیہ نے ایک عجیب سی کشمکش میں گزاری تھی اور پھر آخر کار اس کے دل نے ایک فیصلہ کر ہی لیا تھا۔
سحری کے بعد فجر کی نماز پڑھی' اپنی خوشیوں بھری راہ گزر کے لیے دعا مانگ کر اس نے مجیدہ خالہ کے دیے ہوئے تمام ڈریسز واپس الماری میں رکھ دیے اور اپنا ایک سادہ سا سوٹ نکال کر پہن لیا تھا۔ شام کو جب شرجیل آیا تو وہ ان ہی کپڑوں میں ملبوس تھی۔
''یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ کچھ پریشان لگ رہی ہو؟''
''میں آج آپ کو اپنے متعلق سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتی ہوں اور اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتی ہوں جو آپ کو میرے بارے میں ہو گئی ہے۔ میرے والد ایک پوسٹ آفس میں ملازم ہیں۔ میرا دو کمروں کا چھوٹا سا گھر ایک تنگ و تاریک گلی میں واقع ہے جہاں سے آپ کی بڑی بڑی گاڑیاں نہیں گزر سکتیں۔ مجھے پتا ہے کہ میری اصلیت جاننے کے بعد آپ جیسا دولت مند' امیر شخص مجھ سے کوئی تعلق یا رشتہ جوڑنا اپنی توہین خیال کرے گا' میرا یہ سچ آپ کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور کر دے گا مگر میں اپنے زندگی کے کسی بھی معاملے یا رشتے کی بنیاد جھوٹ و فریب پر نہیں رکھ سکتی۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔ باقی فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔'' ناجیہ نے تمام باتیں بڑی آہستگی سے کیں اور شرجیل کا جواب سنے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کیونکہ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی محبت کی توہین برداشت کر سکتی۔
شرجیل چند لمحے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر وہ بھی باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

عید سے تین چار روز پہلے ناجیہ اپنے گھر واپس لوٹ

آئی تھی۔

''کیا بات ہے ناجیہ! جب سے تم مجیدہ خالہ کے گھر سے آئی ہو بہت چپ چپ ہو؟'' راجیہ نے پوچھا تھا۔

''نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' ناجیہ جیسے خود سے بھی کچھ چھپا رہی تھی۔ حقیقت میں اسے اس بات کا بہت دکھ تھا کہ شرجیل احمد بھی ایک عام انسان ثابت ہوئے۔ انہیں بھی محبت کی بجائے دولت اور شان عزیز تھی' تبھی تو وہ لوٹ کر نہیں آئے' مجھ جیسی غریب لڑکی سے شادی کر کے انہیں بھلا کیا مل جاتا۔ اس دنیا میں سچائی اور خلوص کی کوئی قیمت نہیں مگر میرے خدا! تو نے میرے دل میں شرجیل احمد کی محبت کی جو شمع روشن کردی ہے' اس کا کیا ہوگا۔ سوچتے سوچتے اسے نیند نے آگھیرا تھا۔

مجیدہ خالہ کے دونوں بیٹے' ماں کے پاس عید گزارنے آگئے تھے۔ رمضان کا آخری روزہ انہوں نے اپنے گھر افطار کروانے کا اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے تمام لوگوں کو آنے کی تاکید کے ساتھ خاص طور پر ناجیہ کو مخاطب کیا تھا۔

''ناجیہ بیٹا! تم ضرور آنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔'' وہ چاہنے کے باوجود بھی انکار نہ کرسکی تھی۔ اسے مجبوراً جانا ہی پڑا تھا۔ روزہ افطار کر کے' نماز وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ناجیہ باہر لان کے ایک خاموش گوشے میں آبیٹھی تھی۔

''کاش میں یہاں نہ آئی ہوتی تو یہ دکھ میرا مقدر نہ بنتا۔'' ناجیہ نے دکھے دل سے سوچا تھا' گئے دنوں کا ایک ایک لمحہ کرب ناک یاد بن کر اس کی آنکھوں کو نم کررہا تھا۔

''ناجیہ! آپ یہاں چھپی بیٹھی ہیں اور میں کب سے آپ کو تلاش کررہا ہوں۔''

مانوس سی آواز پر ناجیہ نے چونک کر پیچھے مڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ شرجیل احمد گرے کلر کے سادہ سے کرتا شلوار میں ملبوس اس کے روبرو تھے۔

''شرجیل! آپ......؟'' ناجیہ حیران ہوئی تھی۔

''ہاں میں' اور میں آنٹی کا پیغام ملنے پر یہاں صرف اس لیے آیا ہوں کہ شاید اسی بہانے آپ سے ملاقات ہو جائے۔''

''کیوں؟ پھر کوئی نیا زخم دینا چاہتے ہیں؟'' وہ تلخی سے بولی تھی۔

''ناجیہ! مجھے پتا ہے کہ آپ مجھ سے بے حد خفا ہیں مگر پلیز' ایک مرتبہ میری بات سن لیجیے پھر جو دل چاہے' سلوک کیجیے گا۔ اس دن آپ نے تو اپنی حقیقت مجھ پر آشکار کردی اور میرا جواب سنے بغیر میرے بارے میں رائے بھی قائم کرلی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے آپ کی اصلیت جان کر شاک سا لگا تھا مگر بخدا' یقین کیجیے کہ میں نے آپ کی امیری یا غریبی سے محبت نہیں کی بلکہ سچے دل سے آپ کو چاہا ہے۔ ہاں' آپ کی بات سو فیصد ٹھیک تھی کہ محبت کرنے والوں کے درمیان امیر اور غریب کا فرق ہمیشہ سے رہا ہے اور یہ دنیا دو محبت کرنے والوں کو دولت کے ترازو میں تولتی ہے۔ میں اس عرصے میں آپ سے صرف اس لیے نہیں مل سکا کہ مجھے اپنے گھر والوں کو اس رشتے کے لیے منانا تھا کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن میری خوشی کے آگے انہوں نے ہار مان لی ہے۔ میں نے آپ سے محبت کی تھی کوئی سودے بازی نہیں اور آپ کے خیالات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ سچائی اور خلوص کے اصولوں پر اپنے رشتے کی بنیاد رکھنا چاہتی ہیں۔ آپ کی سوچوں اور خیالات نے میرے دل میں آپ کا مقام اور بلند کردیا۔ آپ نے نہایت جرأت سے سچ کہہ دیا۔ اب تو آپ نے مجھے معاف کردیا ہوگا یہ سب سن کر اور ہاں' کیا آپ مجھے ہم سفری کا شرف بخشیں گی؟ میرے گھر والے آج ہی اور ابھی آپ کے والدین سے ہمارے رشتے کی بات کریں گے اور عید کے فوراً بعد منگنی کی رسم ادا کی جائے گی۔ کہیے آپ کو میرا ساتھ زندگی بھر کے لیے منظور ہے؟''

ناجیہ بس خاموش شرجیل احمد کو دیکھے جارہی تھی۔

''دیکھیے پلیز' آپ انکار کر کے میری عید خراب نہ کردیجیے گا؟'' شرجیل احمد نے اپنے ہاتھ جوڑ کے ملتجی لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر اچانک سے ایک ساشے اس کے جڑے ہاتھوں سے نیچے گرا تھا۔ ناجیہ نے ساشے اٹھایا تھا۔ لائف بوائے شیمپو کے ساشے دیکھ کر اس کی ہنسی نکل گئی۔

''جو محبت کرتے ہیں وہ محبت کرنے والوں کے ہر راز سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ آپ کے حسین بالوں کا راز' آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔''

جواباً ناجیہ دھیمے سے مسکرادی تھی اور شرجیل کو اقرار کے تمام رنگ مل گئے تھے۔

☆☆......☆☆

جدا نہ ہوں گے ہم

سیما غزل

درد و وصال لیے پہلی انعام یافتہ یادگار داستان

طاہر کا قصور صرف یہ تھا کہ اس کے باپ کی اس شہر میں بہت بڑی لانڈری تھی۔ حمیدہ خاتون کو جب معلوم ہوا کہ ان کی بیٹی طاہر کو پسند کرتی ہے، تو انہوں نے اپنے شوہر عظمت علی سے ذکر کر دیا اور ایک

قیامت کھڑی ہوگئی۔ عجیب تناؤ سا پورے ماحول پر چھا گیا۔ حمیدہ خاتون کسی صورت بھی اس پر تیار نہ تھیں کہ اپنی بیٹی کو کسی دھوبی کے بیٹے سے بیاہ دیں۔ ارم نے اس سلسلے میں اپنی سہیلی شائستہ سے مدد مانگی۔ شائستہ نے حمیدہ خاتون کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ جو سارے شہر میں کاروبار پھیلے ہوئے ہیں، فرنیچر کے، ریڈی میڈ گارمنٹس کے، کپڑا بنانے کی ملوں کے اور لوہے کے تو یہ بھی بڑھئی، درزی، جولاہے لوہار ہیں، کیا یہ سب کاروبار ہیں، پیشے ہیں ......اور پیشے انسان کی شناخت نہیں ہوتے' مگر حمیدہ خاتون کی تو بس ایک ہی رٹ تھی کہ طاہر دھوبی کا بیٹا ہے، چاہے وہ کچھ بھی بن جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب طاہر کے گھر والے ارم کے لیے پیام لے کر آئے تو حمیدہ خاتون نے انہیں ٹکا سا جواب دے دیا۔

ارم کی ساری تمنائیں، آرزوئیں اور ساری امنگیں دھواں بن کر تحلیل ہوگئیں۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں مقید کرلیا۔ اُس کے آنسوؤں، چہرے پر پھیل جانے والی زردی اور آنکھوں میں بس جانے والی تنہائی نے بھی حمیدہ خاتون کے دل میں نرمی پیدا نہ کی۔ اس نے چاہا کہ طاہر کو بھول جائے مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی طاہر کی کھوئی کھوئی آنکھیں اس کے دل میں اتر جاتیں۔ پھر اس کا کسی کام میں جی نہ لگتا۔ اس نے اپنے کمرے کی وہ کھڑکی جو طاہر کے گھر کی طرف کھلتی تھی بند کردی مگر اپنے ذہن کی ان کھڑکیوں کو بند نہ کرسکی جو ساری اسی طرف کھلتی تھیں۔ وہ اپنی تباہی پر کھل کر رو بھی نہ پائی تھی کہ اس کے پاپا عظمت علی کو دل کا دورہ پڑ گیا اور وہ تین ہی دن میں چٹ پٹ ہوگئے۔

ماں کی بیوگی دیکھ کر ارم اپنا دکھ بھول گئی۔ گھر میں طاہر کا کوئی ذکر نہ سُن کر حمیدہ خاتون بھی مطمئن سی ہوگئیں، مگر ارم کی چھوٹی بہن صدف اس کی آنکھوں میں ویرانی دیکھ کر چپکے سے رو دیا کرتی۔ ارم نے اپنے آپ کو گھر کے کاموں میں مصروف کرلیا۔ جو وقت اسے مل جاتا اس میں وہ کتابیں لے کر لیٹ جاتی۔

آج شام بھی وہ کمرا بند کیے کتاب پڑھ رہی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اُسے چونکا دیا۔ اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو شائستہ کو دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''آؤ شائستہ!''

''ارم! یہ تُو نے اپنی کیا حالت بنالی ہے؟''

''کیوں' کیا ہوا ہے مجھے؟'' اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آئینہ دیکھا ہے تم نے؟''

''نہیں! بہت دن ہوئے دیکھے ہوئے۔ تم بیٹھو تو سہی۔''

شائستہ بیٹھ گئی اور اپنے پرس میں کچھ ٹٹولنے لگی۔ ارم خاموش بیٹھی اُسے دیکھ رہی تھی۔

''یہ لو!'' شائستہ نے نیلے رنگ کا لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے یہ؟'' ارم نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''کیا ہوسکتا ہے' طاہر کا خط ہے۔ مجھے ابھی اس کا جواب چاہیے۔ اس نے مجھ سے التجا کی۔'' کہ تم سے جواب ضرور لا کردوں۔''

ارم نے خط کھول کر پڑھا۔ بڑا مختصر سا خط تھا۔ طاہر نے لکھا تھا کہ مجھے شِپ پر ریڈیو آفیسر کی جاب مل گئی ہے۔ میں کل شِپ پر جارہا ہوں، تین مہینے کے لیے میری خواہش ہے کہ تمہاری بس ایک جھلک دیکھ لوں۔

''نہیں شائستہ، میں کوئی جواب نہیں دے سکتی پلیز!'' خط پڑھ کر ارم نے کہا اور رو دی۔

''دیکھو ارم وہ اتنے عرصے کے لیے جارہا ہے۔ اُسے خدا حافظ تو کہہ دو۔''

پھر شائستہ نے اُسے آمادہ کرلیا کہ وہ صرف چند لمحوں کے لیے طاہر سے مل لے۔ جاتے وقت شائستہ ارم کی امی سے کہہ گئی کہ شام کو میں گاڑی بھیج دوں گی، آپ ارم کو ضرور بھیج دیں۔

حمیدہ خاتون نے ارم کی حالت اور اس کی تنہائی کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ہامی بھرلی۔

......☆☆☆......

شام کوارم شائستہ کے گھر پہنچی تو طاہر وہاں موجود تھا۔ طاہر اور شائستہ کا بھائی دونوں دوست تھے۔

چند لمحوں کی یہ ملاقات دونوں کے اندر گھاؤ سے ڈال گئی۔

''کیسی عجیب بات ہے ارم کہ آج کے زمانے میں بھی ذات پات کی دیواریں اسی طرح کھڑی ہیں جس طرح برسوں پہلے کھڑی تھیں۔'' طاہر نے زخمی لہجے میں کہا۔

''طاہر! بھول جاؤ سب کچھ پلیز......'' وہ روئی اور پھر جانے کتنی دیر روتی رہی۔

''کچھ باتیں کہنے میں بہت آسان ہوتی ہیں ارم! مجھے امید نہیں کہ میں اس کوشش میں کامیاب ہو سکوں گا، لیکن کوشش ضرور کروں گا۔ صرف اتنا بتا دو کہ اگر پھر بھی میں نہ بھول پایا تمہیں تو کیا کروں؟''

ارم بھلا کیا جواب دیتی، آنسو بہاتی واپس آ گئی۔

پھر وہ چلا گیا۔ ارم کو یوں لگا جیسے اس کے اندر اور باہر موسم بدل گیا ہے، جیسے سب کچھ خالی خالی ہے، جیسے کہیں کسی شے کی کمی ہے، اس کے کمرے کی بند کھڑکی جس پر ہر لمحے وہ طاہر کی نگاہوں کی سرسراہٹ محسوس کرتی تھی، ساکت ہو گئی۔ کتنے ہی دن ویرانیوں میں کٹ گئے، پھر ویرانیاں اس کے وجود کا حصہ بن گئیں۔

☆......☆......☆

ارم گھر میں داخل ہوئی تو وقار بیٹھا تھا اور ارم کی امی نے حسب معمول میز پر نمکین چیزوں کا ڈھیر لگایا ہوا تھا۔ سموسے، دال موٹ، چپس اور نہ جانے کیا کیا رکھا تھا وہ سلام کر کے سیدھی غسل خانے میں چلی گئی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ جلتی دوپہر نے اُسے جھلسا دیا تھا۔ اگر شائستہ نے ضد نہ کی ہوتی تو ارم اس کے ساتھ بازار جانے پر راضی نہ ہوتی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگلے ماہ شائستہ کی شادی تھی۔ شائستہ اس کی واحد سہیلی تھی۔ شادی کے سلسلے میں شاپنگ کرنا تھی اور وہ چاہتی تھی کہ ارم کی پسند سے کپڑا خریدے۔ ارم کئی دن سے ٹال رہی تھی۔ مگر اب اسے مزید ٹالنا ممکن نہیں رہا تھا۔ آج صبح جب شائستہ نے اُسے فون کیا اور اس سے ناراض ہونے کی دھمکی دی تو اس نے وعدہ کر لیا۔ وہ صبح سے شائستہ کے ساتھ نکلی تو چار بج گئے۔

نہا کر وہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ امی، صدف اور وقار، چائے پی رہے تھے۔

''باجی آپ کے لیے چائے نکالوں؟'' صدف نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''ہاں اور آپ کیسے ہیں؟'' وہ صدف سے چائے کے لیے کہہ کر وقار کی طرف متوجہ ہوئی۔

''بس ٹھیک ہی ہیں!'' وقار نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

حمیدہ خاتون میں امی اُٹھ کر اپنے کمرے نماز پڑھنے میں چلی گئیں۔

''صدف آج چودھویں کی رات ہے سمندر دیکھنے چلیں؟'' وقار نے صدف سے کہا۔

''ہاں وقار بھائی چلیں! بچ بڑا مزا آئے گا۔ میں ابھی امی سے پوچھ کر آتی ہوں۔'' صدف یہ کہہ کر امی کے کمرے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

''پاگل ہے! کہیں گھومنے کے نام پر دیوانی ہو جاتی ہے۔'' ارم چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''آپ کا جی نہیں چاہتا۔'' وقار نے پوچھا۔ ''ویسے ایک بات کہوں آپ سے! آدمی کو تھوڑا تھوڑا پاگل بھی ہونا چاہیے۔''

''کیوں، یہ کوئی بہت اچھی صفت ہے کیا؟'' وہ ہنس دی۔

''نہیں! ایسے پاگل پن سے آدمی کے اندر کی لطافت محسوس ہوتی ہے۔ چاند آسمان سمندر اور ساحل سے پیار آدمی کے اندر نرمی اور گداز پیدا کرتا ہے۔'' وقار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ارم نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔ نہ جانے وقار کی آنکھوں میں کیا بات تھی کہ ارم زیادہ دیر ان آنکھوں کی تاب نہیں لا پاتی تھی۔

جب اس نے وقار کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ تب بھی وہ لمحہ بھر سے زیادہ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی

تھی۔ اُسے یاد تھا کہ پاپا کے انتقال کے چند روز بعد ہی ایک دن سفید کار گیٹ کے پاس آ کر رکی تو وہ سمجھی شائستہ آئی ہے۔ شائستہ کے پاپا کے پاس بھی ایسی ہی کار تھی۔ ارم نے جلدی سے گیٹ کھول کر باہر جھانکا تو اپنے سامنے براؤن سوٹ میں ملبوس ایک اجنبی کو دیکھ کر بوکھلا گئی۔

''جی!...... کس سے...... کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' ارم نے پوچھا۔

''آپ سب سے!'' اجنبی نے بڑے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

''جی!'' ارم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''آپ کا نام؟''

''وقار، وقار الحسن۔''

پھر جب اس نے اندر جا کر اپنی امی کو وقار کے بارے میں بتایا تو وہ اچھل پڑیں۔ ''ارے وقار آیا ہے بلاؤ اسے اندر۔''

ارم حیران سی اسے بلانے کمرے سے باہر نکلی تو وہ برآمدے تک آ چکا تھا۔ گویا وہ اس کے پیچھے ہی پیچھے اندر آ گیا تھا۔ ارم کو اس کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی، مگر امی نے جس اپنائیت سے اس کا نام لیا تھا اس سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ گھر ہی کا آدمی ہو۔

''آیئے!'' وہ اسے لیے حمیدہ خاتون کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ حمیدہ خاتون نے اسے گلے لگا لیا اور پھر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ارم اب بھی حیران کھڑی تھی۔ اسی دوران میں صدف بھی آ گئی۔

''یہ کیا چکر ہے باجی؟ یہ کون صاحب ہیں؟''

اس سے پہلے کہ وہ صدف کی بات کا جواب دیتی۔ حمیدہ خاتون کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے اُسے پریشان کر دیا۔ وقار اس کے والد کی وفات پر امی سے تعزیت کر رہا تھا۔

''بس خالہ جان پلیز...... اگر آپ روئیں گی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔'' اس نے امی کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں وقار، اب تم کہیں جانے کی بات نہ کرنا سمجھے!'' یہ کہہ کر حمیدہ خاتون نے اُسے قریب ہی پڑی کرسی پر بٹھا دیا، پھر بہ آواز بلند بولیں۔

''ارم...... صدف! ادھر آؤ! وقار ہے، تمہاری ثمینہ خالہ کا بیٹا!''

''اوہ...... آپ...... آپ ہیں وقار......'' ارم نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سچ ہمیں تو بڑی تمنا تھی آپ سے ملنے کی۔ مجھے تو ثمینہ خالہ بھی یاد نہیں کہ کیسی تھیں! میں بہت چھوٹی تھی جب میں نے انہیں دیکھا تھا۔ بس ایک خاکہ سا ہے میرے ذہن میں۔'' ارم بولتی چلی گئی۔

وقار اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی ارم کو یہ احساس ہوا تو وہ جھینپ گئی۔

''امی! مجھے آپ لوگوں کے بارے میں بتاتی رہتی تھیں۔'' وقار نے مسکرا کر کہا۔ پھر ارم کی امی سے مخاطب ہوا۔

''خالہ جان' امی آپ کی بیٹی ارم سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ارم ان میں سے کون ہے؟'' وقار نے دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے صدف کہتے ہیں اور شاید ثمینہ خالہ کو مجھ سے بالکل محبت نہیں تھی۔'' صدف نے منہ بنا کر اپنا تعارف کرایا۔

''پگلی! تم اُس وقت اس دنیا میں موجود نہیں تھیں۔'' امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

صدف خوش ہوگئی۔ ''اچھا...... اچھا تو یوں کہیے نا' میں ہوتی تو وہ مجھ سے محبت کرتیں۔''

''تو گویا آپ ارم ہیں۔'' وقار نے سر سے پیر تک ارم کو اتنی گہری نظروں سے دیکھا کہ اس کا وہاں کھڑا رہنا محال ہوگیا۔

''امی میں چائے لاؤں؟'' ارم نے فوراً اپنا رخ ماں کی طرف کر لیا۔

''نہیں، تم لوگ بیٹھو میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔'' حمیدہ خاتون یہ کہہ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

پھر حمیدہ خاتون نے وقار کو کہیں نہیں جانے دیا۔ ایک ہفتے وقار وہیں رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ اب مستقل پاکستان آ گیا ہے۔

ثمینہ خالہ شادی کے فوراً بعد لندن چلی گئی تھیں۔ ان کے شوہر انوار الحسن پاکستان ایمبیسی میں ملازم تھے۔ شادی کے بعد وہ صرف ایک دفعہ پاکستان آئی تھیں۔ اس وقت ارم بہت چھوٹی تھی۔ ان کا بیٹا وقار شاید پانچ یا چھ سال کا تھا۔ تین مہینے پاکستان میں رہنے کے بعد وہ واپس لندن چلی گئیں۔ انہیں گئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ ان کی موت کی اطلاع آ گئی۔ وہ لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ایک صبح کلینک جاتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ چکی تھیں۔

اس اطلاع نے سارے خاندان میں کہرام برپا کر دیا۔ احتشام علی کی دو ہی بیٹیاں تھیں، بڑی بیٹی حمیدہ خاتون اور چھوٹی ثمینہ خاتون! حمیدہ خاتون اپنی بہن سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کی بیٹی ارم اس وقت سال بھر کی تھی۔ ثمینہ کی موت کے بعد انہوں نے بہنوئی کو بہت خط لکھے کہ وہ وقار کو ان کے پاس بھیج دیں مگر انہوں نے اس سلسلے میں معذرت کر لی۔ وہ ثمینہ سے بے حد محبت کرتے تھے اور ثمینہ کے بعد اب بیٹے سے جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے وقار کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنا دیا۔

وقت سارے زخم بھر دیتا ہے۔ سو ثمینہ کی موت کا زخم بھی بھر گیا۔ اب اتنے عرصے بعد حمیدہ خاتون نے وقار کو دیکھا تو بھلا کیسے جانے دیتیں۔ وقار نے ایک ہفتے ہی کے دوران ایک بڑا سا بنگلا خرید لیا تھا۔ وہ یہاں اپنا اسپتال بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ چند ہی مہینوں میں اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا دیا اور خود بھی اسی بنگلے کے ایک پورشن میں رہنے لگا۔

وہ جب بھی ارم کے گھر آتا تو اسے ایسی نگاہوں سے دیکھتا کہ ارم پسینے پسینے ہو جاتی اور ذرا دیر بھی اس کے قریب نہ بیٹھ پاتی۔ اس کی نگاہوں میں پسندیدگی دیکھ کر ارم کا دل کانپ جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ امی کو اس کے لیے اگر دنیا میں کوئی پسند تھا تو وہ وقار تھا۔

پھر وہی ہوا! بھی ارم اپنے کمرے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ حمیدہ خاتون دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہو گئیں۔ ارم کا ماتھا ٹھنک گیا۔ ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب انہیں کوئی اہم بات کرنا باقی تھی۔

''آیئے! کوئی کام تھا تو مجھے بلوا لیتیں۔'' اس نے کتاب رکھتے ہوئے کہا۔

''بہت دن ہو گئے تمہارے کمرے میں آئے ہوئے۔'' وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولیں اور اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''ارم! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے پاپا کے بعد تم دونوں صرف میری ذمے داری بن گئی ہو۔ اس سلسلے میں میری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔''

''جی امی!'' ارم نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

''وقار کے بارے میں تمہیں کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم خود بھی اس عرصے میں اُسے جان گئی ہو گی۔ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ اس کا بھی تمہیں احساس ہو گا۔ میرے خیال میں تمہارے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا نہیں ہے۔'' حمیدہ خاتون نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اُن کا انداز فیصلہ کن تھا۔

ارم کو اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ نگاہیں جھکائے، آنسوؤں کو پلکوں پر روکے خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی اور حمیدہ خاتون اسے خاموش دیکھ کر دھیرے سے مسکراتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ طاہر کے چلے جانے اور وقار کے قریب آ جانے سے سارے منظر بدل گئے ہیں، مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ ارم کی نگاہوں میں کون سا منظر ٹھہرا ہے جو اس کے وجود پر چھایا ہوا ہے۔ جس کے رنگ اتنے گہرے ہیں کہ کوئی بھی دوسرا منظر انہیں دھندلا نہیں سکتا۔

وہ بات کر کے گئیں تو ارم نڈھال سی بیڈ پر گر گئی۔ اُسے چاروں طرف طاہر کی نگاہوں کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ قطرہ قطرہ اندر سے پگھل رہی ہو۔ ارم نے اُس لمحے کو قریب آتے محسوس کیا جو ایک وجود کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

بات شاید صدف تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ چند لمحوں بعد ہی چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل

ہوئی۔ ارم اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ صدف نے آگے بڑھ کر اپنے دوپٹے کے پلو سے ارم کی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھے تو اُسے احساس ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔

''باجی! چائے پی لو۔''

ارم نے خاموشی سے چائے کی پیالی صدف کے ہاتھ سے لے لی۔

''باہر چاند پورا ہے باجی! مگر تمہارے کمرے میں اس کی ایک کرن بھی نہیں پہنچی! یہ کھڑکی کھول دو۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔''

''نہیں صدف! پلیز...... کھڑکی نہ کھولنا۔ یہاں سے نظر آنے والا ہر منظر خالی ہے، یہاں کوئی چاند نہیں، کوئی کرن نہیں! یہ کھڑکی کھل گئی تو کچھ اور اندھیرے در آئیں گے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

صدف اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ارم کے لیے رحم تھا، دکھ تھا۔ ''باجی! میں تمہارے لیے کچھ کرسکی تو ضرور کروں گی۔''

صدف کے لہجے میں عزم محسوس کرتے ہی ارم چونک اٹھی۔

''صدف! امی سے کچھ نہ کہنا! میں انہیں دکھی نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''میں ان سے کچھ نہیں کہوں گی۔'' صدف نے دھیرے سے کہا اور مضبوط قدموں سے باہر چلی گئی۔

وہ رات جانے کیسی بیتی! ارم کو احساس تک نہ ہوسکا کہ وقت کب گزر گیا۔ اس کی کھڑکیوں پر پڑے پردوں میں رچا ہوا اندھیرا دھیرے دھیرے پگھل کر بہہ گیا تب اُسے صبح کا احساس ہوا۔ تمام رات وہ کھلی آنکھوں سے ماضی کے بند دریچے کو تکتی رہی تھی۔ اُس نے اٹھ کر چہرے پر پڑی آنسوؤں کی لکیروں کو دیکھا اور انہیں مٹانے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ چہرے پر ٹھنڈا پانی پڑا تو آنکھوں میں سوئیاں سی چبھ گئیں اور ڈھیروں آنسو بہہ گئے۔ جانے کیسا سیلاب تھا جو اس کی آنکھوں میں ٹوٹ جانے والے خوابوں کی کرچیاں تک بہالے گیا تھا۔

معاً دروازے پر ہونے والی دستک نے اُسے چونکا دیا۔ ''کون؟ اندر آجاؤ! دروازہ کھلا ہے۔''

دوسرے ہی لمحے اپنے سامنے وقار کو دیکھ کر وہ حیران ہوگئی۔ وقار پہلی مرتبہ اس کے کمرے میں آیا تھا۔

''آپ کو شاید توقع نہیں تھی کہ دروازے پر میں ہوں گا۔'' وقار اس کی حیرانی سے محظوظ ہوکر بولا۔

''جی! کبھی ایسا ہوا نہیں نا اس لیے۔'' وہ بوکھلا گئی۔

''آیئے بیٹھیے!''

وہ بیٹھ گیا تو ارم بھی اس سے کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وقار نے اس کے کمرے کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''خوب صورت ذوق ہے آپ کا! آپ نے بہت کم چیزوں کو بہت سلیقے سے رکھا ہے۔''

''شکریہ!''

''ارم! میں نے سنا ہے کہ خالہ جان نے آپ سے کل کچھ باتیں کی تھیں، مجھ سے متعلق!''

''تو کیا آپ نے ان سے......''

''ہاں...... میری یہی خواہش تھی۔'' وقار نے ارم کی بات کاٹ کر کہا۔

''مگر اُس وقت مجھے آپ کے احساسات کا علم نہیں تھا۔ میں آپ کی خواہش کو زیادہ مقدم سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو محبوب کے علاوہ اس کے اردگرد پھیلی چیزوں اور حالات سے بھی محبت سکھاتا ہے۔ کم ازکم میں ایسی ہی محبت کا قائل ہوں۔ آج میں آپ کے اور طاہر کے درمیان کھڑی دیواریں گرانے کا مصمم ارادہ کرکے آیا ہوں۔ صدف میرے ساتھ ہے۔'' وہ چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

''میں خالہ جان کے پاس جارہا ہوں دعا کیجیے کہ آپ کے لیے کچھ لے کر آؤں۔'' وقار یہ کہہ کر کھڑا ہوا تو لڑکھڑا سا گیا۔

''تھینک یو...... آپ...... وقار......'' وہ کوشش کے باوجود اپنی بات پوری نہ کرسکی۔

وقار اسے دیکھ کر مسکرایا تو ارم کو ایسا لگا جیسے یہ مسکراہٹ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہے۔ وہ لمحہ بھر کو سُن ہوگئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی خودغرض

ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ وقار کو روک لے، مگر وقار کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ وہ بیڈ پر گر گئی اور سوچنے لگی کہ مجھے کم از کم وقار سے یہ کام نہیں لینا چاہیے تھا۔

شام تک وہ کمرے میں بند لیٹی اپنے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کے تھپیڑے برداشت کرتی رہی۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ باہر آ کر حالات کا مسخ ہوتا چہرہ دیکھ سکے۔ اُسے معلوم تھا کہ حمیدہ خاتون اتنی آسانی سے شکست ماننے والوں میں سے نہیں، مگر جب صدف مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو ارم کو اپنی بصارت پر یقین سا نہ آیا۔

''صدف! کیا سچ...... کیا امی......'' خوشی اور بے یقینی سے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے صدف کے ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیے۔

''جی باجی!'' صدف نے مسکرا کر جواب دیا۔

اسی لمحے ارم نے بڑھ کر اپنے کمرے کی پچھلی کھڑکی کھول دی۔ فرحت بخش ہوا کا جھونکا اس کے وجود سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں میں کیف سا بھر گیا۔ اس نے کھڑکی سے نظر آنے والے طاہر کے گھر کی طرف دیکھا۔ جہاں اس وقت طاہر تو نہیں تھا مگر اس کے سارے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

''کتنی عجیب بات ہے باجی کہ یہاں ایک کا ارمان اور دوسرے کے ارمان کا خون پی کر جوان ہوتا ہے۔'' صدف نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو چھن سے کوئی چیز ٹوٹ کر اُس کے دل میں چبھ گئی۔ وہ تڑپ کر پلٹی مگر صدف جا چکی تھی۔

اسی لمحے اس نے باہر سے وقار کی آواز آتی سنی۔

''صدف! ارم سے کہنا، یہ سب کچھ میں نے نہیں کیا، اس کی چاہت کی گہرائی نے کیا ہے۔ خوش قسمت ہے طاہر جسے ایسی چاہت نصیب ہے۔''

وقار کا کہا ہوا ایک ایک لفظ خنجر کی طرح ارم کے دل میں پیوست ہو گیا۔ اس کے دل میں وقار کا تقدس بڑھ گیا۔

وقار نے اس کی راہوں کے تمام کانٹے چُن لیے تھے۔ سارے کام ایسی آسانی سے ہو گئے کہ وہ خود حیران رہ گئی۔ حمیدہ خاتون سے جانے کیا کہہ دیا وقار نے کہ ان کے تمام نظریے، تمام اصول اور تمام خیالات تبدیل ہو گئے۔ کائنات کے سارے رنگ ارم کے گھر کونے کونے میں بکھر گئے۔ تین مہینے میں تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

طاہر تین ماہ کا کورس مکمل کرنے کے بعد گھر آیا تو خوشیاں اس کا استقبال کرنے کو تیار تھیں۔ وقار نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو اس کی آنکھوں کی نمی دیکھنے والا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

رنگوں اور روشنیوں نے جیسے ارم کے وجود کو گھر کر لیا تھا۔ ساری رسمیں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ اس پوری تقریب کو وقار نے ترتیب دیا تھا، مگر ارم طاہر کی محبت میں اسے فراموش کر بیٹھی۔ تین چار دن کے ان ہنگاموں میں وقار اسے نظر بھی نہ آیا۔ وہ اس سے دور دور ہی رہا۔

طاہر کی بہنوں نے ارم کو گلابی عروسی سوٹ پہنایا تھا۔ وہ ارم کو سجا کر ہٹی ہی تھیں کہ طاہر، وقار کو لیے کمرے میں داخل ہوا۔

ارم سمٹ کر رہ گئی۔

''وقار بھائی! آپ بیٹھیے میں دوسرے مہمانوں سے نمٹ کر ابھی آیا۔'' طاہر نے وقار کو ارم کے قریب بٹھا کر کہا اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اُسے خوشیاں دینے والا وقار ہے۔ اس کے دل میں وقار کے لیے بے انتہا احترام تھا۔

ارم ہلکا سا گھونگٹ نکالے، نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ وقار کی گہری نگاہیں اس کے چہرے کا احاطہ کیے کیے سلگ اٹھیں۔ حسن کے تمام رنگ ارم کے چہرے اور اس کے وجود میں سما گئے تھے۔

''ارم! یہ چھوٹا سا تحفہ ہے تمہارے لیے۔'' وقار نے مخملی ڈبیا کھولتے ہوئے کہا۔

ارم نے جھکی جھکی نگاہوں سے دیکھا۔ ہیرے کا لاکٹ سرخ مخملی ڈبیا میں چمک رہا تھا۔ لمحہ بھر کو اس نے پلکیں اُٹھا کر وقار کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں پھیلی ویرانی اور حسرت اسے لرزا گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ وقار کے مضبوط ہاتھوں کو عقیدت سے بوسہ دے کر

کہے کہ آپ نے مجھے ایسا تحفہ دیا ہے جو کائنات کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ نے اپنے ارمانوں کا خون کر کے میرے ارمانوں کو سینچا ہے۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور وقار لڑکھڑاتے قدموں سے باہر چلا گیا۔ ارم نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا کر سسک اٹھی۔

طاہر نے تین ماہ کی چھٹی لے لی تھی۔ وہ یہ تین ماہ ارم کے ساتھ گھومنے پھرنے میں گزارنا چاہتا تھا۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی وہ لوگ مری چلے گئے۔ وہ دن ارم کی زندگی کے یادگار دن تھے۔ مری، کاغان، ایبٹ آباد اور سوات کی وادیوں میں وہ طاہر کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے دنیا کی فکروں سے آزاد گھومتی رہی۔ مری میں جب بادل انہیں چھو کر گزرتے تو ان کی نمی دل میں محسوس ہوتی۔ سوات کے پہاڑوں سے گرنے والے آبشار ان کے اندر جلترنگ بکھیر دیتے۔ آسمانوں کی نیلاہٹوں کو چھونے والے اونچے اونچے درخت انہیں وقار کی عظمت یاد دلاتے تو طاہر گھنٹوں وقار کے بارے میں باتیں کرتا رہتا۔ ایسے میں ارم کو اس کی آنکھوں کی ویرانی یاد آ جاتی تو وہ فوراً بات بدل دیتی، اس طرح کہ طاہر کو احساس تک نہ ہوتا۔

تین ماہ بعد جب وہ واپس آئے تو طاہر کی کمپنی سے ٹیلیگرام آیا ہوا تھا۔ اسے فوراً ڈیوٹی جوائن کرنا تھی۔ ارم کو طاہر کی جدائی کے احساس نے اداس کر دیا۔ وہ طاہر کی قربت پا کر بھول گئی تھی کہ جدائی کے گھاؤ کیسا دکھ دیتے ہیں۔ اس نے طاہر سے خواہش ظاہر کی کہ آپ یہیں کوئی جاب کر لیں۔

''ارم! ہمارے درمیان کوئی دیوار نہیں، بس یہ چھوٹی چھوٹی سی جدائیاں ہیں۔ یہ بھی نہ رہیں تو قربت کی لذت ختم ہو جائے گی۔ یہی جدائیاں تو ملنے کی تڑپ پیدا کریں گی۔ تم مجھے یاد کرنا، میں تمہیں یاد کیا کروں گا۔'' طاہر نے اسے پیار سے سمجھایا۔

جس دن طاہر کو جانا تھا، اس سے پہلی رات وہ جاگتے رہے۔ چودھویں کی رات تھی۔ وہ دونوں لان میں کرسیاں ڈالے ایک دوسرے کو بھیگی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ چاند کی نرم کرنیں مدھم ہوتے ہوتے ملگجے سویرے میں تبدیل ہو گئیں۔ اس رات کا اختتام ان دونوں کے درمیان ایک ان دیکھی سی لکیر کھینچ گیا۔ ارم کو صبح کے لطیف جھونکے بڑے سفاک سے لگے۔

خوشی لمحوں میں اور غم صدیوں میں پھیلے ہوتے ہیں۔ طاہر چلا گیا تو ایک ایک دن جیسے ایک برس کا ہو گیا۔ ارم سارا دن بولائی بولائی پھرتی رہی۔ اس کے لیے سارے منظر ویران ہو گئے، سارے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بڑھی تو حمیدہ خاتون اسے گھر لے آئیں۔

......☆☆☆......

صدف اور وقار نے اس کی دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، وقار تو اس کے چہرے کی وحشت دیکھ کر اپنا دکھ بھول گیا۔ وہ سارا دن اس سے طاہر کی باتیں کرتا۔ طاہر کے ذکر پر ارم کی اداسی کچھ کم ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں دیے سے جل اٹھتے اور وہ سب کچھ بھول کر طاہر کی باتیں کرنے لگتی۔

دن یونہی گزرتے گئے۔ رفتہ رفتہ ارم کی بے قراریاں کم ہو گئیں۔ جب اس کی طبیعت خراب ہوئی اور ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اسے مبارک باد دی تو جیسے خوشیاں پلٹ کر پھر اس کے وجود میں سما گئیں۔ اب وہ سارا دن طاہر اور اس کی محبت کی نشانی کے حسین خیالات میں گم رہتی۔

یوں تو طاہر نے تین ماہ بعد آنے کو کہا تھا مگر جب اس کا ٹیلیگرام آیا تو اس میں ہزاروں مجبوریاں لکھی تھیں اور یہ کہ وہ چھ ماہ بعد آ سکے گا۔ ارم جو گن گن کر دن گزار رہی تھی، اداس ہو گئی، مگر وقت اور آنے والے ننھے مہمان کی خوشی نے اسے سہارا لیا۔

وقار اپنے اسپتال کی وجہ سے مصروف ہو گیا۔ کچھ اس نے ویسے ہی آنا جانا بند کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ارم اس کے بارے میں کوئی ایسی بات سوچے جو اس کی عزت و مرتبے کو کم کر دے۔ ارم روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اسی دوران میں صدف کے لیے ایک رشتہ آ گیا۔ لڑکا بہت اچھا تھا اور ایک 'معزز خاندان' سے تعلق رکھتا تھا۔ صدف اس رشتے سے خوش تھی اس لیے فوراً ہی منگنی کر دی گئی۔

وقار منگنی کی تقریب میں شریک تھا بلکہ تمام انتظامات سنبھالے ہوئے تھا۔ وقار کی موجودگی نے حمیدہ خاتون کو بیٹے کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ منگنی کے روز ارم نے فیروزی رنگ کی ساری باندھی ہوئی تھی اور اس سے بے خبر تھی کہ یہ وقار کا پسندیدہ رنگ تھا۔ اس روز وقار کے اندر ایسے طوفان سے اٹھے کہ وہ برداشت نہ کرسکا۔

اس تمام عرصے میں پہلی مرتبہ اس کی پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھک گئیں۔ اسے اپنے تہی دامن ہونے کا پہلی بار احساس ہوا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ اب وہ ارم سے متعلق ہر جذبے پر قابو پاچکا ہے۔

اس روز اُسے احساس ہوا کہ تمام جذبے پہلے روز کی طرح زندہ اور شدید ہیں۔ اس نے دل میں عہد کرلیا کہ وہ اب کم سے کم یہاں آئے گا۔ کم آنے سے شاید وہ اپنے آپ پر قابو پاسکے۔

صدف کی منگنی کے بعد اکثر وہ مصروفیت کا بہانہ کرکے کئی کئی روز غائب رہتا۔ حمیدہ خاتون بے قرار ہوکر اسے کال کرتیں تو وہ معذرت کرلیتا اور موبائل پر ان سے گھنٹوں باتیں کرتا کہ ان کی تسلی ہوجائے۔

☆......☆......☆

طاہر کو گئے پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ اس دوران میں اُس نے کئی خط لکھنے کے علاوہ ایک مرتبہ ارم سے فون پر بھی بات کی تھی۔ حمیدہ خاتون اور خود اس کے گھر والے اسے مطلع کرچکے تھے کہ وہ جلد ہی باپ بننے والا ہے۔ تبھی اس نے ارم سے فون پر کہا تھا۔

''ارم دیکھو میں نے ہمیشہ یہی سنا ہے کہ عورت ماں بن کر اپنے شوہر کو بھول جاتی ہے۔ پلیز! میں اپنے بچے کو بھی اپنے اور تمہارے درمیان دیوار بنتے نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ! بے وقوف ہیں وہ لوگ جو بچوں کو دیوار سمجھتے ہیں۔ یہ بچہ تو میرے اور آپ کے پیار کی مہک ہے۔''

طاہر ہنس پڑا۔ ''ارے تم سنجیدہ ہوگئیں! پگلی میں تو مذاق کررہا تھا۔ اچھا سنو! خوش رہا کرو۔ میرے بچے کے لیے! میں کوشش کررہا ہوں کہ مجھے زیادہ دن کی چھٹی مل سکے تاکہ میں اپنے بچے کو دیکھ سکوں، اُسے اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار کرسکوں۔'' طاہر نے ارم کو تسلیاں دیں اور پھر دونوں کے درمیان رابطہ منقطع ہوگیا۔

لائن بے جان ہوئی تو ارم کو یوں لگا۔ جیسے اچانک سب کچھ کھوگیا ہے۔ جیسے طاہر سے اس کا ہر رابطہ ختم ہوگیا ہے۔ جیسے ساری لائنیں بے جان ہوئی ہیں۔ کتنے ہی لمحے وہ کورے ذہن کو لیے بُت بنی بیٹھی رہی۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ ٹیلی فون پر بات ہونے کے تین دن بعد انہیں اطلاع ملی کہ اُس جہاز میں آگ لگ گئی۔ ٹیلیگرام خود ارم نے ریسیو کیا تھا جو کمپنی کی جانب سے تھا۔ وہ یہ اطلاع پڑھتے ہی چکرا کر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ ایک قیامت سی اٹھی جس نے ارم کی ساری کائنات روئی کے گالوں کی طرح فضاؤں میں بکھیر دی۔

ان کے ملن آخری رات کے اختتام پر ہواؤں کے لطیف جھونکوں میں چھپی سفاکیاں اس کی پوری زندگی پر چھا گئیں۔ وہ ان دیکھی سی لکیر، عدم اور وجود کے درمیان کی مضبوط، مگر نہ نظر آنے والی دیوار بن کر اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی گئی۔ ارم پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ اطلاع کے مطابق جہاز پر موجود عملے اور دوسرے لوگوں میں کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا تھا جو آگ سے بچے، وہ سمندر کی خوں خوار لہروں کی نذر ہوگئے۔

وقار پھر ایک مضبوط سہارے کی طرح ارم کے قریب موجود تھا۔ ارم کی حالت بہت خراب تھی۔ وقار نے فوراً ہی اسے اپنے اسپتال میں داخل کرلیا اور دن رات اس کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ حمیدہ خاتون جوان بچی کی بیوگی کا دکھ جانے کیسے سہار گئیں۔ ارم کی بگڑتی ہوئی حالت نے شاید انہیں گرنے سے روک دیا۔

وقار کی دن رات کی محنت نے ارم کو بچالیا۔ اس محنت میں وقار کا وہ جھوٹ بھی شامل تھا جو اس نے ارم سے بولا تھا۔

اسی کے کہنے پر حمیدہ خاتون اور صدف نے بھی وہی جھوٹ بولا تھا کہ طاہر زندہ ہے اور کسی دوسرے ملک میں زیر علاج ہے، جلد ہی ٹھیک ہوکر واپس

آ جائے گا۔ وقار نے تو یہ تک کہا تھا کہ وہ خود طاہر سے مل آیا ہے۔ وہ زخمی ہے۔ ارم کیونکہ کئی دن بے خبری کے عالم میں پڑی رہی تھی اس لیے اسے معلوم نہ تھا کہ وقار تو لمحہ بھر بھی اُس سے جدا نہیں ہوا۔ بہرحال اس نے اسے زندگی بخش دی کہ طاہر واپس آ جائے گا۔

''طاہر آ جائے گا نا؟'' وہ دن میں کئی مرتبہ وقار سے پوچھتی۔

''کیوں نہیں ارم! کیوں نہیں آئے گا۔ لیکن دیکھو، اپنے آپ کو سنبھالو، تمہیں اپنی اور آنے والے کی زندگی کو طاہر کے لیے سنبھال کر رکھنا ہے۔'' وہ آنسوؤں کو پلکوں ہی پر روک کر مسکراتے ہوئے کہتا تو صدف جلدی سے کمرے سے باہر چلی جاتی۔

حمیدہ خاتون منہ پھیر کر رو دیتیں۔ ان سے بیٹی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔

وقار کمرے سے باہر آتا تو دیوار سے لگی صدف کے آنسو پونچھ کر کہتا۔ ''صدف! جاؤ ارم کو تسلی دو۔ اسے یقین دلاؤ کہ طاہر زندہ ہے۔'' ایسے کہتے وقت اسے اپنے ان آنسوؤں کا احساس بھی نہ ہوتا جو ڈھیر سے اس کی پلکوں پر آ کر ٹک جاتے تھے۔

''وقار بھائی! جانے کیسے ہیں آپ، کیسے مسکراتے ہیں اُن کے سامنے؟ کیسے تسلی دیتے ہیں؟ میں نے اتنے مضبوط اعصاب کے لوگ نہیں دیکھے، آپ نے پہلے بھی......''

''جاؤ صدف پلیز تمہاری تسلی کے دو لفظ اُسے قرار دے دیں گے۔'' وقار نے صدف کی بات کاٹ کر کہا۔ صدف روتی ہوئی آگے بڑھی تو وقار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے روک لیا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟ آنسو تو صاف کر لو۔''

''میں ان کے دُکھ پہ نہیں، آپ کے دکھ پر رو رہی ہوں وقار بھائی! آپ کے دکھ پر تو میں ان کے سامنے بھی رو سکتی ہوں۔''

''نہیں صدف، تم ایسا نہیں کرو گی پلیز۔'' وقار نے صدف کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے ہیں۔ ''میں ارم کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں صدف، اتنا ہی زندہ جتنی وہ میرے دل میں ہے۔''

صدف آنسو پونچھ کر کمرے میں چلی گئی تو وقار نیم تاریک ایک سے گوشے میں جا کر رو دیا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، ارم کی حالت بہتر ہوتی گئی۔ آج ہی کل میں ننھے مہمان کی آمد متوقع تھی اس لیے وقار نے اسے گھر جانے کی اجازت نہیں دی۔

ارم نے پیاری سی ایک بیٹی کو جنم دیا۔ بیٹی کو دیکھ کر ارم کے چہرے کی زردی کم ہوئی۔ اس کی آنکھیں ممتا کے پیار کی ہزاروں قندیلوں سی روشن ہو گئیں۔ اب جب بھی وہ طاہر کے متعلق پوچھتی، وقار اسے طاہر کی حالت کے بارے میں جہاں تسلی دیتا، وہیں ایک آدھ جملہ ایسا ضرور کہتا جس میں بسی مایوسی لمحہ بھر کے لیے ارم کو وحشت زدہ کر دیتی۔ ایسے میں وقار فوراً اس کی توجہ بیٹی کی طرف مبذول کرا دیتا جس کا نام وقار نے تانیا رکھا تھا۔ تانیا نام ارم کو بھی پسند آیا تھا۔

وقار چاہتا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ارم کو طاہر کی موت کی اطلاع دے۔ ارم اب ویسے بھی کافی بہتر تھی اور اب اس کی تمام تر توجہ کا مرکز تانیا تھی۔

جس روز ارم ننھی تانیا کو لیے گھر واپس آئی تو کمرے میں سجے چھوٹے سے کوٹ اور اس پر لگے جھنجھنے کو دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اس کوٹ کی درازیں کھلونوں اور چھوٹے چھوٹے رنگین کپڑوں سے بھری ہوئی تھیں۔

''باجی! یہ سب کچھ وقار بھائی نے تانیا کو تحفے میں دیا ہے۔'' صدف نے ارم کو بتایا تو ایک بار پھر وقار کی عظمت کی قائل ہو گئی۔ پھر بیماری کے دوران میں وقار کی تیمارداری نے اُسے ممنون احساس کر دیا تھا۔ وہ جب بھی تنہائی میں وقار کے متعلق سوچتی تو عقیدت سے اس کا سر جھک جاتا۔

☆......☆......☆

تانیا تین ماہ کی ہو چکی تھی۔ ارم اب بھی طاہر کی منتظر تھی۔ آج اُسے طاہر بے طرح یاد آ رہا تھا۔ خبر نہیں وہ کب آئے گا۔ یہ خیال اُسے پریشان کرتا رہتا تھا۔ آج وہ برداشت نہ کر سکی تو اس نے وقار کو فون کیا اور اس سے پوچھا کہ طاہر کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اُسے میری ضرورت ہو گی۔ تب وقار

نے اس سے کہا کہ میں شام کو آؤں گا تو بتاؤں گا۔

ارم شام کا انتظار کرتی رہی۔ شام کو وقار آیا تو وہ بہت بے قرار تھی۔

''میں طاہر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ میں تانیا کو لے کر اس کے پاس جاؤں گی۔ وہ تانیا کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔'' وقار کے آتے ہی وہ بولتی چلی گئی۔ آج اُسے وقار کی گہری نگاہوں نے بھی متاثر نہ کیا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہی۔

''دیکھو ارم تمہارا وہاں جانا بیکار ہے۔''

''کیوں؟ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ چیخ اٹھی۔

''ارم! اس کی حالت تشویش ناک ہے۔''

''پھر تو اُسے میری بہت ضرورت ہوگی۔ پلیز وقار آپ نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں، یہ احسان بھی کر دیجیے۔ مجھے طاہر کے پاس لے چلیں پلیز!'' ارم اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو دی۔

''ارم! انسان جب سارے زمانے کی خوشیاں سمیٹ سکتا ہے تو اس میں غم اٹھانے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے میرا خیال تھا کہ تم میں اتنا ظرف ہے۔ یہ جدائیاں...... یہ قربتیں...... کس کے لیے ہوتی ہیں؟ ہم انسانوں ہی کے لیے تو پھر واویلا کیسا؟ تانیا کو تمہاری ضرورت ہے اپنی تمام توجہ اور تمام پیار اسے دے دو۔''

''آپ...... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا تانیا کے سوا میری توجہ اور پیار کا حقدار اب کوئی نہیں رہا؟ خدا کے واسطے وقار مجھے بتا دیں...... بتا دیں مجھے...... سب کچھ...... کیا...... کیا طاہر......''

''ہاں بیٹی!'' حمیدہ خاتون نے جواب دیا۔ وہ نہ جانے کس وقت چپکے سے وہاں آ گئی تھیں۔ ارم ان کی آواز سن کر تڑپ اٹھی۔

''نہیں امی نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے امی! طاہر تو میرے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ میرے بغیر مر کیسے گیا؟'' وہ حمیدہ خاتون کے سینے سے لگ کر سسک اٹھی۔

''رو لے ارم جی بھر کے رو لے! ہم بھی اپنے آنسوؤں کو سینے میں جمع کر کر کے تھک گئے ہیں۔ آج ہم بھی کھل کر رو سکیں گے۔'' حمیدہ خاتون کی آواز بھی سسکیوں میں تبدیل ہوگئی۔

صدف اور وقار بھی بلک اٹھے۔ آنسوؤں کے سیلاب امنڈے تو یوں لگا جیسے اس چار دیواری کی بنیادیں تک بہا لے جائیں گے۔

ارم کی سسکیاں دبی دبی چیخوں میں تبدیل ہوگئیں تو وہ نڈھال نڈھال سے لہجے میں کہنے لگی۔ ''امی! امی خوشیاں میرے پاس رُکتی کیوں نہیں؟ ایک خوشی ملتی ہے تو دوسری چھین لی جاتی ہے۔ ایک میں ہی حوادث کی آندھیوں کی زد پر کیوں ہوں؟''

''تم بھول رہی ہو ارم...... یہاں ہر کوئی ان زرد آندھیوں کی زد پر ہے، میں، میرے پاپا، تم، خالہ جان ہم سبھی! ہم بہ ظاہر مضبوط اور مطمئن نظر آنے والے لوگ اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ایک ذرا وسعت نظر چاہیے۔ پھر تمہیں اپنے غم ہلکے لگیں گے۔'' وقار نے کوٹ میں سے ننھی تانیا کو اٹھا کر ارم کی گود میں ڈال دیا۔ ''تانیا کو غموں سے بچانے کے لیے تمہیں اس کے اور دکھوں کے درمیان ایک مضبوط دیوار بن کر کھڑے رہنا ہے ارم! اٹھو پلیز! تانیا کے لیے...... خالہ جان کے لیے...... صدف کے لیے اور......''

ارم نے تانیا کو گلے سے لگا لیا۔ وہ کتنی ہی دیر اُس کے معصوم چہرے کو دیکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد اُس نے چہرہ اٹھایا۔ زخمی نگاہوں سے سب کو دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ دلوں میں شیشے کی کرچیاں بن کر چبھ گئی۔

ارم نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ اس روز کے بعد وہ صرف ایک مرتبہ روئی، اس وقت جب طاہر کی بہن لاہور سے آئی اور اس سے ملی۔ اس بہن کے سوا طاہر کا اور کوئی تھا بھی نہیں۔ رخشندہ کتنی ہی دیر تانیا کو سینے سے لگائے روتی رہی۔

''بھابی! کتنی مشکل سے حاصل ہونے والی خوشیاں تم سے کتنی آسانی کے ساتھ چھن گئیں۔''

''رخشی! اگر تانیا نہ ہوتی تو شاید میں اب تک طاہر

کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ میں اپنے آدھے وجود کے ساتھ زندہ ہوں رخشی!" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھابی! ایسی باتیں نہ کرو، تمہیں تانیا کے لیے زندہ رہنا ہی چاہیے۔" اس نے تانیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو سر موڑے ماں کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ رخشندہ پھر بول اٹھی۔

"آنسو پونچھ لو بھابی۔"

ارم نے واقعی آنسو پونچھ لیے ہمیشہ کے لیے، اس نے دل میں کبھی نہ رونے کا عہد کرلیا۔

پھر تانیا کی معصوم حرکتوں نے جیسے ارم کے سارے دکھ بھلا دیے۔ وہ سارا سارا دن اس سے جانے کیا کیا باتیں کرتی رہتی۔ معصوم تانیا اگر کبھی مسکرا دیتی تو اُسے یوں لگتا جیسے وہ اس کی ساری باتیں سمجھ رہی ہو۔ اس کی معصوم مسکراہٹیں ارم کو دھیرے دھیرے زندگی کی طرف لوٹا رہی تھیں۔

☆☆☆

صدف کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تو گھر میں رنگ ونور کی برأت سی اُتر آئی۔ وقار حسب سابق ناظم اعلیٰ بنا ہوا تھا۔ ننھی تانیا جو اب ایک سال کی ہوگئی تھی، اپنی حیران نگاہوں سے یہ سارے ہنگامے دیکھ رہی تھی۔ وہ وقار سے بہت مانوس تھی۔ وقار جب بھی آتا اسے گھنٹوں گود میں لیے بیٹھا رہتا تھا۔ آج بھی جیسے ہی وقار ارم کے پاس سے گزرا تانیا نے اسے جاتے دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ وقار ٹھٹک کر رُک گیا۔ وہ پلٹا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ تانیا ہمک کر اس کی گود میں چلی گئی۔

ارم جانے کیوں شرمندہ سی ہوگئی۔ "یہ...... یہ آپ سے بہت مانوس ہوگئی ہے، آپ کو بہت پریشان کرتی ہے۔"

"میرے لیے یہ احساس ہی میری زندگی ہے کہ تم نہ سہی، تانیا تو مجھ سے مانوس ہے جو میرے لیے روتی ہے اور میرے پاس آ کر خوش ہو جاتی ہے۔" وقار نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ارم سارے وجود سے لرز گئی۔ وقار نے بہت عرصے بعد ایسی بات کہہ دی تھی جسے وہ فراموش کر بیٹھی تھی۔ وہ خود تو چلا گیا مگر ارم زیادہ دیر مہمانوں کے درمیان نہ رہ سکی اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صدف گھر سے رخصت ہوئی تو اس کی تنہائی کچھ اور بڑھ گئی۔ حمیدہ خاتون زیادہ تر اپنے کمرے میں نمازوں اور وظیفوں میں مصروف رہتیں۔ ارم تانیا کے ننھے ننھے ہاتھ پکڑے اسے پیروں چلاتی رہتی، اس کی معصوم حرکتوں پر خوش ہوتی، اس کے چھوٹے موٹے کام کر کے اپنے آپ کو مصروف رکھتی، مگر جب تانیا سو جاتی تو وحشت سے اُس کا دم گھٹنے لگتا۔

اس کی تنہائی کی وجہ سے وقار اب ہفتے میں ایک بار ضرور گھر آتا۔ آنے سے پہلے وہ فون کر دیتا کہ تانیا کو تیار رکھنا میں شام کو آؤں گا۔ ارم تانیا کو تیار کر دیتی۔ وقار شام کو آتا کچھ دیر حمیدہ خاتون اور ارم کے ساتھ بیٹھتا، پھر تانیا کو لے کر گھومنے چلا جاتا۔ ارم کچھ اور تنہا ہو جاتی۔ وہ رات تک گیٹ کے پاس ٹہل ٹہل کر وقت گزارتی۔ تانیا کے آتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔

آج بھی وقار تانیا کو لے کر گیا تھا اور وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر تنہا بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس گیٹ پر پڑیں تو وہ بھاگ کر باہر آگئی۔ تانیا حسب معمول کھلونوں اور ٹافیوں سے لدی ہوئی تھی۔ ارم نے تانیا کو گود میں بھر لیا اور وقار کے اُترنے کا انتظار کرنے لگی۔

"اچھا ارم میں چلتا ہوں۔"

"جی! آپ...... آپ اتریں گے نہیں؟"

"نہیں، بس اب اُتر کر کیا کروں گا۔ خالہ جان بھی سوگئی ہوں گی۔" وقار کا جواب سُن کر ارم کی آنکھوں میں چمکنے والے جگنو جیسے پھر سے اڑ گئے۔ وہ اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے بتائے کہ میں تو جاگ رہی ہوں مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ تانیا کو سُلا کر بھی وہ کتنی ہی دیر جاگتی رہی۔ آج پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا کہ وہ صرف تانیا ہی کا نہیں وقار کا بھی انتظار کرتی تھی۔ وقار دھیرے دھیرے اس کے دل پر دستک دے رہا تھا۔ نامحسوس انداز میں یہ

احساس ہوتے ہی وہ گھبرا گئی۔ وہ تو طاہر کے سوا کسی کے بارے میں سوچنا تک نہیں چاہتی تھی۔
حمیدہ خاتون نے اُسے اس عرصے میں کتنی ہی مرتبہ دبے دبے لہجے میں یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ یوں تنہا کیسے زندگی گزارے گی۔ اسے تانیا کے بڑے ہونے سے پہلے ہی شادی کر لینا چاہیے تاکہ بچی کو باپ کی کمی کا احساس نہ ہو سکے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے وہ اکثر اسے احساس دلاتیں کہ تانیا وقار سے بہت مانوس ہے۔ اس کا احساس خود ارم کو بھی تھا۔ کبھی کبھی تو وہ یہ سوچ کر ہی کانپ اٹھتی تھی کہ اگر وقار نے آنا چھوڑ دیا یا شادی کر لی تو تانیا کا کیا ہوگا؟ وہ ننھی سی بچی وقار کی جدائی کیسے برداشت کرے گی؟ وہ تو ہر وقت وقار کے سینے سے لگی رہنا چاہتی تھی۔ ایسے میں ارم عہد کر لیتی کہ اب وہ اسے وقار سے رفتہ رفتہ دور کر دے گی، مگر جب وقار آتا تو وہ سارے عہد بھول جاتی۔ وہ شام ہی سے خود بھی وقار سے جتنا دور ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اتنا ہی اس کے حواسوں پر چھاتا جا رہا تھا۔
فون کی بیل بجی۔ ارم نے فون اٹھایا تو حسب توقع وقار بول رہا تھا۔ ''ارم کیسی ہو تم؟''
''ٹھیک ہوں! تانیا کو کتنے بجے تیار کر دوں؟ بلکہ آپ کہیں تو اُسے گیٹ پر تیار کر کے کھڑا کر دوں تاکہ آپ کو اندر آنے کی زحمت نہ کرنا پڑے۔'' ارم کے دل میں چبھنے والی شکایت اُس کی زبان پر آ گئی۔
دوسری طرف چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ پھر وقار ہنس پڑا۔
''بہت ناراض ہو شاید!''
''نہیں تو ناراض کیوں ہوتی۔'' اس نے سنبھل کر جواب دیا۔
''آج میں جلدی آؤں گا! ٹھیک ہے؟'' اس نے ہنس کر کہا اور ٹیلی فون رکھ دیا۔
شام کو جب اس نے تانیا کو تیار کیا تو خود بھی لباس تبدیل کر لیا۔ آج وہ خود بھی تانیا کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ پل پل بوجھل ہو گیا۔ تانیا کیونکہ اب تقریباً دو سال کی ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ بھی اتنا جان گئی تھی کہ آج اسے وقار کے ساتھ گھومنے جانا ہے۔ وہ ننھے ننھے قدموں سے باہر جاتی اور گیٹ کو دیکھ کر لوٹ آتی۔ وہ اپنی توتلی زبان میں ٹوٹے ٹوٹے جملے بولنے لگی تھی۔ وہ وقار کو بابا کہتی تھی، جانے کیوں، وہ بار بار ارم کے پاس آ کر پوچھتی۔
''مما! بابا نہیں......''
ارم ہنس پڑتی۔ '' تانی! جان انہیں انکل کہا کرو، انک..... کل۔'' اس نے تانیا کو سکھانے کے لیے توڑ توڑ کر کہا۔ تانیا نے صاف انکار کر دیا اور بابا، بابا کرتی رہی۔
''اسے بابا کہنا پسند ہے تو کہنے دو۔'' دروازے سے وقار کی آواز آئی تو وہ اچھل پڑی۔
تانیا وقار کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ وقار نے محسوس کیا کہ آج بہت روز کے بعد ارم نے فیروزی ساڑی باندھی ہے۔ کانوں میں فیروزی نگوں کے ٹاپس اور چہرے پر ہلکا سا میک اپ اس کے اندر ہونے والی بہتر تبدیلی کا ثبوت تھے۔ وقار کو خوشی ہوئی کہ وہ بھرپور زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔
''اچھا ارم! ہم چلتے ہیں۔ میں خالہ جان سے مل آیا ہوں، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کافی کمزور ہو گئی ہیں۔ میں شام کو جلدی آؤں گا۔ پھر ہم چائے پئیں گے۔'' وقار نے یہ کہہ کر پیروں سے لپٹی تانیا کو گود میں اٹھایا اور باہر کی طرف چل دیا۔
ارم کا جی چاہا کہ وقار اُس سے بھی کہے کہ ساتھ چلو، مگر وقار نے تیز قدم اٹھاتا گیٹ سے باہر چلا گیا۔ ارم گیٹ پر پہنچ کر ٹھٹک گئی۔ وہ تانیا کو چھت پر بٹھا کر گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ ارم سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ بول اٹھی۔
''میں...... میں بھی چلوں؟''
وقار چونک اٹھا۔ کتنی ہی دیر وہ حیران نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ ارم کی آنکھوں میں التجا تھی، اس کے منع کر دینے کا خوف تھا اور اپنی بے باکی پر شرمندگی بھی تھی۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں اور دھیرے سے واپس ہو گئی۔
ابھی وہ گیٹ کے اندر داخل نہ ہوئی تھی کہ وقار نے اسے پکارا۔

''ارم تمہارا دل چاہتا ہے میرے ساتھ چلنے کو؟''

''اگر میری موجودگی آپ پر گراں نہ گزرے تو چلوں!'' اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''ہاں بھئی! وہ تو گزرے گی۔ مگر چلو تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس سخی سے پالا پڑا تھا۔'' اس نے شوخی سے جواب دیا اور ارم کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ مسکرا کر اندر بیٹھ گئی۔

''تانیا بیٹا! آج ہمارے ساتھ ایک معزز مہمان ہیں اس لیے آج آپ پیچھے بیٹھیں! ٹھیک ہے نا۔'' اس نے تانیا کو پچھلی سیٹ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

تانیا اپنی مما کو ساتھ چلتے دیکھ کر بہت خوش تھی۔ وہ چہک کر بولی۔ ''بابا! مما اور منی!'' تانیا اپنے آپ کو منی کہا کرتی تھی۔

آج بہت عرصے کے بعد ارم یوں باہر نکلی تھی۔ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ راستہ خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ چند لمحے پہلے جو کچھ ہوا تھا، وہ اس پر کچھ شرمندگی سی محسوس کر رہی تھی۔

''خاموش رہنے کا شوق ہے تمہیں؟'' وقار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میں کوشش کرتی ہوں کہ پہل میں نہ کروں۔'' ارم کا جواب سن کر وقار ہنس دیا۔

''اور پہل کرنے والے کو ٹکا سا جواب دے دیتی ہوں۔'' وقار نے اس پر چوٹ کی۔

وہ خجل سی ہو گئی۔ ''وقار...... آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔ وقار کا مسکراتا ہوا چہرہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔

''تم کیوں نہیں کر لیتیں؟'' اس نے بھی جواب دینے کی بجائے سوال ہی کیا۔

''ایک آس ہے کہ شاید وہ واپس آ جائے۔ شاید وہ یہیں کہیں ہو اور مجھے ڈھونڈ رہا ہو۔ مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔'' ارم نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا جیسے وہ خود سے مخاطب ہو۔

''مجھے بھی یہی آس ہے کہ شاید وہ واپس آ جائے۔ شاید وہ یہیں کہیں ہو اور مجھے ڈھونڈ رہی ہو، مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو!'' وقار نے جواب دیا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

ارم کو یوں لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ ''اگر...... وہ...... آ جائے تو؟'' ارم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''بڑی شدت سے منتظر ہوں اُس کا۔''

ارم نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے منظر میں اسے وقار نظر آیا جو اس کا نہ ہو کر بھی اپنے آپ کو اس کے اور اس کی بچی کے لیے وقف کر چکا تھا۔

''بابا...... بابا بہت پیالے!'' تانیا کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے دیکھا تانیا پیچھے سے وقار کے گلے میں بانہیں ڈالے اُسے چوم رہی تھی۔ اسی لمحے ارم نے فیصلہ کر لیا بہت بڑا فیصلہ۔

رات گئے وہ گھر واپس آئی تو حمیدہ خاتون جو برآمدے میں کرسی ڈالے اس کی منتظر تھیں۔ اُسے یوں وقار کے ساتھ ہنستے مسکراتے دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ انہوں نے بہت عرصے بعد ارم کے چہرے پر خوشی کے تاثرات دیکھے تھے۔ وقار چند لمحے بیٹھ کر چلا گیا۔ ارم تانیا کو لیے کمرے میں چلی آئی۔ تانیا سو چکی تھی۔ وہ اسے کوٹ میں لٹا کر خود کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

ارم غسل خانے سے باہر آئی تو حمیدہ خاتون اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ ''ارم بیٹا! میرے کمرے میں آؤ! تم سے کچھ بات کرنا ہے۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ ارم نے اپنے اندر اطمینان بڑھتا محسوس کیا۔ وہ جانتی تھی کہ حمیدہ خاتون کیا بات کرنا چاہتی ہیں۔ وہ آج شام ہی ماضی کی طرف کھلنے والی ساری کھڑکیاں بند کر چکی تھی۔

ارم حمیدہ خاتون کے ساتھ ہی اُن کے کمرے میں چلی آئی۔

''دیکھو بیٹا، میں بہت بوڑھی ہو چکی ہوں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بیماری بھی لگی رہتی ہے میرے ساتھ! کچھ پتا نہیں کہ کب تک ہوں اور کب نہ رہوں۔ تم بچی کے ساتھ آخر کب تک تنہا زندگی گزارو گی؟ اگر بیٹا ہوتا تو یہ آس ہوتی کہ جوان ہوگا تو تمہارا محافظ ہوگا۔ مگر بچی

کے ساتھ تمہارا زندگی گزارنا آسان بات نہیں۔'' وہ چند لمحے خاموش بیٹھی اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتی رہیں۔ ''بچی وقار سے مانوس ہے اور وقار ... تم میرا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔''

''جی امی! آپ ... جیسا چاہیں۔'' وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور ڈولتے قدموں سے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی۔ اس کے کمرے سے باہر جاتے ہی حمیدہ خاتون نے آنکھیں موند لیں۔ ان کے چہرے پر اطمینان پھیلا ہوا تھا۔

بڑی سادگی سے ارم کا نکاح وقار کے ساتھ کر دیا گیا۔ صدف اور وقار تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، مگر جانے کیوں ارم آج بہت اداس تھی۔ اُس نے دلہن بننے سے انکار کر دیا تھا، بس ہلکا سا میک اپ کر کے وقار کی پسندیدہ فیروزی ساڑی باندھ لی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی دھڑکتے دل سے وقار کے قدموں کی آہٹ کی منتظر تھی۔ اسی لمحے اسے یوں لگا جیسے اس کے کمرے کی پچھلی کھڑکی پر کسی کی سسکیاں دستک سی دے رہی ہوں، جیسے کوئی دھیمے لہجے میں بین کر رہا ہو، جیسے کھڑکی پر کسی کی نگاہیں سرسرا رہی ہوں۔ وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ ارم کا جی چاہا کہ وہ کمرے سے بھاگ جائے۔ تبھی وقار نے دھیرے سے دروازے پر دستک دی اور جیسے ساری آوازیں اور ساری سسکیاں فضاؤں میں تحلیل ہوگئیں۔

......☆☆☆......

وقار کے پیار نے ارم کو نئی زندگی عطا کر دی تھی۔ طاہر کی محبت دھیرے دھیرے دھندلاتی جا رہی تھی۔ تانیا کو حمیدہ خاتون نے پاپا کہنا سکھا دیا تھا۔ اب وہ زیادہ صاف لہجے میں وقار کو پاپا کہنے لگی تھی۔ وقار تانیا کو بے انتہا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی تو ارم کو شبہ سا ہونے لگتا تھا جیسے وقار ہی اسے باپ کا پیار دے سکتا ہے۔ طاہر ہوتا تو شاید اتنا پیار نہ دے پاتا۔

ارم کی زندگی بہاروں کے رنگوں سے سج گئی۔ خزاؤں کے زرد رنگ تو جیسے کائنات ہی سے عنقا ہو گئے تھے۔ اتنی خوشیاں پا کر کبھی کبھی ارم سہم جاتی اسے جانے کیوں ڈر سا لگتا۔ اب تک خوشیوں نے اس سے آنکھ مچولی کھیلی تھی۔

حمیدہ خاتون ارم اور تانیا کو خوش دیکھ کر ہر وقت مسکراتی رہتیں۔ صدف اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی تھی۔ حمیدہ خاتون کی تنہائی کی وجہ سے وقار، ارم کو لے جانے کی بجائے خود بھی یہیں منتقل ہوگیا تھا۔ اس کا اسپتال شہر کا مشہور اسپتال بن گیا تو اس کی مصروفیات بھی بڑھ گئیں۔ مگر مصروف ہونے کے باوجود وہ تین مرتبہ ضرور تانیا اور ارم سے فون پر بات کرتا تھا۔

وقت سبک قدموں سے گزرتا رہا۔ رفتہ رفتہ ارم کے دل سے خوشیاں چھن جانے کا خوف ختم ہوتا چلا گیا۔ اب تانیا سات سال کی ہوگئی تھی۔ وقار نے اُسے ڈھائی سال کی عمر ہی میں مونٹسری میں داخل کرا دیا تھا۔ اب وہ کلاس ون میں تھی۔ ارم کی طرح وہ بھی وقار سے ایک پل کی جدائی برداشت نہ کرتی تھی۔

حمیدہ خاتون کے گلے میں کینسر ہوگیا۔ یہ خبر ارم کے لیے قیامت سے کم نہ تھی، اگر وقار اسے تسلی نہ دیتا تو شاید وہ رو رو کر پاگل ہو جاتی۔

''وقار کیا سارے دکھ، سارے عذاب میری ہی تقدیر میں لکھے ہیں؟'' اس نے روتے ہوئے وقار سے پوچھا۔

''پگلی! کبھی میرے اسپتال آ کر دیکھو لوگ تم سے بھی زیادہ دکھی ہیں، اکیلے اور تنہا زندگی اور موت سے لڑ رہے ہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے ارم! اب تک تو تمہارے اندر بہت حوصلہ پیدا ہو جانا چاہیے تھا۔'' وہ اسے دھیرے دھیرے سمجھاتا۔ اپنے مریضوں کے دکھوں کے قصے سناتا۔ تب واقعی ارم اپنے آپ کو بہت سوں سے بہتر محسوس کرتی۔

حمیدہ خاتون کچھ روز اسپتال میں رہ کر گھر واپس آ گئیں۔ بقول ان کے وہ چاروں طرف ناچتی موت نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ موت دبے قدموں ان کے گھر میں داخل ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ وقار گھر میں بھی ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔

......☆☆☆......

شدید سردیوں کے دن تھے۔ ہر وقت آسمان پر

بادل چھائے رہتے۔ روشن دن بہت جلدی شام کی ملگجاہٹ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

"ارم! ڈاکٹر طارق کی شادی ہے۔ وہ بضد ہے کہ ہم شادی میں ضرور شریک ہوں۔" وقار نے اسے بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

ڈاکٹر طارق، وقار کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں ایک ہی ساتھ پڑھے بھی تھے۔ وہ جانتی تھی کہ طارق، وقار کو بہت عزیز ہے مگر ماں کی وجہ سے اس کا لاہور جانا ممکن نہیں تھا۔ طارق کی شادی لاہور میں تھی۔

"کیا سوچنے لگیں؟" وقار نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"ایں، ہاں..... میں یہی سوچ رہی تھی کہ میرا جانا تو ممکن نہیں، البتہ آپ ضرور جائیں۔"

"جی نہیں مما' پاپا کہیں نہیں جائیں گے۔" تانیا فوراً بول اٹھی۔

"نہیں بیٹا، بری بات ہے۔ انکل طارق ناراض ہو جائیں گے۔" اس نے تانیا کو سمجھایا۔ تانیا منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"آج تو بڑی نئی ہو رہی ہیں۔ بڑی جلدی اجازت دے دی آپ نے۔" وقار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں، آپ زیادہ خوش نہ ہوں۔ صرف دو دن کی اجازت دے رہی ہوں بس۔"

"شکریہ سرکار۔" وقار شوخی سے بولا۔

"پلیز وقار، میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتی، تم نے مائنڈ تو نہیں کیا؟" ارم نے وقار کے مضبوط ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

"میں کب تمہارے بغیر رہنا چاہتا ہوں۔" وقار نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

تانیا ابھی تک منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ پھر وہ دونوں اسے سمجھانے اور بہلانے میں لگ گئے۔ جلد ہی تانیا نے بھی صرف دو دن کے لیے وقار کو اجازت دے دی۔

اگلے ہی دن کی فلائٹ سے وقار، لاہور چلا گیا۔

سرد ہوا میں جسموں کو ٹھٹھرائے دے رہی تھیں۔ وقار کے چلے جانے سے ماحول کی ہیبت میں اضافہ ہو گیا۔ ایک انجانا سا خوف تھا جو ارم کے سارے وجود میں سرسرا رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو گھر کے کاموں میں مصروف کرنا چاہا، مگر جانے کیوں بے چینی بڑھتی ہی چلی گئی۔

شام ہی سے حمیدہ خاتون کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا تھا۔ ارم کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے وقار کے اسپتال فون کر کے کسی ڈاکٹر کو بلانا چاہا، مگر تیز بارش اور موسم کی خرابی نے شاید ٹیلی فون کی لائن منقطع کر دی تھی۔ جوں جوں اندھیرا پھیل رہا تھا، اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے خود اسپتال جانا چاہا، مگر دھواں دھار بارش میں اس کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ کتنی ہی دیر تک گیٹ کھولے کھڑی رہی۔ اسی اثناء میں تانیا نے آ کر بتایا کہ نانی اماں آپ کو بلا رہی ہیں۔

ارم دوڑتی ہوئی حمیدہ خاتون کے کمرے میں داخل ہوئی۔

حمیدہ خاتون نے اسے دیکھتے ہی بولنے کی کوشش کی مگر ان کے حلق سے غوں غوں کی آوازوں کے سوا کچھ نہ نکلا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر تکیے میں جذب ہو گئے۔ فالج کی وجہ سے ان کی زبان اینٹھ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر ارم بلک بلک کے رونے لگی۔

"امی..... امی یہ کیا ہو گیا؟ میں کسی ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ارم نے اٹھنا چاہا تو حمیدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے وہیں بیٹھے رہنے کی التجا کی۔ ارم ان کے کانپتے ہوئے ہاتھوں پر سر رکھ کر رو دی۔

رات کسی آسیب کی طرح پورے گھر پر چھاتی جا رہی تھی۔ بارش کی آوازیں آ رہی تھی جیسے بدروحیں بین کر رہی ہوں۔ ارم نے گھڑی کی طرف دیکھا، پونے بارہ بج رہے تھے۔ تانیا غالباً سو چکی تھی۔ وہ بے قراری برآمدے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے وقار کو کیوں جانے دیا۔ وہ کتنی ہی دیر برآمدے میں کھڑی آسمان سے

برستے قہر کو دیکھتی رہی۔ اُسے یوں لگا جیسے یہ بارش سارے شہر کو اپنے ساتھ بہالے جائے گی۔

اندر سے حمیدہ خاتون کی بے معنی سی آوازوں نے اُسے چونکا دیا۔ وہ جلدی سے اندر گئی۔ ''جی امی!'' وہ حمیدہ خاتون پر جھک گئی۔

حمیدہ خاتون کے منہ سے کچھ بے معنی سی آوازیں نکلیں۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ پھر وہ بے بسی سے رو دیں۔

''امی! صبح ہوتے ہی میں وقار کو بلالوں گی۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گی امی!'' اس نے ماں کو تسلی دی مگر اس کے لہجے کا کھوکھلا پن خود اُسے رلا گیا۔ حمیدہ خاتون نے آہستہ سے آنکھوں کی پتلیوں کو گھما کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ انہوں نے اشارے سے پانی مانگا۔ ارم نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا جگ اٹھایا تو وہ خالی تھا۔

''امی! میں پانی لے کر آتی ہوں...... بس ابھی آئی۔'' وہ جگ اٹھا کر کمرے سے باہر آگئی۔

برآمدے کو عبور کر کے وہ کچن کے قریب پہنچی ہی تھی کہ کال بیل نے اُسے چونکا دیا۔ ''وقار۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور وہ بھاگ کر گیٹ کے پاس چلی گئی۔ معاً اسے خیال آیا کہ وقار کیسے آسکتا ہے؟ آج ہی صبح تو وہ لاہور گیا تھا۔ بارش نے اُسے بھگو دیا تھا۔ سرد ہوا اس کے بدن میں سوئیاں سی چبھو رہی تھی۔ کون ہوسکتا ہے اتنی رات گئے؟ اس نے سوچا اور ایک سرد سی لہر اسے ریڑھ کی ہڈی میں رینگتی محسوس ہوئی۔ اسی لمحے کال بیل پھر گنگنا اٹھی۔

''کون......؟ کون ہے؟'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''گیٹ کھولو ارم! میں ہوں۔''

ارم کو یوں لگا جیسے یہ آواز خود اس کے اندر سے آئی ہو، ایک ایسی آواز جو اس کے وجود کے پاتال میں کہیں دب گئی تھی، کچھ مانوس سی، کچھ انجان سی۔''

''گیٹ کھولو ارم!'' آواز پھر آئی۔

ارم نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر گیٹ کھول دیا۔ اسے یقین نہ آیا کہ سامنے کھڑا ہیولا طاہر کا ہوسکتا ہے۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اسے پہچاننا چاہا۔

طاہر دو قدم آگے بڑھا۔ ''ارم! میں...... میں طاہر ہوں۔''

آگے بڑھ آنے سے برآمدے میں جلنے والے بلب کی روشنی اس کے چہرے پر رینگ آئی اور ارم کے پورے وجود میں دہشت سی پھیل گئی۔ طاہر کا آدھا چہرہ جھلسا ہوا تھا، ایک آنکھ کی جگہ گڑھا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

طاہر لنگڑاتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ ''ارم! میں طاہر ہوں، پلیز مجھے پہچانو؟''

ارم چیختی ہوئی کمرے کی طرف بھاگی یوں جیسے ہزاروں روحیں اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔ اس کی چیخوں نے ویران گھر میں دہشت سی پھیلا دی۔ طاہر لنگڑاتا ہوا اس کے پیچھے آرہا تھا۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ دروازے کو لاک کر کے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبالیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ تانیا اس کی چیخیں سن کر جاگ جائے۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں، رنگ سفید ہو چکا تھا۔ پورے بدن میں جیسے زلزلہ آگیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی طاہر اس کے سامنے اتنی ہیبت ناک صورت میں آئے گا۔ اب تو وہ اسے بھول کر وقار کی ہو چکی تھی۔ طاہر کی آمد کسی طوفان سے کم نہ تھی۔ ایسا طوفان جو ایک مرتبہ پھر اس کی خوشیوں کو بہالے جانے آیا ہو۔ وہ دروازے سے پشت لگائے ہانپ رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ پوری جان سے کانپ گئی۔

طاہر دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا اور اس کی آواز کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''ارم...... دروازہ کھولو! میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں ارم! اپنی بچی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ارم کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے بدروحوں نے اس کے کمرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ بارش کی آواز طاہر کی آواز میں مل کر اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ وہ تیزی سے ٹیلی فون کی

جانب بڑھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈاکٹر طارق کے گھر لاہور فون کر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے لائن ملی۔

''ہیلو!'' ڈاکٹر طارق کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔

''طارق! وقار کو بلاؤ پلیز!'' اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''بھائی...... کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟'' طارق کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''وقار کو فون دو!'' وہ چیخ اٹھی۔

چند لمحے بعد ہی اسے وقار کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ارم کیا بات...... خیریت تو ہے؟''

''وقار!...... وقار! تم ابھی آ جاؤ! خدا کے واسطے ابھی آ جاؤ۔'' وہ چیخ چیخ کر رو دی۔

''ارم! مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے؟'' وقار نے چیخ کر اس سے پوچھا۔ اسی دوران میں دروازہ پیٹے جانے کی آواز شاید وقار تک پہنچ گئی۔ کون ہے ارم؟ دروازے پر کون ہے؟'' وقار نے روتی ہوئی ارم سے پوچھا۔

ارم کوشش کے باوجود کوئی جواب نہ دے سکی۔ سسکیاں اسے بولنے نہیں دے رہی تھیں۔

''ارم! میں ابھی نکل رہا ہوں تم...... تم دروازہ نہ کھولنا اور سنو، ہو سکے تو تھانے فون کر دو میں نکل رہا ہوں ارم...... تانیا تو ٹھیک ہے نا؟ مجھے جواب کیوں نہیں دیتیں ارم؟'' وہ بولتا چلا گیا۔

''تانیا...... تانیا ٹھیک ہے...... وقار...... وہ دروازے پر...... طاہر...... تم آ جاؤ وقار...... تم آ جاؤ۔'' وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور ریسیور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ وہیں زمین پر گر پڑی یوں جیسے اب اٹھ نہ سکے گی۔ اس کے بدن کی جان جیسے نکل گئی تھی۔ اس کا سارا وجود جیسے صرف سماعت بن گیا تھا۔ دروازے کو اب بھی پیٹا جا رہا تھا۔ وہ ویسے ہی پڑی سنتی رہی۔ کچھ دیر بعد آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ اور ارم نے دور ہوتے قدموں کی آواز سنی جو چند لمحے بعد معدوم ہو گئی۔ غالباً طاہر حمیدہ خاتون کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد اسے ماں کے حلق سے نکلنے والی بے معنی آوازیں آنے لگیں۔ طاہر کچھ کہہ رہا تھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ زمین پر اوندھی پڑی روتی رہی۔

کتنی ہی دیر وہ یونہی پڑی رہی پھر دھیرے دھیرے سناٹا سا چھا گیا جیسے سب کچھ ساکت ہو گیا تھا۔ بارش بھی شاید تھم گئی تھی۔ اس نے اردگرد ابھرنے والی کسی بھی آواز کو سننا چاہا مگر ناکام رہی۔ سارا ماحول پتھرایا ہوا سا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے دروازے کے نیچے سے روشنی اندر رینگ آئی۔ تو گویا صبح ہو گئی اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

وہ دھیرے دھیرے اٹھ کر بیڈ کے قریب چلی آئی۔ جہاں ان سارے عذابوں سے بے خبر تانیا سو رہی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ یہ طوفان اس سے کیا کچھ چھین لے گیا تھا۔ یہ صبح کتنے ہی انجانے چہروں کو قریب اور کتنے عزیز چہروں کو دور کر گئی تھی۔ ارم یہ سوچ کر کانپ اٹھی کہ تانیا طاہر کی بیٹی ہے اور طاہر اس کا شوہر ہے جو زندہ ہے۔ پھر وقار؟ جدائیاں کیا پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گی؟ یہ سوال جیسے آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

صبح کی روشنی ذرا بڑھی تو ارم نے دھیرے سے اٹھ کر دروازے سے کان لگا دیے۔ کوئی آواز کوئی آہٹ نہ تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، خاموش اور ساکت وہ سہمے سہمے سے حمیدہ خاتون کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے بیڈ پر حمیدہ خاتون آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ اندر اور کوئی بھی نہ تھا۔

وہ دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔ ''امی...... امی! یہ کیا ہو رہا ہے...... یہ کیا ہو گیا امی؟''

حمیدہ خاتون کے بدن میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ تب ہی ارم کو ان کے سرد بدن میں عجیب سی سختی کا احساس ہوا۔ اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔ اس کا شبہ صحیح تھا۔ حمیدہ خاتون یقیناً حالات کی ستم ظریفی برداشت نہیں کر پائی تھیں۔ وہ ارم کی تنہائی پر ترس کھائے بغیر سارے عذابوں سے نجات حاصل کر چکی تھیں۔

ارم پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ ''یا اللہ کیا سارے عذاب میرے لیے ہیں؟ یہ کیسا طوفان تھا

میرے مالک جو میرا تنکا تنکا بہا لے گیا۔ وہ رو رہی تھی۔ ماں کی لاش پر، اپنے ارمانوں کی لاش پر اور کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔

اسی لمحے تانیا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ماں کو روتا دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ ''مما...... مما کیا بات؟ کیوں رو رہی ہیں مما؟'' ارم نے دیکھا وہ خود بھی رو رہی تھی۔

''جان تُو کیوں روتی ہے جان۔'' ارم نے اسے سینے سے لپٹا لیا۔

''مما! میں نے بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔'' اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ارم کے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں جان! میں نے اس خواب کی تعبیر دیکھی ہے، بہت ڈراؤنی، بہت ہیبت ناک...... اور تانی! تیری نانی امی مر گئیں...... اور ہم...... ہم شاید بالکل اکیلے ہو گئے۔'' ارم نے روتے ہوئے تانیا کو سینے سے لگا لیا۔

تانیا حمیدہ خاتون کو دیکھ کر رو پڑی۔ وہ دونوں رو رہی تھیں۔ پورے کمرے میں ان کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

''ارم!'' وقار کی آواز تھی۔ وہ اسے پکارتا ہوا آ رہا تھا۔ ارم اور تانیا بھاگ کر باہر گئے۔ تانیا وقار سے لپٹ گئی۔

''دیکھا وقار تم سے ایک رات کو جدا ہوئی تو کیا کیا عذاب آ گئے! امی ہمیں چھوڑ گئیں اور وہ...... وہ۔''

وقار نے اپنا ہاتھ ارم کے منہ پر رکھ دیا اور بولا۔'' ارم! آگے کچھ نہ کہنا تانیا......''

وہ چونک گئی۔ واقعی اُسے تانیا کے سامنے طاہر کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔

وقار بھاگتا ہوا حمیدہ خاتون کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

......☆☆☆

حمیدہ خاتون کے انتقال کی خبر سن کر جلد ہی خاندان کے لوگ جمع ہو گئے جن میں ارم کی پھوپی اس کے تایا اور کزنز بھی تھے۔ صدف، سعودی عرب میں تھی۔ اسے ٹیلیفون کر دیا گیا تھا۔ اس نے ٹیلی فون پر روتے ہوئے التجا کی تھی کہ وہ اس کے آنے سے پہلے انہیں نہ دفنائیں۔

رات گئے صدف پہنچی تو ایک مرتبہ پھر طوفان سا آ گیا۔ پھوپی، تایا وغیرہ نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔

رات تین بجے لوگ حمیدہ خاتون کو دفنا کر واپس آئے تو طاہر کی بہن سے سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ طاہر واپس آ چکا ہے۔ یہ خبر معلوم ہوتے ہی تایا اور پھوپی نے ارم کو کمرے میں لے جا کر بات کی اور اُسے بتایا کہ اب تم وقار کے سامنے نہیں آ سکتیں، اس سے نہیں مل سکتیں، اس وقت تک جب تک کہ فتویٰ نہ لے لیا جائے۔ ہوسکتا ہے طاہر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے یا تانیا ہی کو واپس لینا چاہے۔ ارم پہلے ہی قیامت کی ایک رات کاٹ چکی تھی، یہ باتیں سن کر وہ بے ہوش ہو گئی۔

وقار سا مضبوط شخص بھی سب کے سامنے رو دیا۔'' تایا! ہمیں تو اس کے مرنے کی اطلاع ملی تھی۔ ارم نے ڈیڑھ سال اس کا انتظار کیا تھا اور اب...... اب تو سات آٹھ سال ہو گئے۔ تانیا مجھے باپ سمجھتی ہے۔ میں ارم اور تانیا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خدا کے لیے ہم پر یہ ستم نہ کریں۔''

''بیٹا! ہم کیوں ستم کرنا چاہیں گے؟ یہ تو حالات ہیں جنہوں نے ایسا خوف ناک رُخ اختیار کر لیا ہے۔ طاہر کی بہن نے بتایا ہے کہ طاہر اس حادثے کے بعد جانے کیسے مصر کے شہر اسکندریہ تک پہنچ گیا شاید پہنچا دیا گیا۔ وہ وہیں اتنے عرصے زیر علاج رہا۔ اسی شپ کے دو اور زخمی بھی وہیں لائے گئے تھے۔ مگر وہ زندہ نہ رہ سکے وہاں ڈاکٹروں نے طاہر کی جان تو بچالی مگر وہ یادداشت کھو چکا تھا۔ جسے لوٹانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کا جسم بھی بری طرح جھلس گیا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے اور کہاں کہاں بھٹکتا ہوا طاہر اب یہاں پہنچا، جانے کیسے اس کی یادداشت واپس آئی مگر مسئلہ یہ ہے کہ اب وہ ذہنی طور پر بالکل صحت مند ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ارم کا اُس سے نکاح برقرار ہے یا نہیں۔'' وہ

لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکے۔

وقار فوراً ہی بول اٹھا۔ ''تایا! اگر ایسا ہوا تو یقین کریں ہم تینوں مر جائیں گے۔ آپ نہیں جانتے، میں نے ارم کی حالت دیکھی تھی۔ وہ طاہر کو دیکھنے کے بعد ایک ہی رات میں آدھی ہوئی تھی۔ دہشت اس کے رونگٹوں میں سرائیت کر گئی ہے۔''

''میں صبح مفتی صاحب کے پاس جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے فیصلہ تمہارے حق میں ہو۔ تم دعا کرو ہاں دیکھو جب تک ہمیں کوئی جواب نہ مل جائے تم ارم سے دور رہنا۔'' تایا نے وقار کو تسلی دی۔

''تایا! اگر ایسا ہوا تو آپ طاہر سے بات کیجیے گا کہ وہ ارم کو طلاق.....''

''ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔'' تایا نے وقار کی بات کاٹ کر کہا۔

''مگر ایسی صورت میں بھی اگر اس نے تانیا کو لینا چاہا تو مسئلہ اتنا ہی گھمبیر ہوگا۔''

''آپ اُس سے بات کیجیے گا۔''

صبح ہوئی تو وقار اور ارم کے درمیان اَن دیکھی اور مضبوط دیوار موجود تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور آنسو بہا رہے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ایک رات کی جدائی انہیں ایک دوسرے سے اتنی دور لے جائے گی۔

تایا مفتی صاحب کے پاس جا چکے تھے۔ ارم، تانیا کو سینے سے لگا آنسو بہا رہی تھی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو اُس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں طاہر کی بہن رخشندہ کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی صدف سوجی ہوئی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھ رہی تھی۔

ارم نے سہم کر تانیا کو سینے سے لگا لیا۔ ''نہیں..... نہیں رخشی! مجھ پر رحم کرو۔ تانیا کو نہ لے جانا۔ میں مر جاؤں گی اس کے بغیر..... رخشی! میں نے طاہر کا بہت انتظار کیا تھا۔ یقین کرو۔ طاہر تو میرے دل میں بستا تھا، میرے وجود کا حصہ تھا، مگر دیکھو..... حالات نے مجھے کہاں پہنچا دیا۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''نہیں بھابی، میں تانیا کو لینے نہیں آئی۔ میں تو آپ کو بھی لینے نہیں آئی۔ ہاں میں کسی کو لینے نہیں آئی۔ طاہر بھائی نے صرف یہ پوچھا ہے کہ وہ..... وہ یہاں رہیں یا چلے جائیں؟ وہ..... آپ کی خوشیاں نہیں چھیننا چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ آپ..... آپ وقار کی ہو چکی ہیں تو رات کو بھی یہاں نہ آتے، وہ کبھی نہ آتے۔'' رخشی اس سے لپٹ کر رو دی۔ ''بس بھابی! انہوں نے تانیا کی تصویر مانگی ہے۔ اگر آپ دینا چاہیں تو؟''

رخشی کی باتیں سن کر ارم کو جہاں اطمینان ہوا وہاں اس کا دل بھی دُکھ گیا۔ طاہر کی چاہت پر اس کی قربانی پر وہی تقدس وہی عظمت جو کبھی اس نے وقار کے لیے محسوس کی تھی۔ آج وہی طاہر کے لیے اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ اس نے تانیا کی ایک بڑی سی فریم کی ہوئی تصویر رخشی کو دیتے ہوئے کہا۔ ''رخی اگر تانیا میں اُسے دیکھنے کی تاب ہوتی تو یقین کرو میں تانیا کو تمہارے ساتھ ضرور بھیجتی۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔ اس سے کہنا، میں اس کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی۔''

رخشی، تانیا کو پیار کر کے ہوتی ہوئی چلی گئی۔ اسی لمحے وقار کمرے میں داخل ہوا۔ ارم چند لمحے وقار کو حیران حیران سی دیکھتی رہی۔ اُسے یقین نہ آیا کہ ساری دیواریں گر چکی ہیں۔ اس نے وقار کی آنکھوں میں آنسو مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تو دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ تانیا بھی اس کی ٹانگوں سے لپٹی رو رہی تھی۔ صدف دروازے میں کھڑی بھیگی مسکراہٹ سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''وقار! کیا..... کیا وہ فاصلے..... وہ دیواریں.....''

''تم میری ہو ارم ہر طرح سے، تانو نا بھی! کیوں کہ ہمیں طاہر کی موت کی اطلاع ملی تھی۔ پھر بھی تم نے اس کا انتظار کیا تھا۔'' وقار نے مسکراتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''اب ہم ایک لمحہ بھی جدا نہیں ہوں گے وقار..... وعدہ کرو!''

''پکا وعدہ!'' وقار نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

.....☆☆☆.....

دوسری سچ بیانی

گرہن لگا جیون

ذکیہ کی خاموشی سے ہم بھی فکر مند تھے۔ ذکیہ ہم تینوں کی مشترکہ سہیلی تھی۔ ہم چاروں ہاسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ اسکول نیا نیا بنا تھا اس لیے ہاسٹل کے مزید کمرے ابھی زیر تعمیر تھے۔ اسی سبب

ایک ایک کمرے میں چار چار ٹیچریں تھیں، وہ نئی کالونی تھی اور اسکول بھی نیا تھا اس کے باوجود غیر متوقع طور پر داخلے زیادہ ہوئے تھے اور اسکول کا کام ایک دم بڑھ گیا تھا۔ ہم بھی بہت مصروف تھے۔

صبح سے اب تک ذکیہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ بولی تھی اور ہمیں اسی بات کی تشویش تھی۔ وہ لڑکی تو خاموش رہنا جانتی ہی نہ تھی۔ ہر دم ہنسنے ہنسانے والی لمحہ لمحہ زندگی سے بھرپور گزارنے والی ذکیہ آج صبح سے چپ چپ تھی۔ اس کی خاموشی نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ میں نے کئی بار پوچھا۔ مگر وہ ٹال گئی۔

دوپہر کو ہم لوگ اتنا تھک گئے تھے کہ ذکیہ سے کوئی بات نہ ہوسکی۔ شام کو ہم سب لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ذکیہ خاموشی کے ساتھ چائے کے کپ کو گھورے جا رہی تھی۔

"میرے خیال میں چائے اب شربت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اب اسے پی ہی لو۔" نسیم نے اسے ٹوکا۔

اس نے چائے کا کپ ایک سانس میں خالی کیا اور اٹھ کر کمرے میں چل دی۔

"یہ ہماری ہیر آج اتنی اُداس کیوں ہے؟" ثریا نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں معلوم کرتی ہوں۔" میں ذکیہ کے پیچھے اس کے کمرے میں آ گئی۔ "ذکیہ! کیا بات ہے ڈیئر؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک دم آنسو بھر آئے اور اس نے تکیے کے نیچے سے ایک خط نکال کر مجھے تھما دیا۔

میں نے خط پڑھا تو ذکیہ کی ساری پریشانی سمجھ میں آ گئی۔ یہ اس کی بڑی بہن نجمہ باجی کا خط تھا۔ گوجر خان کے کسی گاؤں میں وہ رہتی تھی۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے تین ماہ ہوئے تھے اور یہ نجمہ باجی کا دوسرا خط تھا۔ ذکیہ نے کسی کے ہاتھ اسے دستی خط بھجوا دیا تھا۔ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ ہمیں اپنے دکھ لکھ بھیجتی تھی، مگر ہم اسے جواب نہیں دے سکتے تھے۔ کیوں کہ اس کی سسرال والے اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے کہ نجمہ کے نام کوئی خط آئے۔

تصور اس کی سسرال والوں کا بھی نہ تھا۔ وہ بھی تقریباً ان پڑھ تھے اور ہر خط کو وہ عشقیہ خط ہی سمجھتے تھے۔

نجمہ باجی بے حد حساس تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں سے اسے صدمہ پہنچتا تھا۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اور شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھنا چاہتی تھی مگر اس کے سسرال والوں نے اسے شادی ہوتے ہی چولہے ہانڈی میں جھونک دیا تھا۔ گوبر تک وہ خود اٹھاتی تھی۔ جانوروں کی خدمت سے لے کر گھر کے ہر فرد کی خدمت کرنا اس کے ذمے تھا۔ میاں بھی ایسا تھا کہ اپنے حال میں مست رہتا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ بیوی کا خیال آتا تو اس کی پٹائی کر دیتا۔ نجمہ باجی پر بے انتہا پابندیاں تھیں۔ سسرال میں وہ قدم باہر نہیں نکال سکتی تھی۔ یہ ان لوگوں کی نام نہاد عزت کے خلاف تھا۔ پھر وہ جاتی بھی کہاں؟ ماں باپ تو عرصہ ہوا خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ لے دے کر ایک بھائی تھا وہ حافظ آباد میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مگن تھا۔ اور مہینوں بہن کی خبر نہ لیتا تھا۔

ذکیہ ایف اے، بی ٹی کرنے کے بعد یہاں گورنمنٹ کی ملازمت میں آ گئی تھی۔ نجمہ بے چاری کو اب ذکیہ ہی سے تھوڑا بہت سہارا تھا اور وہ اسے ہی خط لکھ کر اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا کر لیتی تھی، مگر اس کا خط پڑھ کر ذکیہ دو دو دن تک گم صم رہتی تھی۔ ایسے میں ہم بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔

کچھ عرصہ گزرا تو ہم لوگ نئے ماحول سے مانوس ہو گئے۔ کالونی میں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں کی آبادی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری میل ملاقات بڑھ گئی، مگر ہم لوگ بہت محتاط تھے۔ جہاں بھی ہم جاتے ایک ساتھ ہی جاتے تھے۔

ان دنوں شہر میں ایک چینی خاتون نے جوڈو کراٹے کا کلب کھول لیا۔ دو ماہ کا کورس تھا۔ مجھے اور نسیم کو شوق چرایا تو ہم نے بھی شام کی کلاسوں میں داخلہ لے لیا تھا۔ کافی محنت طلب کام تھا، مگر شوق تھا اس لیے خود بہ خود ہی ہمت پیدا ہو گئی۔ یوں میں اور نسیم اپنے گروپ سے علیحدہ ہو گئے۔ ذکیہ اور ثریا ہم سے

روٹھی روٹھی سی رہنے لگیں کیونکہ ہمارے جوڈو سیکھنے سے سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ہر ہفتے کو فلم دیکھنا، اتوار کو بازار جانا، انارکلی کی چاٹ کھانا سب کچھ ادھورا رہ گیا تھا۔

شام کو جب کھانا کھانے کے بعد ہم لان میں بیٹھتے تو میرا اور نسیم کا موضوع جوڈو کراٹے ہی ہوتا۔ ثریا اور ذکیہ بور ہوکر دور جا بیٹھتیں۔ خدا خدا کر کے ہمارا کورس ختم ہوا اور ہمیں ابتدائی بیلٹ مل گئی۔ ابتدا میں صرف اپنے دفاع کے چند طریقے ہی بتائے جاتے تھے کہ بہ وقت ضرورت کام آجائیں۔ میرے خیال میں یہ ہنر تو ہر لڑکی کو سیکھنا چاہیے۔

تھوڑے دنوں میں نہ صرف میں نے بلکہ دوسری لڑکیوں نے بھی محسوس کیا کہ ذکیہ کچھ چپ چپ سی رہنے لگی ہے۔ میں سمجھی کہ پھر نجمہ باجی کا کوئی خط آیا ہوگا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ اسے بہت کریدنے سے معلوم ہوا کہ گوجر خان کا ایک شخص جو ابھی حال ہی میں یہاں آیا تھا۔ نجمہ باجی کے بارے میں بہت تکلیف دہ خبریں لایا تھا۔ ان باتوں کو سن کر ذکیہ بے چین اور بے قرار تھی۔ وہ شخص ذکیہ کی کلاس میں پڑھنے والی ایک بچی کا عزیز تھا۔ وہ بھی کبھار آتا رہتا تھا۔ ذکیہ سے اس کی ملاقات اسکول کے آفس میں ہوئی تھی۔ وہ بچی کا رزلٹ اور اس کی تعلیمی حالت دریافت کرنے آیا تھا۔

بات آئی گئی ہوگئی لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں ان دنوں ٹی وی پر بہت اچھی سیریل چل رہی تھی۔ ہم لوگ ٹی وی روم میں جمع ہوجاتے۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈراما شروع ہونے کے پانچ منٹ بعد ہی ذکیہ خاموشی سے چلی جاتی اور پھر ڈراما ختم ہونے میں ایک یا دو منٹ ہوتے تو لوٹ آتی۔

ایک دو ہفتے تو میں نے زیادہ غور نہ کیا۔ مگر تیسرے ہفتے میں نے یہ بات محسوس کرلی۔

اس دن بھی جب ذکیہ خاموشی سے نکل گئی تو میں بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چل دی۔ ہاسٹل کے گیٹ سے نکل کر وہ دوسری طرف چلی گئی۔ اس طرف ایک اسپتال زیر تعمیر تھا۔ میں نے تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد وہ ایک دیوار کے سائے میں ٹھہر گئی۔ میں دبے قدموں آگے بڑھی۔ اور مجھے اس حقیقت نے چکرا کر رکھ دیا کہ ذکیہ کسی شخص سے باتوں میں مصروف ہے۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہیں۔

میں چپ چاپ واپس آگئی۔ یہ بات ہم سبھی کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ ہمارے والدین نے ہمیں جس اعتماد کے سہارے یہاں ملازمت کرنے کی اجازت دی تھی وہ ذکیہ کی ذرا سی لغزش سے پاش پاش ہوسکتا تھا۔ ذکیہ کی غلطی ہم سب کو ذلیل کرسکتی تھی۔ میں موقع کی تلاش میں تھی کہ ذکیہ سے بات کروں۔ مگر ان دنوں بچوں کے ٹیسٹ ہورہے تھے۔ ہماری مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں، پرچے وغیرہ دیکھنے میں خاصا وقت لگ جاتا تھا اس لیے باوجود کوشش کے ذکیہ سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

ڈرامے کی آخری قسط تھی۔ میں نے سوچا کہ آج کسی نہ کسی طرح ذکیہ سے ضرور بات کروں گی کیوں کہ اب یہ سلسلہ خاصا طویل ہوگیا تھا۔ اس دوران میں ہاسٹل کے نئے کمرے بن چکے تھے۔ اب ہم لوگ علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہتے تھے۔ کھانے اور ٹی وی کا کمرا مشترکہ تھا۔ ٹی وی روم ہی میں ہم لوگ اپنی ڈاک بھی وصول کرتے تھے۔

اُس رات میں ٹی وی روم سے باہر آنے لگی تو ہاسٹل انچارج نفیسہ باجی نے مجھے دو خط دیے۔ ایک خط میرا تھا اور دوسرا ذکیہ کا۔ ذکیہ کا خط لے کر میں اس کے کمرے میں چلی گئی۔ خلاف توقع میں نے اسے کمرے میں پایا۔ وہ بہت خاموش اور زرد زرد سا چہرہ لیے بستر پر لیٹی تھی۔

''کیا بات ہے ذکیہ؟'' میں نے بہ غور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ لو اپنا خط!'' میں نے خط اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے خاموشی سے خط لیا اور بغیر پڑھے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ مجھے اس کے اس رویے سے حیرت

ہوئی مگر اس کا چہرہ دیکھ کر چونک اٹھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

اس کے رونے سے میں گھبرا گئی اور جلدی سے اس کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا کہ کوئی اندر نہ آ جائے اور خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بن جائے۔

"بتاؤ نا ذکیہ کیا بات ہے؟ دیکھ سچ سچ بتانا! تمہارے آنسو مجھے بہت پریشان کر رہے تھے۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

وہ ایک دم میرے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے جی بھر کے رونے دیا کیونکہ رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ "فرحی! میں مر جاؤں گی فرحی! ختم ہو جاؤں گی، زہر کھا لوں گی۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔

"پاگل ہو گئی ہو ذکیہ! آخر بات کیا ہے؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

"جاوید سے ملاقات کے بعد میری اندھیری زندگی میں چاند طلوع ہو گیا تھا۔ وہ بے حد شریف اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ آج رات ڈرامے کے وقت میں جیسے ہی ہاسٹل سے نکل کر دیوار کے پاس پہنچی تو کسی نے پیچھے سے مجھے پکڑ لیا اور اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا تاکہ میں چیخ نہ سکوں۔ مجھے اندھیرے میں کئی ہیولے نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ میں صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی، انہوں نے میری گھڑی اور انگوٹھی اُتار لی۔ پھر مجھے دھمکی دی کہ اگر ذرا بھی آواز نکالی تو جان سے مار دیں گے۔ ان میں سے ایک آدمی کے پاس کیمرا بھی تھا۔ اس نے میری نہایت فضول سی کئی تصویریں بھی اُتار لیں۔ پھر جاتے جاتے انہوں نے دھمکی دی کہ اگر جاوید سے تعلقات ختم نہ کیے تو اس سے بھی بُرا حشر کریں گے اور یہ کہ اگر تم تصویریں اور نیگیٹو لینا چاہتی ہو تو ہمارے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔ ہم تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دیتے ہیں۔ خوب اچھی طرح سوچ لو۔ تمہیں کچھ زیادہ وقت نہیں ہوگی، ہفتے میں صرف ایک رات کے چند گھنٹوں ہی کی تو بات ہے۔ اگر یہ منظور ہو تو سامنے والی دیوار کی درز میں سرخ رنگ کا کپڑا پھنسا دینا ورنہ، تمہاری تصویریں پورے اسکول میں بانٹ دی جائیں گی۔" ذکیہ رو رو کر نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔

میں نے بہت مشکل سے اُسے سمجھایا کہ اس طرح رونے سے بات پھیل سکتی ہے۔ تم خاموش ہو جاؤ۔ ہم سب مل کر اس کا کوئی حل ڈھونڈتے ہیں۔

میں نے اس راز میں نسیم اور ثریا کو بھی شامل کر لیا۔

ذکیہ نے اسکول سے دو دن کی چھٹی لے لی۔ وہ بری طرح ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ ہم چاروں نے مل کر ایک حل نکال ہی لیا۔ دوسری رات ذکیہ نے سرخ رنگ کا کپڑا دیوار کی درز میں پھنسا دیا۔

تیسری رات ہم سب چوکنا ہو کر بیٹھ گئے، اچانک ذکیہ کے کمرے کی کھڑکی سے کاغذ کا ایک پرزہ ذکیہ کے بستر پر آ گرا۔ یہ کھڑکی باہر سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ ہم سب کمرے میں موجود تھے۔ نسیم نے جھپٹ کر باہر کا دروازہ بند کر دیا۔

میں نے پرزہ اٹھایا، لکھا تھا۔ "کل رات دس بجے ہمارے دوسرے پیغام کا انتظار کرو۔"

"لعنت ہے؟" ثریا کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔

"کیا بلی چوہے کا کھیل ہے! کوئی سامنے تو آئے۔" نسیم نے جھنجلا کر کہا۔

"جاوید کو خبر ہے اس آفت کی؟" میں نے ذکیہ سے پوچھا۔

"نہیں، اسے کچھ خبر نہیں، اور میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتی۔"

"عجیب پاگل لڑکی ہو۔ اسے فوراً اطلاع کرو۔ اسی کی وجہ سے تو یہ مصیبت آئی ہے۔"

"نہیں نہیں، اس سے مصیبت بڑھ سکتی ہے۔ نہ جانے وہ لوگ جاوید کے ساتھ کیا سلوک کریں۔" ذکیہ نے خوف زدہ انداز میں کہا۔

تیسری رات مختصر سا پیغام ذکیہ کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے پڑا تھا۔

"دیے ہوئے پتے پر کل رات گیارہ بجے پہنچو، مگر اکیلی ہی آنا۔ خبردار، پولیس یا کسی اور کو اطلاع دینے کی کوشش کی تو......"

موسم ان دنوں خوش گوار تھا۔ گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا اور ہلکی ہلکی بارشیں ہو رہی تھیں۔ لوگ بارشوں کی وجہ سے کمروں میں سو رہے تھے کیونکہ چھت اور صحن میں اوس بہت گرتی تھی۔ ہمارے ہاسٹل سے ان کے دیے ہوئے پتے کا فاصلہ صرف دس منٹ کا تھا۔

پیغام پڑھ کر ہمارا خون کھولنے لگا۔ نسیم کے ہاتھ تو بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ اسے اپنی کراٹے بازی کا کچھ زیادہ ہی زعم تھا۔ لمحہ لمحہ کر کے وقت گزر رہا تھا۔ ذکیہ بہت زیادہ خوف زدہ تھی کہ اب نہ جانے کیا ہوگا؟ ہم لوگ اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے، مگر اس کی دہشت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

رات کو ہاسٹل سے باہر نکلنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ وارڈن کبھی بھی ہمیں اجازت نہ دیتی۔

سوچتے سوچتے یاد آیا کہ ہماری ایک شاگردہ کی مہندی ہے۔ اس نے ہمیں دعوت بھی دی تھی۔ بس پھر اس کارڈ کے ساتھ درخواست لکھ کر وارڈن کو دے دی۔ مہندی کا کارڈ دیکھ کر انہوں نے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ ہم نے سوچا تھا کہ مہندی کی رسم میں ذرا سی شرکت کے بعد وہاں سے نکل لیں گے۔ سو یوں ہمارا پروگرام طے ہو گیا۔

مہندی کی رسم کب ہوئی اور وہاں کیا کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہم بس خالی خالی آنکھوں سے وہ تمام منظر دیکھتے رہے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے نسیم نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم میزبانوں سے معذرت کر کے چلے آئے۔

رات بہت خاموش اور اُداس تھی۔ ذکیہ کو ہم مسلسل ہمت اور دلاسا دے رہے تھے۔

ہم تینوں دیوار کی دوسری طرف سانس روک کر کھڑے ہو گئے۔ ذکیہ نے دروازے پر ٹھیک گیارہ بجے دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا جیسے کوئی دروازے ہی سے لگا کھڑا ہو۔ ذکیہ اندر چلی گئی تو دروازہ بند ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد نسیم نے چپلیں اُتاریں اور میرے گھٹنوں پر کھڑے ہو کر دیوار کی دوسری طرف کود گئی اور باہر کی کنڈی کھول دی۔ ہم لوگ دبے قدموں اندر چلے گئے۔ گیٹ سے برآمدے تک پختہ روش تھی۔ برآمدے کے شروع ہی میں ایک کمرا تھا۔ وہاں سے ذکیہ کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

''توقیر صاحب! میں آپ کے کہنے کے مطابق جاوید سے تعلقات منقطع کر چکی ہوں، اب آپ بھی اپنے وعدے کا پاس کریں۔''

''ہم نے کب انکار کیا ہے! آپ کچھ دیر بیٹھیے تو سہی۔'' جواب میں ایک مردانہ آواز ابھری۔

''نہیں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔''

''اچھا، آپ کی مرضی! یہ لیجیے یہ رہی آپ کی انگوٹھی، گھڑی اور یہ رومال...... اور یہ تصویریں......'' توقیر نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔

''بہت شکریہ توقیر صاحب! ٹھیک ہے آئندہ میں جاوید سے نہیں ملوں گی۔'' ذکیہ کی آواز میں شکست تھی۔

''ایک منٹ...... خاتون! ہماری ایک شرط اور بھی تھی، وہ تو آپ بھولی جا رہی ہیں۔ آپ جاوید سے نہ ملیں مگر...... ہم سے تو ملیں۔'' توقیر نے نہایت سفلی لہجے میں کہا۔

''بکواس مت کرو۔'' ذکیہ بپھر کر بولی۔ ''میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں سمجھے۔ ہٹو میرے راستے سے۔'' وہ غصے سے پھنکاری۔

''واہ واہ!'' توقیر نے طنز کیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم یونہی تمہیں یہ سب لوٹا رہے ہیں؟''

''ذلیل، کمینے، چھوڑو میرا ہاتھ بے غیرت۔'' ذکیہ چیخی۔

یہی لمحہ ہماری کارروائی کا تھا۔ ہم لوگ ایک دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک لمحہ ہی بہت تھا۔ اُس نے چونک کر ہم سب کو دیکھا۔ نسیم نے فوراً ہی آگے بڑھ کر حلق سے خوف ناک آواز نکالی اور زوردار کک اُس کے سینے پر جڑ دی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا مگر میری بھرپور لات نے اسے زمین چٹا دی۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ نسیم نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کے پیٹ میں

دے مارا۔ پھر تو وہ ہم دونوں کے درمیان فٹ بال بن گیا اور جب تک وہ مار کھا کر بے ہوش نہیں ہو گیا ہم نے اسے نہیں چھوڑا۔ ذکیہ نے عالم جنون میں گل دان اُس کی پیشانی پر دے مارا تاکہ اسے یہ واقعہ زندگی بھر یاد رہے۔

اس پوری کارروائی میں بہ مشکل بیس منٹ صرف ہوئے تھے۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہم اسکول میں تھے۔ ذکیہ نے ساری تصویریں اسی وقت جلادیں۔

دو ہفتے گزر گئے۔ اس واقعے کے بعد سے ہم چاروں بہت محتاط ہوگئے تھے۔ کبھی اکیلے نہیں جاتے تھے۔ جاوید ان دنوں گاؤں گیا ہوا تھا۔ وہ نجمہ باجی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ذکیہ آپ سے ملنے آسکتی ہے یا نہیں! نجمہ باجی کا دکھ ہم سب کا مشترک دکھ تھا۔

کچھ دن بعد جاوید واپس آگیا اور اُس نے ذکیہ کو پیغام بھجوایا کہ جتنی جلدی ہو سکے نجمہ باجی سے ملاقات کرلو، چنانچہ ذکیہ فوراً چار دن کی چھٹی لے کر نجمہ باجی کے گاؤں روانہ ہوگئی۔

ہم لوگ ان دنوں بے حد مصروف تھے۔ اسکول میں بچوں کی سالانہ تقریب ہونے والی تھی۔ اس تقریب میں ان کے والدین کو بھی مدعو کرنا تھا۔ چار دن گزر گئے۔ مگر ذکیہ واپس نہ آئی۔ ہمیں تشویش تو ہوئی مگر کام کی زیادتی اور مصروفیت کی وجہ سے بھول گئے۔

......☆☆☆......

دو ہفتے بعد ذکیہ اسکول پہنچ گئی، بے حد اجڑی اجڑی، لٹی لٹی خاموش سی، اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ذکیہ جس دن نجمہ کے پاس گئی تھی۔ نجمہ کی حالت بہت خراب تھی اور وہ شاید ذکیہ ہی کا انتظار کررہی تھی۔ اس کے پہنچتے ہی وہ دکھوں کی دنیا سے منہ موڑ گئی۔

نجمہ باجی کی موت سے وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔ کئی دن تو اسے اپنا ہوش ہی نہ رہا۔ نجمہ کو یاد کر کے وہ مسلسل آنسو بہاتی رہی۔ اس کی ساس اور نندوں نے بھی دکھاوے کو چند ایک آنسو بہائے، پھر سب کچھ معمول پر آگیا۔ ذکیہ نے سوئم کے بعد آنا چاہا تو نجمہ کے سسرال والوں نے روک لیا۔

نجمہ کی ساس نے اس کے مرنے کے ایک ہفتے بعد ذکیہ سے کہا۔ ''اب مرنے والی تو مر گئی اور مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ نجمہ کا چہلم ہو جائے تو تمہارا نکاح تمہارے بہنوئی سے کردیں گے۔ تمہارا اب ہے بھی کون؟ اس طرح تمہیں بھی سر چھپانے کو ایک ٹھکانا مل جائے گا۔''

''کیسا ٹھکانا؟ یہ گھر نجمہ ہی کا کب تھا جو اب مجھے ٹھکانا ملے گا۔ آپ نے تو بھائی اور بھابی کو اطلاع بھی نہیں دی ہے نجمہ باجی کے مرنے کی۔ میں تو خود ہی آگئی تھی، ورنہ آپ لوگ مجھے بھی کب اطلاع کرتے؟''

ذکیہ بہ مشکل ان لوگوں سے جان چھڑا کر اسکول پہنچی تھی۔ اس کا دکھ اتنا گہرا تھا کہ ہم بھی رو پڑے۔ اداسی نے مکمل طور پر ہم سب کو گھیر لیا تھا۔ نجمہ باجی کے ایصال ثواب کے لیے دوسرے دن اسکول میں ہم لوگوں نے قرآن خوانی کرائی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔

اسکول کی تقریب بہت شان دار ہوئی تھی اور اب ہم لوگ تھکن اتار رہے تھے کہ ہاسٹل میں ایک روز جاوید کی باجی آگئیں۔ وہ بے حد خوش اور مطمئن تھیں۔ انہوں نے باتوں باتوں میں ذکیہ کے بھائی اور بھابی کا ایڈریس لے لیا۔ انہوں نے جب جاوید سے ذکیہ کی شادی کی بات کی تو خوشی سے ہم لوگوں نے خوب اُدھم مچایا۔ گانے گائے خوب ہلا گلا کیا۔

دو ہفتے بعد ذکیہ کی انگلی میں جاوید کے نام کی نازک سی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اسی دوران گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں اور ہاسٹل بند ہوگیا۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔

......☆☆☆......

تین ماہ بعد جب ہم اسکول آئے تو ذکیہ کو دیکھ کر خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ وہ تو بالکل گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ کھلا ہوا تر و تازہ گلاب اس کی شادی کے لیے دسمبر کا مہینہ مقرر ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی اور اس کا نکھرا نکھرا تر و تازہ چہرہ دیکھ کر ہم بھی حیران تھے کہ محبت انسان کو اتنا خوبصورت بھی

بنا دیتی ہے۔ انسان کا دل مسرور ہو تو چہرہ خود بہ خود ہی حسین ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

اسکول کھلے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ ذکیہ کو جاوید کا پیغام ملا کہ تمہیں دیکھے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔ اب تو آ کر مل جاؤ۔ ذکیہ فوراً ہی چلی گئی۔ اس سے خود بھی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ہم نے وارڈن سے کہہ دیا کہ نسیم ذکیہ کے ساتھ گئی ہے۔ ان دونوں کو ڈاکٹر سے دوا لینا تھی۔ حالانکہ نسیم اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ ہم لوگ ٹی وی پر ڈراما دیکھنے میں مگن ہو گئے۔

ڈرامے کے بعد وارڈن نے گیٹ کی چابیاں ہمیں دے دیں کہ ذکیہ کے آنے کے بعد لاک کر کے چابیاں میرے کمرے میں پہنچا دینا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ وہ ڈراما دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتیں اور اسٹاف میں سے کسی کو بھی گیٹ کی ذمے داری نبھانے کو کہہ جاتی تھیں۔

وارڈن کے جانے کے بعد ہم لوگوں نے خبرنامہ بھی دیکھ لیا۔ ہمیں ذکیہ کا بے چینی سے انتظار تھا۔ خبرنامہ ختم ہونے کے کافی دیر بعد بھی ذکیہ نہ آئی تو ہمیں فکر ہوئی۔ اسی بے چینی میں ہم لوگ اسے دیکھنے گیٹ تک چلے گئے۔

گیٹ کے پاس پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے باہر کی طرف کوئی کھڑا ہوا ہو۔ میں نے اپنا شک رفع کرنے کو جونہی گیٹ کھولا۔ دھڑام سے کوئی اندر آ گرا۔ میرے منہ سے چیخ نکلتے رہ گئی۔ ثریا بھی لپک کر آگے بڑھی۔ وہ ذکیہ تھی۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے اور وہ گرتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہم اسے کسی نہ کسی طرح اٹھا کر اندر لے آئے۔

ہم تینوں ہی اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نسیم نے جلدی سے دودھ میں گلوکوز ملا کر اسے پلایا۔ بہ ظاہر وہ ہوش میں تھی مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ ہمارے پوچھنے پر وہ ایسے بلک بلک کر روئی کہ ہم لرز کر رہ گئے۔

''آخر ہوا کیا ذکیہ؟'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''میں جیسے ہی ہاسٹل سے باہر نکل کر مین روڈ کی طرف بڑھی مجھے پیچھے سے کسی نے پکڑ لیا۔ ہاسٹل کے ساتھ ہی ایک اسپتال بھی زیر تعمیر ہے۔ وہ مجھے اسی اسپتال کے ایک اندھیرے کمرے میں لے گئے۔ پھر انہوں نے میرے ہی دوپٹے سے میرے ہاتھ پاؤں باندھے اور...... اور......''

اس سے آگے وہ کچھ نہ بول سکی اور اس کا تڑپنا اور بلکنا ہی ہمیں سب کچھ سمجھا گیا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ تو تیر ہی تھا'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''اس ذلیل انسان نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا فری! میں...... میں کیا کروں! میں مر جاؤں گی۔''

وہ چیخ رہی تھی، بلک بلک کر رو رہی تھی، تڑپ رہی تھی اور ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی آبرو، اس کا وقار، اس کی عزت ہم میں سے کوئی بھی واپس نہیں لا سکتا تھا۔

صبح تک ذکیہ کو اتنا تیز بخار ہو گیا کہ لگتا تھا اب وہ نہیں بچے گی۔ بخار کی شدت میں وہ بار بار پانی مانگ رہی تھی۔ میں نے اسکول میں چھٹی کی درخواست بھیج دی۔ اور اس کی تیمارداری میں لگ گئی۔ اس کے دکھ پر میں خود نیم جاں ہو کر رہ گئی تھی۔ بہت ضبط سے خود کو کنٹرول کیا ہوا تھا۔

مائی مجیداں ڈاکٹر کو بلا لائی۔ اس نے چیک اپ کر کے ذکیہ کو دوا دی اور انجکشن لگایا۔ ایک ہی دن میں وہ برسوں کی مریض لگ رہی تھی۔ عزت و آبرو کھو دینے کا صدمہ کم تو نہیں ہوتا۔ ذکیہ نے اسکول سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ تم بھائی اور بھابی کے پاس چلی جاؤ، مگر وہ نہیں مانی اور اپنی آگ میں خود ہی جلتی رہی۔

ہمارے بہت سمجھانے بجھانے سے اس کی حالت قدرے سنبھل گئی۔ اس نے شاید یہ سوچ کر حالات سے سمجھوتا کر لیا کہ بات پھیل گئی تو بدنامی ہوگی۔ اس

کے بعد اس نے بالکل چپ سادھ لی۔ ہم نے سوچا کہ ذکیہ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے گی۔

میں ثریا اور نسیم اپنے طور پر توقیر کے گھر کی طرف بھی گئے مگر ہمیں مایوسی ہوئی۔ دروازے پر بڑا سا تالا لگا تھا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ کرائے دار تھے۔ مکان خالی کر کے جا چکے ہیں۔ ہم لوگ ناکام و مایوس لوٹ آئے۔ جاوید ان دنوں گوجر خان گیا ہوا تھا۔ ہمارے دن بہت بوجھل بوجھل اور اُداس گزر رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی طوفان، کوئی قیامت آنے والی ہے۔ طوفان تو گزر چکا تھا۔ پھر بھی نہ جانے ہمیں ایسا کیوں محسوس ہوتا تھا۔

وہ طوفان اچانک آ گیا۔ ذکیہ کے بھائی اور بھابی اسے لینے آئے تو معلوم ہوا کہ جاوید نے منگنی توڑ دی ہے۔ اس خبر سے ذکیہ مُردوں سے بدتر ہو گئی۔ اب تو وہ پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گئی۔ ہمیں اس پر حیرت بھی تھی اور صدمہ بھی کہ جاوید نے بغیر وجہ بتائے منگنی کیوں توڑ دی۔

ہم لوگ جاوید کی باجی کے گھر گئے تو معلوم ہوا کہ جاوید اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جا رہا ہے اور ممکن ہے وہ مستقل وہیں رہ جائے تو پھر کیوں کسی کے نام کا دم چھلا لگا کر جائے۔

اس کی مفاد پرست طبیعت کا علم تو ہمیں بعد میں ہوا۔ اس لالچی اور خود غرض انسان نے اپنے لالچ میں ایک معصوم لڑکی کو تباہ کر دیا۔ گوجر خان کے ایک سرمایہ دار نے اسے اس شرط پر امریکہ بھجوانے کی ہامی بھری تھی کہ وہ اس کی بیٹی سے شادی کرے گا اور مفاد پرست جاوید نے یہ سودا منظور کر لیا تھا۔ ذکیہ نے اپنی بھابی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ ہم سبھی نے بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ مانی۔ اس کے بھائی اور بھابی ناراض ہو کر واپس چلے گئے۔ اور جاتے جاتے کہہ گئے کہ آئندہ سے ہمارے گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد ذکیہ نے جس حقیقت کا انکشاف کیا اس نے ہم تینوں کو لرزا کر رکھ دیا۔ گو کہ ہمیں پہلے ہی اس بات کا خدشہ تھا، مگر اب معلوم ہوا تو ہم کانپ کر رہ گئے۔ یا خدایا! یہ تیرا کیسا انصاف تھا۔ قصور کس کا اور جرم کس کے نام! ذکیہ کی حالت روز بروز گرتی جا رہی تھی اور اب اسے چکر اور متلی شروع ہو گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد یہ بات نہ صرف اسکول میں، بلکہ پوری کالونی میں پھیلنے والی تھی۔ ذکیہ کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔

میڈم بھی کئی بار ذکیہ سے پوچھ چکی تھیں کہ تمہاری حالت اتنی ابتر کیوں ہوتی جا رہی ہے؟ ہم لوگ میڈم کو اس بات کا یقین دلا چکے تھے کہ ذکیہ کو منگنی ٹوٹنے کا صدمہ ہے اس لیے اس کی حالت غیر ہے۔

ثریا کی باجی لیڈی ڈاکٹر تھیں اور ان دنوں سمندری میں سروس کر رہی تھیں۔ فیصل آباد سے

کبھی ناراض مت ہونا

تمہارے پیار کی خوشبو سے
مہکا ہے مرا جیون
مری آنکھوں میں جتنے خواب ہیں
سارے تمہارے ہیں
تمہاری یاد کے آنسو ستارے ہیں
تمہاری ہر خوشی میں ہے خوشی میری
یہی ہے زندگی میری
یہ تم بھی جانتے ہو ناں!
میں خود کو تم سے ہٹ کر
سوچ سکتی ہی نہیں ہوں
سو اتنی سی گذارش ہے
مجھے جو بھی سزا دینا
مگر مجھ سے
کبھی نارض مت ہونا
یہ تم بھی جانتے ہو ناں!
کہ میری زندگی ہو تم
کبھی نارض مت ہونا

شاعرہ: سعدیہ سیٹھی۔ لندن

سمندری کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اتوار چھٹی تھی۔ ہفتے کی چھٹی کسی تہوار کی وجہ سے ہوگئی۔ ہم لوگ وارڈن سے اجازت لے کر سمندری چلے گئے۔

ثریا کی باجی ثریا کے ساتھ ہم سب کو دیکھ کر پہلے تو بہت خوش ہوئیں۔ مگر جب ثریا نے انہیں صحیح صورت حال سے آگاہ کیا تو ان کا چہرہ بجھ سا گیا۔ وہ حیران پریشان ہماری شکلیں دیکھ رہی تھیں۔ ہمیں افسردہ دیکھ کر وہ بھی افسردہ ہوگئی تھیں۔

ذکیہ کا رنگ ہلدی کی طرح ہو رہا تھا اور وہ بالکل گم صم تھی۔

رضیہ باجی نے کہا۔ ''مجھے سوچنے دو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ تم لوگوں نے یہ بات اپنے تک محدود رکھی ہے۔ خدا دوسروں کا پردہ رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ رات ہم سب نے جاگ کر گزار دی۔ کسی پل چین ہی نہیں آتا تھا۔ ہم سب کے ذہنوں پر منوں وزنی بوجھ تھا ایسے میں نیند کیسے آتی! ساری رات بے کلی میں گزاری۔

امینہ باجی صبح ہی صبح کہیں چلی گئی تھیں۔ ملازمہ نے بتایا کہ بڑی حویلی والوں کی طرف گئی ہیں۔ وہ حویلی وہاں کے ایک بہت بڑے زمیندار مظفر خان کی تھی اور امینہ باجی کی حویلی والوں سے بہت دوستی تھی۔

ہم لوگ سوچوں کے سمندر میں غرق تھے۔ ہمیں اپنی فکر کھائے جا رہی تھی کہ ہمارے گھر والوں کو ہماری ان حرکتوں کا علم ہوگیا تو وہ ہمیں بتا دیں گے کہ جہنم میں جائے ایسی نوکری! یہ تم لوگ کیا چکر چلاتی پھر رہی ہو۔ ذکیہ کی فکر کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی فکر بھی تھی۔

امینہ باجی آئیں تو بے حد خوش و خرم تھیں۔

''کیا ہوا باجی؟'' ثریا نے انہیں خوش دیکھ کر پوچھ ہی لیا۔

''بس یوں سمجھو، مسئلہ حل ہوگیا۔'' انہوں نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سچ باجی!'' ثریا خوش ہوگئی۔ آخر آپ ذکیہ کو اس مصیبت سے نجات دلانے پر راضی ہو ہی گئیں۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو ثریا!'' امینہ باجی نے کہا۔

''یہ قتل ہے یہ میں نہیں کر سکتی اور تم لوگ مجھے اس پر مجبور بھی نہ کرنا۔ اس کے علاوہ اس میں جان کا خطرہ اس بھی ہوتا ہے۔ جب میں ڈاکٹر بنی تھی تو یہی عہد کیا تھا کہ غلط کام کبھی نہیں کروں گی۔'' ان کی بات سے ہم سب کے چہرے اتر گئے۔

''تم ادھر آؤ اور میری بات غور سے سنو۔'' امینہ باجی ثریا کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

جتنی دیر وہ اندر رہیں، ہماری جان سولی پر لٹکی رہی۔ واپس آ کر ثریا منہ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسے اُداس دیکھ کر ہمارے چہرے بھی لٹک گئے۔ امینہ باجی نے یقیناً اس سے معذرت چاہ لی تھی جبھی وہ اتنی دل گرفتہ نظر آ رہی تھی۔ ہم سب کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اب کیا ہوگا۔

امینہ باجی اپنے کلینک چلی گئی تھیں۔ وہ کلینک سے لوٹیں تو ہم سب کو ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ اختر بڑی حویلی والوں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ پڑھا لکھا اور سمجھ دار لڑکا ہے۔ اس کی شادی کو چار سال ہوگئے ہیں لیکن اولاد نہیں ہوئی۔ اولاد کے لیے اُس کی والدہ اب دوسری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ میرے کہنے پر اختر نے میڈیکل چیک اپ کروایا تھا۔ اس کی بیوی میں کوئی خامی نہیں ہے، لیکن اختر باپ نہیں بن سکتا۔ یہ راز صرف اختر اور مجھے معلوم ہے۔ اگر ذکیہ اختر سے آج رات نکاح کر لے تو ہونے والے بچے کا باپ اختر ہی کہلائے گا۔ اس طرح اختر کو وارث بھی مل جائے گا اور ذکیہ بھی بدنام ہونے سے بچ جائے گی۔ میں نے اختر کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ اس حالت میں بھی ذکیہ سے شادی کرنے کو تیار ہے۔ اگر ذکیہ راضی ہو تو میں اختر سے حتمی بات کروں۔ اختر کو آج ہی ہاں یا نہیں میں جواب دینا ہے۔ نکاح میرے ہی گھر میں ہوگا۔ کچھ دنوں کے بعد اختر اپنی ماں کو بتا دے گا کہ اس نے شادی کر لی ہے۔ اس کی پہلی بیوی اسے دوسری شادی کی اجازت پہلے ہی دے چکی ہے۔

میں، نسیم اور ذکیہ سانس روکے امینہ باجی کی بات سن رہے تھے۔ یا اللہ! یہ کیا چکر ہے۔ قدم قدم پر نیا انکشاف، نئی بات، نیا سمجھوتا! میں نے ذکیہ کی طرف دیکھا تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ہم نے اسے جلدی سے بستر پر لٹایا اور امینہ باجی نے فوراً ایک انجکشن دیا۔

وہ ہوش میں آئی تو پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے آنسو دیکھ کر ہم سب پریشان ہو گئے۔ رو رو کر وہ نڈھال ہو گئی۔ ہم نے بھی اسے رونے دیا۔ ہم بھی نے اسے سمجھایا۔ امینہ باجی نے دلاسا دیا۔ پھر اپنی بدنامی کے خوف سے وہ اس نکاح کے لیے تیار ہو گئی۔

رات کو جب میں نے اُسے دلہن بنایا تو وہ سکتے کی سی حالت میں تھی۔ اختر گواہ اور مولوی صاحب کو لے کر آ گیا۔ امینہ باجی نے سرپرست کی حیثیت سے ذکیہ کا نکاح کروایا۔ حق مہر میں اختر نے ایک لاکھ روپے نقد اور ایک مکان ذکیہ کے نام کر دیا تھا۔ اختر کافی ذہین اور مہذب لگ رہا تھا۔ ذکیہ کے ساتھ روتے روتے میری حالت بھی ابتر ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میرے آنسو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

یہ کیسی شادی تھی، نہ ڈھولک بجی، نہ گانے گائے نہ مہندی سجی وہ ذکیہ جو دوسروں کی شادی کی محفلوں کی رونق ہوا کرتی تھی۔ اس کی لوچ دار آواز اور ڈھولک گیت شادی بیاہ کے رنگوں میں سب سے نمایاں ہوتے تھے۔ آج اس کی شادی کس حال میں اور کتنی خاموشی سے ہوئی تھی۔ گھر میں اتنا سناٹا تھا جیسے کسی کی موت واقع ہو گئی ہو۔ میں اور امینہ باجی ساری رات بے معنی گفتگو کرتی رہیں۔ نہ جانے کب اور کیسے ہمیں نیند آ گئی۔

صبح سویرے امینہ باجی، ذکیہ کے پاس چلی گئیں۔ اختر جا چکا تھا۔ شادی کا جوڑا اور زیورات بھی وہی لایا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی مانگ کی افشاں چمک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر بھی چمک تھی اور وہ زندگی سے بھرپور لگ رہی تھی۔ اختر نے اسے اعتماد بھروسا جو بخش دیا تھا۔ وہ امینہ باجی کے گلے لگ کر کتنی دیر تک روتی رہی۔

''کیا بات ہے ذکیہ! میرے فیصلے سے تمہیں دکھ پہنچا ہے۔'' باجی نے پوچھا۔

''آپ کے فیصلے نے تو مجھے میری منزل پر پہنچا دیا ہے باجی۔'' ذکیہ نے روتے ہوئے کہا۔

''پھر یہ رونا دھونا کیسا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ آنسو تو تشکر کے آنسو ہیں فرحی!'' ذکیہ نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

......☆☆☆......

دوپہر کو اختر گاڑی لے کر آ گیا۔ میں اور ذکیہ، اختر کے ساتھ شہر آنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ذکیہ کے چہرے پر اتنی پاکیزگی اور نکھار نہ جانے کہاں سے امنڈ آیا تھا۔ باجی نے ہمیں بہت ہمت محبت سے رخصت کیا۔ انہوں نے ذکیہ کو چھ جوڑی کپڑے اور سونے کا لاکٹ دیا تھا۔

پھر کچھ عرصے بعد ذکیہ نے ملازمت چھوڑ دی اور اپنے گھر بار میں مصروف ہو گئی۔ نسیم کے والد نے اسے ہاسٹل سے واپس بلا لیا۔ اس کا منگیتر جرمنی سے لوٹ آیا تھا۔ ثریا کا ٹرانسفر ہو گیا۔ ہم سب تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ گئے۔ ذکیہ کے جانے سے میں بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ کبھی کبھار میں ذکیہ سے ملنے چلی جاتی تھی۔ وہ بہت خوش تھی اور خوشی اس کے روئیں روئیں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اختر اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ دو ماہ بعد ذکیہ کی سسرال والے بھی راضی ہو گئے۔ وہ بیٹے اور بہو کو اپنے گھر لے گئے تھے۔

پھر وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا اور غیر محسوس طریقے پر بہت سا وقت گزر گیا۔ اس دوران میں ذکیہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ اختر جی جان سے اس پر فدا تھا اور وہ سسرال والوں کی بھی آنکھ کا تارا تھی۔ اسے خوش و خرم دیکھ کر مجھے بھی انتہائی خوشی ہوتی تھی۔ انہی دنوں میرے رشتے کی بات چلی اور جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے تحت میں حیدر آباد چلی گئی۔ میرے میاں ان دنوں حیدر آباد ہی میں تھے۔ کبھی کبھار ذکیہ، نسیم اور ثریا اور سب کی باتیں یاد آتیں تو گھنٹوں میں ان میں کھوئی رہتی۔ اسکول چھوڑنے کے بعد ان سے میرا رابطہ ہی نہیں رہا تھا۔ پھر میں گھرداری

میں ایسی گھری کہ کچھ یاد ہی نہ رہا۔ میں نے کئی بار فیصل آباد جانے کی کوشش کی مگر گھرداری کے جھمیلوں سے فرصت ہی نہ ملی۔ ہر سال پروگرام بناتی تھی کہ اس دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ضرور فیصل آباد جاؤں گی۔ بچے اسکول میں پڑھ رہے تھے اس لیے جانا اور بھی مشکل تھا، مگر میرے سارے پروگرام آئندہ سال پر ٹلتے چلے گئے اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ برس بیت گئے۔

پندرہ سال کا عرصہ خاصا طویل ہے مگر آنکھ بند کروں تو خواب سا لگتا ہے۔ پچھلے ہفتے میری فیصل آباد جانے کی خواہش اچانک پوری ہوگئی۔ میرے میاں کی پھوپی کی بیٹی کی شادی تھی اس لیے اب تو وہاں جانا ناگزیر تھا۔

ایک مدت کے بعد میں فیصل آباد آئی تو بچپن اور لڑکپن کی کتنی ہی باتیں کتنی ہی یادیں پھر سے تازہ ہوگئیں۔ میرا بہت دل چاہ رہا تھا کہ ذکیہ سے مل لوں کیونکہ وہ تو فیصل آباد ہی میں تھی، مگر شادی کی مصروفیات بہت تھیں۔ پھوپی سینٹرل جیل میں خواتین کے وارڈ کی انچارج تھیں۔

ایک دن وہ شاپنگ کے لیے نکلیں تو مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ انہیں تھوڑی دیر کے لیے پہلے آفس جانا تھا۔ جیل پہنچ کر نہ جانے مجھے کیوں قیدی عورتوں کو دیکھنے کا تجسس بیدار ہوگیا۔ میں نے پھوپی سے کہا تو وہ مجھے اپنے ساتھ قیدی عورتوں کی بیرکوں کی طرف لے گئیں۔ وہ مختصراً ہر عورت کے جرم کے بارے میں بتاتی جارہی تھیں۔

باتیں کرتے کرتے اچانک میں ٹھٹک کر رہ گئی...... وہ چہرہ تو میں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ وہ ذکیہ تھی۔ میں لپک کر سلاخوں کے قریب پہنچ گئی۔ ہاں وہ ذکیہ ہی تھی۔ اُجڑی اُجڑی سی لاغر اور کمزور ذکیہ ویران ویران آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے اجنبیت تھی، پہچان کا شائبہ تک نہ تھا۔

پھوپی میری بے چینی دیکھ کر حیران تھیں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ یہ کون ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ میرے ساتھ اسکول میں پڑھاتی تھی۔

پھوپی نے بتایا کہ یہ دس سال سے قتل کے جرم میں یہاں ہے۔

میں نے اسے نام لے کر آوازیں دیں مگر اس نے مجھ سے کوئی بات کیے بغیر منہ پھیرلیا۔ جیل کے ریکارڈ سے میں نے ذکیہ کی فائل دیکھی تو حقیقت کا علم ہوا۔

دس سال پہلے اس کے بیٹے کی سالگرہ ہو رہی تھی۔ پوری حویلی مہمانوں سے بھری ہوئی تھی۔ رات کو رقص موسیقی کی محفلیں اپنا رنگ دکھا رہی تھیں۔ اس رات گرمی بہت تھی۔ ذکیہ ہنگامے سے اُکتا کر اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ ہوا کی خاطر کھڑکی میں کھڑی تھی کہ اچانک توقیر اس کے سامنے سے گزرا۔ توقیر کو سامنے دیکھ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔ اس نے کمرے کی دیوار پر لٹکی ہوئی رائفل اتاری اور جنون کے عالم میں کئی گولیاں توقیر کے جسم میں اُتار دیں۔ توقیر نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔

میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ میرے ہاتھ پیر سنسنا رہے تھے اور کانوں میں ذکیہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔''

'فرحی! زندگی کے کسی موڑ پر مجھے باپ نظر آ گیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں اپنے دامن پر لگے ہوئے اس داغ کو اس کے خون سے دھوؤں گی۔ جب تک میں اسے جہنم رسید نہیں کردوں گی فرحی مجھے موت نہیں آئے گی۔'

اس نے اپنے دامن پر لگا ہوا داغ توقیر کے خون سے دھولیا تھا۔ مگر کیا وہ داغ واقعی دھل گیا تھا۔ کیا ذکیہ نے واقعی اس سے انتقام لے لیا تھا۔ یا اس نے خود اپنے آپ سے انتقام لیا تھا۔ خسارے میں تو اب بھی وہی تھی۔

جب اختر سے ذکیہ کی شادی ہوئی تھی تو ہم سبھی نا سمجھ تھے۔ ہمیں علم نہیں تھا کہ جب تک ذکیہ ماں نہ بن جاتی اختر سے اس کا نکاح جائز نہیں تھا۔ لیکن ایسا ہوگیا تھا۔ قصوروار ذکیہ تھی؟ امینہ باجی تھیں؟ اختر تھا؟ یا ہم سب؟ یہ سوالات اب بھی کبھی کبھی مجھے مضطرب کردیتے ہیں۔

☆☆......☆☆

عشق زادے۔2

ایڈیسن ادریس مسیح

آج کی وہ تلخ حقیقت جسے ایڈیسن ہی کا قلم زندگی دے سکتا تھا۔ تیسری انعام یافتہ کہانی

اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں ..... اور دماغ سوچ رہا تھا۔

وہ دونوں بھاگتے ہوئے کیمسٹری کی لیب میں گھس آئے تھے۔ پرما نے لیب کی کنڈی لگا دی۔ زویا ایک بینچ کے ساتھ کمر ٹکا کر اپنی سانسیں سنبھال رہی تھی کچھ فاصلے پر ہانپتے پرما نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا۔

''ہو گئی عید مبارک مل گئی عیدی۔ بڑا confidence تھا تجھے تیری فیملی پر..... نہ کھیر نہ مٹھائی، سالوں نے پانی تک نہیں پوچھا بھگا بھگا کے عید کی ماں بہن ایک کر دی اس چکر میں میرے والوں کو بھی پتا چل گیا ہوگا اور مناؤ پپی عید، پپی عید۔''

زویا نے ایک نظر پرما کی طرف دیکھا اور پھولی سانسوں کے ساتھ کہا۔

''کو ٹھے پر ہی رہنا چاہیے تھا۔''

پرما نے زویا کی طرف دیکھا۔ زویا کی آنکھوں میں آنسو تھے پرما نے اس کو رونے سے منع کیا تو اس نے بہانہ گھڑا۔

''آنسو نہیں ہیں، کیمیکل سے جلن ہو رہی ہے۔''

پرما طنزیہ انداز سے ہنس کر بولا۔

''ابو نے جو بندوق تانی اس سے تو تجھے ہنسی آ رہی ہوگی، آنسو تھوڑی آتے ہیں۔''

اس کی آنکھیں یہ دیکھ کر مسکرا اٹھیں لیکن اگلے ہی لمحے مسکراہٹ کی جگہ دکھ ہلکورے لینے لگا۔ اس کا دل زویا کی دلگیر آواز پر بوجھل ہو گیا۔ کتنا شکوہ تھا اس کے لہجے میں..... اس نے کہا تھا۔

''ہاں اس سے ہنسی آتی ہے۔''

پرما بھی اس کے گلو گیر لہجہ سن کر تڑپ اٹھا اور اس کے پاس آ کر بولا۔

''سچ میں کیمسٹری سے جلن ہو رہی ہے۔''

زویا پرما کی سادگی پر مسکرائے بنا نہ رہ سکی اور ایک ادا سے بولی۔

''Topper ہوں کیمسٹری میں..... فرسٹ ائیر، سیکنڈ ائیر ہنڈرڈ آؤٹ آف ہنڈرڈ..... تھرڈ ائیر میں بھی ہنڈرڈ آئے ناں تو گولڈ میڈل ملے گا۔''

پرما جانتا تھا کہ اس کے باپ کا بہت اثر و رسوخ اور سیاسی شہرت ہے اس لیے شرارت سے بولا۔

''تیرے ابو نے پرنسپل سے کہہ کر دلوا دیے ہوں گے۔''

اپنے باپ کا نام سن کر زویا دکھی ہو گئی اور ہلکے غصے سے بولی۔

''ابو کا نام مت لے۔''

چند لمحے کی خاموشی دونوں کے بیچ طاری ہوئی اسی خاموشی کے بیچ پرما نے محسوس کیا کہ اس نے اس موقع پر زویا کے باپ کا ذکر کر کے اسے دکھی کر دیا ہے اس لیے وہ اس کے پاس آ کر کھڑا ہوا اور اس کے کندھے سے کندھا مار کر کہنے لگا۔

''سوری ناں..... وہ کیا ہے ناں کہ پہلی بار کسی ہنڈرڈ مارکس والی سے ملا ہوں ناں ..... بلیو ہی نہیں ہوتا..... تُو صحیح ہے ہاں..... گولڈ میڈل ہنڈرڈ آؤٹ آف ہنڈرڈ۔''

زویا پرما کی اس ادا پر مسکرا اٹھی۔ پرما بھی مسکرا اٹھا۔ ان دونوں کو مسکراتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

''مجھے ناں کیمسٹری بہت اچھی لگتی ہے اور بیسٹ تو لیب..... سارے کیمیکلز کی سمیل بھی۔''

زویا اپنے ہی ٹرانس میں بولتے بولتے ایک ٹیبل پر رکھے ایک فلاسک کے پاس آ گئی اور اس کو چھوتے ہوئے پرما سے کہنے لگی۔

''یہ پتا ہے کیا ہے۔ کاپر سلفیٹ۔''

اب پرما کی طرف دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''تو بھی فرسٹ ائیر میں ہے ناں۔''

''ہوں۔'' پرما نے بے پروائی سے کہا زویا نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''کتنے سال سے ہے۔''

''پانچ ..... اب تُو آ گئی ہے ناں مس گولڈ میڈل۔ کروا دے پاس فرسٹ ائیر۔''

پرما کے انداز میں بار بار فیل ہونے پر ذرا شرمندگی نہیں تھی۔ وہ تو بس عشق کا درپیش امتحان پاس کرنا چاہتا تھا۔ زویا نے اس کے اس لاپرواہ انداز پر صدقے واری جانے والے انداز سے اس کی طرف

دیکھا اور زویا نے اس کا تمتماتا چہرہ اپنے نازک ہاتھوں میں لے کر بولی۔
"تو اب تمہیں پاس کروانے کی ذمہ داری بھی میری۔"
پرما نے زویا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ ہنستے ہوئے اس کی بانہوں میں سمٹ آئی۔ پرما نے اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں زویا کو سختی سے دبوچ لیا۔
اس کی آنکھیں جھپکانا بھول چکی تھیں۔ پرما ہندو تھا اور زویا مسلمان۔ لیکن اب یہ فرق مٹ چکا تھا۔ دونوں مذہب اور معاشرے کی حدیں پار کر کے ایک دوسرے کی بانہوں میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ محبت کا یہ عالم دیکھ کر اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے تھے۔ یکایک اسے زویا کے باپ اور پرما کے دادا سے سخت نفرت محسوس ہونے لگی۔ اسے ایسا لگنے لگا کہ اس کا باپ بھی ایسا ہی ہے ضدی کٹھور ... محبت کا دشمن ... انا کا قیدی۔
اس کی ذہنی رو بھٹکنے لگی۔ اس کو اپنے باپ سے بھی نفرت محسوس ہونے لگی۔
پرما نے ابھی تک زویا کو اپنی بانہوں میں دبوچا ہوا تھا۔ اس کی بھی بانہیں تڑکنے لگیں، بے اختیار اس نے اپنی بانہوں کی طرف دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے کالج کے احاطے میں گاڑیوں کے ٹائر چرچرانے لگے۔
پرما اور زویا تیزی سے الگ ہوئے اور گھبرا کر لیب کی کھڑکی کی طرف دوڑے تھے، جہاں سے نیچے کا منظر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ نیچے دو کھلی جیپوں، ایک پرانے ماڈل کی سرخ گاڑی اور دو تین موٹر بائیکس پر لدے پرما اور زویا کے خون کے پیاسے لوگ وحشی درندوں کی طرح کودے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے مخالف پارٹی کے بندے سے کہا۔
"تم نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔"
اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ آنکھیں پھیلنے لگیں اور دماغ سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا۔"
لیکن پرما نے استہزائیہ انداز میں زویا کی طرف دیکھ کر کہا۔
"کیا بات ہے۔ یہ تو عید ملن ہو رہا ہے۔"
اور ایسا ہی ہوا ... زویا کے باپ نے مصالحتی انداز سے کہا تھا۔
"ہندو قیس بچی کرو ... یہ دونوں حرام جاوے اگر جندہ رہے تو ان کا عشق ہمارے پولیٹیکل کیریئر کو ہمیشہ کے لیے مار دے گا۔ اگر ان کے عشق کا معاملہ فانٹ نہ دبایا گیا تو ان کے عشق کی آگ بھڑک جائے گی۔ ہمارے تمہارے لوگ مل کر گھیر لیں تو فانٹ کھیل ختم۔"
یہ تجویز مان لی گئی تھی اب وہ سب مل کر ان دونوں کو مارنے والے تھے۔
"چلو مل کر گھیر لو ... ہم لوگ سائنس کی طرف سے جاتے ہیں تم لوگ ہسٹری کی طرف سے آجاؤ۔"
پرما اور زویا بھی سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے ان دونوں کو مارنے کے لیے ان دونوں کے خاندان ایکا بھی کر سکتے ہیں۔
دونوں حیران پریشان ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔ لیکن وہ ... اس کی تو حیرت کی انتہا ہی نہیں رہی تھی۔ محبت کا قتل عام کرنے کے لیے کیا ظالم سماج باہمی مذہبی اور معاشرتی اختلافات بھلا کر ایک بھی ہو سکتا ہے۔"
اس کے معصوم ذہن نے سوال کیا تھا اس کو یاد آنے لگا اس کو اسکول میں دو قومی نظریہ پڑھایا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والی لسانی، مذہبی اور معاشرتی تفریق کی بناء پر ہندوستان میں آزادی کی تحریک چلائی گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ جب سے اس نے یہ پڑھا تھا اس کو یہی لگتا تھا کہ یہ دونوں قومیں کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتیں لیکن آج اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کس طرح دونوں قوموں کے "بڑے" گٹھ جوڑ کر کے اپنے "بچوں" کا خون پینے والے تھے۔
لیکن پرما نے شکر ادا کیا تھا کہ ان دونوں کی وجہ سے آج برسوں پرانا تعلق بحال ہونے جا رہا تھا۔ اس نے زویا کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف بھاگتے ہوئے کہا۔
"ہمارے پیار کا ایک تو فائدہ ہوا۔ ان کی بھی ہو

گئی پارٹنر شپ ۔''

اس کی سانسیں رکنے لگی تھیں منظر کی دہشت اس کے سراپے میں دوڑنے لگی تھی۔ ماڈرن ہیر رانجھا ازلی کمینوں سے بچ کر بھاگ رہے تھے۔ کالج کی نیم تاریک راہداریوں پر بھاگتے ان کے قدم آنے والی نسلوں کے لیے روشن پیغام چھوڑ کر جانے والے تھے۔

اس نے دل سے دعا کی کہ ان کو کچھ نہ ہو۔ لیکن اس کی دعا ئیں ٹی وی کی اسکرین سے ہی ٹکرا کر رہ گئی تھیں۔ آدھے لوگ سائنس ڈیپارٹ کی طرف ان پر ہلا بولنے والے تھے اور باقی ہسٹری ڈیپارٹ کی طرف سے۔ ان دونوں کے بھاگنے کی کوئی جاء نہیں تھی۔ ان پر فائرنگ شروع کر دی گئی۔ پرما زویا کا ہاتھ پکڑ کر محفوظ مقام کی طرف بھاگ رہا تھا شاید وہ اسے کسی جگہ چھپا کر مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن زویا موت کی اس وادی میں آخر تک اس کا ساتھ دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ پرما کے ہاتھ سے چھڑایا اور تیز آواز سے کہا۔

''پرما پسٹل دو۔''

پرما کے پاس دو پستولیں تھیں ایک اس نے زویا کو دے دی اب دونوں مل کر مقابلہ کر رہے تھے۔ دو طرفہ فائرنگ کا تبادلہ جاری تھا۔

قریب تھا کہ وہ دونوں نکل کر بھاگ جاتے لیکن ان کے گرد گھیرا تنگ ہو چکا تھا۔ دونوں بہت گھبرائے ہوئے تھے لیکن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے یکا یک پرما کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور اس نے زویا کا بازو کھینچ کر ایک کلاس میں دھکیل دیا اور خود بھی تیزی سے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور کنڈی چڑھا دی، دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جائے اور اُن کی مدد کرے۔ اس کا دل اس کے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ اگر یہ صورتِ حال پیش آ گئی تو وہ کیا کرے گا؟

راہداری میں دونوں طرف سے دشمن بھاگتے آئے تھے کسی ایک نے آواز لگا کر کہا۔

''یہیں ہیں اسی کمرے میں۔''

سب اس کمرے کے بند دروازے پر ہی پل پڑے تھے۔ دروازے میں جڑے ٹوٹے شیشے میں ہاتھ ڈال کر کوئی اندر فائرنگ کرنے لگا تو کوئی دروازے کو لاتیں مارنے لگا۔ ایک لمحے کو تو اس کو لگا کہ اب دروازہ کھلا تو اس کی بدنصیب آنکھوں کے سامنے عشق زادوں کی لاشیں پڑی ہوں گی۔ لیکن یہ کیا؟ دروازے پر پڑنے والی زوردار لات دروازہ توڑ چکی تھی۔ مگر وہ دونوں غائب تھے۔

سارے دوست جو ایک دوسرے کے دشمن بھی تھے لیکن وقتی ضرورت کے تحت اب دوست بنے ہوئے تھے تلملا اٹھے۔ ان کے ساتھ ساتھ اس نے بھی دیکھا ایک ڈیسک کے اوپر دو ڈیسک کھڑے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ وہ دونوں ڈیسکوں کی سیڑھی بنا کر روشن دان سے باہر کود چکے تھے۔

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور ہونٹ مسکرانے لگے دل نے بے ساختہ کہا۔

''واہ مزہ ہی آ گیا۔''

دشمن لات کھائے کتے کی طرح تلملا کر ان دونوں کی بو سونگھتے ہوئے کالج کی چھت کی طرف بھاگے تھے۔ چھت پر پرما اور زویا دوسری طرف نکل چکے تھے اور کسی دیوار کی اوٹ کے پیچھے چھپ کر فائرنگ کر رہے تھے۔ زویا اپنے باپ بھائیوں پر فائرنگ کر رہی تھی۔ پرما بھی اپنے ہی بھائیوں پر گولیاں برسا رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن اس طرف آیا ہی نہیں وہ تو چاہتا تھا کہ سب کے سب اس جھڑپ میں مارے جائیں۔ پرما اور زویا بچ جائیں، دونوں کی شادی ہو جائے۔ کیا ہوا اگر ایک ہندو اور دوسرا مسلمان ہے تو۔ محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لا مذہب تو ان دونوں کے گھر والے ہیں جو پیار کرنے سے روکتے ہیں۔ پیار کرنا تو انسانی فطرت ہے فطرت سے منہ تو نہیں موڑا جا سکتا نا۔ اس نے سوچا۔ پتا نہیں کیوں یہ بات لوگوں کو سمجھ نہیں آتی۔ لوگوں کو مار دو گولی سمجھیں نہ سمجھیں اسے کیا؟ اس کے ماں باپ کو تو سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ اپنی کلاس فیلو کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا اچانک ہی اسے وہ بہت یاد

آنے لگی تھی اسے محسوس ہوا کہ اس کے والدین بھی پرما اور زویا کی طرح ان کا ملن نہیں ہونے دیں گے۔

زویا کی پستول میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں، اس نے پرما کی طرف دیکھ کر چلا کر کہا۔

''پرما گولیاں دو۔''

پرما نے اپنی جیکٹ کی جیب سے گولیاں نکال کر اس کو دی تھیں۔ صرف دو گولیاں۔

''اور دے نا کنجوس۔''

سر پر موت ناچ رہی تھی لیکن زویا کی شوخی برقرار تھی۔ پرما نے بھی اسی انداز سے جواب دیا۔

''یہی ہیں..... جو تمہیں ساری دے دیں۔''

زویا دو گولیاں ہاتھ میں پکڑے سوچ رہی تھی کہ اپنے خاندان کو مارنے کے لیے یہ گولیاں ناکافی ہیں ادھر ان کے پاس بہت سا بارود تھا۔ تڑاتڑ فائرنگ ہو رہی تھی لیکن ابھی تک وہ بچے ہوئے تھے۔ پرما ابھی تک ہمت ہارے بغیر لڑ رہا تھا۔ زویا ہاتھ میں پکڑی دو گولیوں پر لکھی اپنی موت پڑھ رہی تھی۔ اچانک اس نے پوچھا۔

''کتنا پیار کرتے ہو مجھ سے۔''

''کوئی ٹائم ہے پوچھنے کا۔'' پرما نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''بولو ناں۔'' زویا بضد تھی۔

''جان دے دوں گا تیرے لیے۔'' پرما نے مخالف سمت سے آنے والی گولی سے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے کہا۔ زویا مسکرائی اور بولی۔

''جان لے سکتے ہو میری۔''

یہ سن کر پرما چونک گیا۔ چڑ کر بولا۔

''باؤلی ہوئی ہے کیا۔''

زویا پر تو کوئی اور ہی دھن سوار تھی۔

''ان کے ہاتھوں مرنے سے تو اچھا ہم خود ہی ایک دوسرے کو ماردیں۔ اماں بولتی تھی ناں کہ ہار کے مرنے کا کیا فائدہ۔''

زویا کی یہ بات سن کر پرما تڑپ اٹھا، تیزی سے اس کے پاس آیا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔

یاد رکھنے کی باتیں

☆ ہر نماز کے بعد 3 بار کلمہ پڑھو اور یہ مانگو کہ یا اللہ یہ کلمہ تیرے پاس میری امانت ہے اور مرنے سے دو منٹ پہلے یہ مجھے لوٹا دینا۔

☆ اللہ کے خوف سے گرنے والا آنسو بے شک چھوٹا کیوں نہ ہو مگر اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ سمندر کے برابر گناہ مٹا دیتا ہے۔

☆ مشکلات ہمیشہ بہترین لوگوں پر آتی ہیں کیونکہ وہ ان مشکلات کو بہترین طریقے سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

حسن خیال: راز عدن۔ بحرین

''زویا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ان سب کو تو میں یوں نپکا دوں گا۔ پانچ منٹ میں اسٹیشن پہنچ جائیں گے، دس منٹ میں ٹرین آجائے گی۔''

ہم یہ شہر ہی چھوڑ دیں گے۔ تیرے ابو اور میرے دادا سے دور۔ تو وہاں کی ایم پی اے بن جانا میں دکانداری کرلوں گا۔ مل کر کریں گے نا کوئی جگاڑ۔ پھر بچے بھی تو ہوں گے چھوٹے چھوٹے۔ چھوٹی زویا۔ چھوٹا پرما۔''

زویا مسکرا اٹھی کوئی گولی ان کے بالکل پاس سے گزری تھی لیکن وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہو چکے تھے ایسا لگتا تھا کہ ان کو ایک دوسرے کے علاوہ اب کچھ بھی یاد نہیں رہا۔

یہ سب دیکھ کر اس نے سوچا پیار کرنے والے ایسے ہی تو ہوتے ہیں اسے بھی تو جب اس کی کلاس فیلو سامنے آتی ہے تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

زویا کو پرما کی بات سمجھ نہیں آئی اس نے اختلاف کیا۔

''رہنے دو بچے۔ ورنہ ان کو بھی بچپن سے سکھانا پڑے گا اپنی ذات میں پیار ڈھونڈیں۔ دوسرے کی ذات میں ہوگئی محبت تو رائتہ پھیل جائے گا۔''

''نہیں یار ہم انہیں کھلی چھوٹ دیں گے، جس سے چاہو جب چاہو پیار کرو۔''

پرما اب بھی پرامید تھا لیکن زویا جان چکی تھی کہ

اب موت بہت قریب آ چکی ہے مرنا تو تھا ہی لیکن وہ کسی اور کے ہاتھ سے مرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے پرما سے دوبارہ کہا۔

''چلاؤ ناں۔''

پرما روہانسا ہو گیا۔

''کیسے ماردوں! پیار کرتا ہوں تجھ سے نفرت نہیں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں مجھے پیار کے ہاتھ مرنا ہے، انہوں نے ماردیا تو نفرت کی جیت ہو جائے گی۔ عشق زادے ہیں عشق کو ہی جتائیں گے۔''

بات پرما کے بھی دل کو لگی تھی۔ اس کے ہونٹ مسکرانے لگے، پرما بھی مسکرا اٹھا۔ اور وہ...... ایک گیلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بھی آ گئی تھی۔ زویا نے پسٹل میں گولیاں ڈالیں اور پرما کے مدمقابل کھڑے ہو کر اس کے پیٹ کے داہنی طرف پسٹل جما دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی پستول کی نالی اپنے پیٹ پر رکھ دی اور عشق کی جیت سے سرشار لہجے میں بولی۔

''چلاؤ میرے ضدی۔''

پرما نے منہ آسمان کی طرف کیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ اب زویا نے بھی فائر کر دیا۔ دونوں نے دو دو گولیاں ایک دوسرے کو ماریں اور ڈھیر ہو گئے۔

دونوں کی لاشیں آمنے سامنے پڑی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں لیکن وہ رو پڑا تھا۔ محبت کا یہ انجام بھی ہو سکتا تھا۔

دشمن لاشوں کے سر پر پہنچ چکے تھے اور ان کی موت کی تصدیق کر کے واپس مڑ گئے تھے۔

وہ رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں نے آنسوؤں کی دھند کے پار دیکھا ٹی وی کی اسکرین پر دیکھا۔ لکھا تھا۔

More than a thousand Ishaqzade like parma and zoya are punished with brutal death in our country every year.their only sin: falling in love out side their religion or caste......

اس نے ٹی وی بند کیا اور اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کا دل بری طرح بوجھل ہو چکا تھا۔

وہ رات اس پر بہت بھاری تھی، اس کی آنکھیں دکھ چکی تھیں لیکن ذہن مسلسل سوچ رہا تھا۔

اس کا ذہن باغی ہونے لگا۔ اس کے معصوم ذہن نے سوچ لیا، پورا پلان بنا لیا۔

اگلے دن اس نے اور اس کی معشوقہ نے خود کو پرما اور زویا کی طرح ہلاک کر کے عشق کا نام بلند کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے اسکول کے اندر ہی خودکشی کر لی۔

عشق کا پرچم بلند ہو گیا تھا۔

تہذیب کا خون ہو گیا تھا۔

ارمانوں کا خون کلاس روم میں بکھرا پڑا تھا۔

والدین کے سر شرم سے جھک گئے تھے۔ عشق کا سر فخر سے بلند ہو چکا تھا۔

پوری قوم کی روح کانپ گئی تھی۔

سوشل میڈیا پر یہ خبر وائرل ہو گئی تھی۔

فیس بک پر بہت ساری لائیکس آئی تھیں۔ لوگوں نے اس خبر کو تصویروں کے ساتھ share کیا تھا۔

دھڑا دھڑ کمنٹس آ رہے تھے۔ ٹی وی والوں کو چٹ پٹی خبر مل گئی تھی۔ مارننگ شوز میں رونق ہو گئی تھی۔

ان دو کم سن بچوں کی لاشیں کفن میں نہیں سوالوں کی دبیز چادروں میں لپیٹ کر سپرد خاک کی گئی تھیں۔ لاشیں سپرد خاک ہو گئی تھیں مگر سوال تو مٹی کے اندر نہیں دبایا جا سکتا۔ سوالوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ ایسے واقعات کے جڑ پکڑنے کے لیے میری قوم کے بچوں کے ذہن بڑے زرخیز ہیں۔

اور بچے ٹی وی کے آگے بیٹھے تھے۔ جہاں یہ نیوز چل رہی تھی۔ بحثیں چل رہی تھیں۔

اور بچے کمپیوٹر، لیپ ٹاپس، موبائلز اور ٹیبلٹس پر فیس بک کھولے بیٹھے تھے۔

بچوں کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں...... اور ان کے ذہن سوچ رہے تھے۔

بیج بویا جا چکا تھا۔ اور بچوں کے ذہن بہت زرخیز تھے۔

☆☆......☆☆

ٹھکانہ

شاہد رفیق سہو

اولاد سے وفا کی آس میں زندگی کے دن پورے کرتی ، ایک ماں کی درد بھری داستان ، کبیر والا سے ۔

میرا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ دادا کو زمین سے عشق تھا، انہوں نے عمر بھر وراثت سنبھال کر رکھی کہ یہ آبائی جاگیر ہے۔ علاقے میں اُن کے لیے یہ جاگیر عزت وتکریم کا باعث تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی اولاد کو یہی نصیحت کرتے تھے کہ اپنی جائیداد کو سنبھال کر رکھنا۔ زمینوں کو تقسیم مت ہونے دینا ورنہ تم مٹ جاؤ گے۔ کاش میرے والد اس نصیحت کو پلے سے باندھ لیتے تو آج ان کی نسل کو اتنے بُرے دن دیکھنے نہ پڑتے۔

دادا جان کو جہاں زمین پیاری تھی وہاں وہ اولاد کو پڑھا لکھا کر اعلیٰ عہدوں پر بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی سبب انہوں نے دونوں بیٹوں کو میٹرک کے بعد لاہور کے ایک اچھے تعلیمی ادارے میں بھیجا اور ان کو ہاسٹل میں داخل کرا دیا۔ علاقے میں زمینیں ہوں لیکن تعلیم نہ ہو تو تب بھی گزارہ نہیں چلتا کیونکہ اعلیٰ عہدیداروں سے ہی زمینداروں کے گھمبیر مسائل حل ہوتے ہیں۔ اپنے لخت جگروں کا اعلیٰ آفیسر ہونا زمینداری کو وسیع اور زمیندار کو علاقے میں مستحکم کرتا ہے۔

چچا تو پڑھ لکھ کر اعلیٰ افسر بن گئے اور کمشنر کے عہدے تک پہنچے لیکن والد صاحب کو زمانہ طالب علمی سے یورپ جانے کی دھن لگ گئی۔ جب وہ اعلیٰ افسر نہ بن سکے تو دادا کی خواہش تھی کہ ان کو سیاست کے میدان میں اُتار دیں مگر ابو نے الگ ہی مزاج پایا تھا۔ انہیں سیاست بھی راس نہ آئی اور وہ سب کچھ چھوڑ کر انگلینڈ کی سیر کو نکل گئے۔ گوروں کا یہ ملک ان کو بہت پسند آیا۔ وہاں ایک میم سے اُن کا واسطہ پڑا۔ اسے بھی ان سے محبت ہوگئی یوں دونوں کی محبت شادی پر اختتام پذیر ہوئی۔ والد صاحب کچھ عرصہ وہاں زیر تعلیم رہے۔ گوری سے شادی کر کے اسے بھی گاؤں لے آئے وہ چند ہفتے ہی یہاں رہی۔ لیکن وہ بہت خوش تھی۔ یہاں کا ماحول دیکھ کر کہتی تھی۔

’’نیچر سے قریب یہ زندگی مجھے بہت پسند آئی ہے۔‘‘

دو ماہ بعد مچھروں کا موسم شروع ہوگیا۔ وہ ملیریا میں مبتلا ہو کر بیمار ہوگئی اور پھر اس نے یہاں رہنے سے توبہ کر لی اور واپس اپنے وطن لوٹ گئی۔ والد صاحب بھی دوبارہ انگلینڈ چلے گئے اور انہوں نے انگلینڈ میں سکونت اختیار کر لی۔

یہ شادی پانچ برس چلی، ایک بچی ہوگئی لیکن بات طلاق پر ختم ہوگئی۔ گوری نے علیحدگی حاصل کر لی تھی۔ بچی بھی اسے مل گئی۔ والد صاحب اپنا سامنہ لے کر واپس لوٹ آئے۔ دادا ابھی حیات تھے۔ انہوں نے والد صاحب کی شادی خاندان کی ایک لڑکی سے کرا دی۔

میری والدہ کے دو بھائی تھے۔ نانا نے اپنی زمین دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دی اور امی جان کو اس میں حصہ نہ دیا البتہ شہر میں مکان تھا جو امی کے نام تھا۔ جو بعد میں اُن کے بہت کام آیا۔ والد صاحب نے جانے کس دل سے شادی کی تھی۔ وہ صرف پانچ سال ان کے ساتھ رہے اور تین بچوں کی پیدائش کے بعد ہمیں دادا کے حوالے کر کے دوبارہ انگلینڈ چلے گئے۔

سات سال تک انہوں نے ہماری خبر تک نہ لی امی صبر کے ساتھ سسرال میں گزارہ کرتی رہیں۔ وہ لوٹ کر میکے نہ گئیں۔ کیونکہ ہمارے نانا نانی وفات پا چکے تھے۔ ماموں شادی شدہ تھے اور ان کی بیویاں امی جان کو قبول نہ کرتی تھیں۔

سات برس بعد ابو لوٹے تو دادا کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے اتنے عرصے ہم کو سنبھالا تھا۔ ابو کو کہا کہ اب تم لوٹ کر لندن مت جانا، میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے اور اپنے بیوی، بچوں کی ذمہ داریاں تمہیں اٹھانی ہیں۔‘‘

انہوں نے سچ کہا تھا، جیسے وہ ابو کے لوٹنے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ابو کی واپسی کے ایک سال بعد ہی دادا جان اس دنیا سے چلے گئے۔ جب تک وہ زندہ تھے زمین کی حفاظت کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد آدھا رقبہ ابو اور آدھا چچا کو مل گیا۔ بیٹیوں کے حصے زندگی میں ان کو دیے جا چکے تھے تاکہ بعد میں وہ اپنے بھائیوں سے جھگڑا کر کے ان کے لیے کوئی مصیبت

کھڑی نہ کر دیں۔
دادا کی آنکھیں بند ہوتے ہی ابو کی بن آئی۔ آناً فاناً تمام زمین اونے پونے داموں فروخت کر کے انہوں نے دوبارہ لندن کا رختِ سفر باندھ لیا۔
لندن شہر گویا کہ میرے والد کے خوابوں کی سرزمین تھا۔ وہ ہر صورت وہاں قیام پذیر رہنا چاہتے تھے جبکہ والدہ جانے پر راضی نہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں کا ماحول بچوں کے لیے اچھا نہیں ان کو اپنے وطن میں رہ کر بہتر مقام حاصل کرنا چاہیے۔ ان دنوں لندن میں قیام پذیر ہونا کچھ مشکل نہ تھا۔ والد صاحب کے پاس زمینیں فروخت کرنے کے بعد کافی روپیہ آ گیا تھا۔ وہ انہوں نے پونڈز میں تبدیل کر لیا اور لندن کے بینک میں جمع کرا دیا۔ جب امی جانے پر آمادہ نہ ہوئیں تو ابو نے ان کو اور ہم بچوں کو چچا کی تحویل میں دے دیا اور خود ان کو یہ کہہ کر انگلینڈ چلے گئے کہ میں وہاں کوئی کاروبار جمالوں تو پھر اپنی بیوی اور بچوں کو بھی آ کر لے جاؤں گا۔''
یہ جھوٹ تھا یا تقدیر نے ساتھ نہ دیا والد صاحب گئے تو پھر نہ لوٹے۔ شروع میں رابطہ رکھا۔ پھر سارے رابطے ختم کر دیے۔ بالآخر وہ وہاں کے ہو گئے لیکن ان کی زندگی نے بھی وفا نہ کی اور چالیس برس کی عمر میں ہی اُن کا انتقال ہو گیا۔
ابو کی وفات کے بعد چچا نے کچھ عرصہ ساتھ دیا۔ ہم ابھی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ انہوں نے سرپرستی اور پرورش سے ہاتھ کھینچ لیا۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اور میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ امی گاؤں سے شہر والے مکان میں آ گئیں تا کہ ہم معیاری تعلیم حاصل کر سکیں۔ رہائش کا مسئلہ تو نانا کے دیے ہوئے مکان سے حل ہو گیا لیکن شہر میں اخراجات زیادہ اور ذریعہ آمدنی نہ ہونے کے برابر تھا۔ میری امی اچھے خاندان سے تھیں۔ وہ بہت خود دار تھیں۔ غربت میں بھی خاندانی بھرم رکھتی تھیں اور کسی کے آگے اپنی مجبوریاں بتانا عار سمجھتی تھیں۔ امی نے ہمیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کی ٹھان لی تھی۔ اس لیے وہ محنت مشقت کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ بڑی دقتوں سے انہوں نے ہم تینوں بہن بھائیوں کو تعلیم دلوائی اور جب ثمر کھانے کے دن آئے تو زندگی نے وفا نہ کی۔
بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہونے کے ناتے اب سارے فرائض مجھ پر آ پڑے تھے۔ میں نے بہ حُسن خوبی ان کو نبھایا۔ بہن اور بھائی کی شادی کی اور خود ملازمت اختیار کی۔
جس ادارے میں ملازمت میں کرتی تھی وہاں آصف نامی ایک شخص اچھے عہدے پر تھا۔ پہلی بیوی طلاق لے چکی تھی، کوئی بال بچہ نہ تھا۔ میری اس کے ساتھ انڈراسٹینڈنگ ہو گئی تو اس نے مجھے شادی کے لیے پرپوز کر دیا۔ اُس وقت میری عمر انتیس سال تھی۔ میں نے بہن سے صلاح مشورہ کیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ اس رشتے کو مت ٹھکراؤ۔ کب تک تنہا زندگی گزارو گی اور تنہا زندگی نہیں گزرتی۔ بھائیوں نے بھی اس رشتے کو پسند کیا تو میں نے حامی بھر لی اور یوں میرا بیاہ آصف سے ہو گیا۔
آصف یوں تو اچھے انسان تھے لیکن انہیں شراب پینے کی لت تھی۔ وہ روزرات کو مے نوشی کر کے سوتے تھے۔ اِن کی اس عادت نے مجھ کو برباد کر دیا۔ شروع میں تو میں چپ ہی رہی لیکن جب تین بچے ہو گئے تو ان کی پرورش کے لیے مجھے نوکری کو خیرباد کہنا پڑا۔ اب اخراجات کا تمام تر ذمہ آصف پر تھا۔ لیکن وہ اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ مے نوشی پر اُڑا دیتے تھے۔ اس وجہ سے گھریلو اخراجات بہت کھینچ تان کر پورے ہوتے تھے۔ یہ ایک پرائیویٹ ادارہ تھا، لہٰذا مجھ کو کوئی پنشن وغیرہ نہ ملی اور نہ ہی آصف کو ملی تھی۔ جبکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ اس طرح ان کے تعلیمی اخراجات بھی بڑھ گئے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخل کروایا تھا کیونکہ جانتی تھی کہ اگر یہ اچھے اداروں میں نہ پڑھے تو زمانے کا مقابلہ نہ کر سکیں گے جبکہ یہ مقابلے کا دور تھا۔
میں بچوں کے شاندار مستقبل کی خاطر محنت کی چکی

میں پسنے پر مجبور ہوگئی جبکہ آصف کثرتِ سے مے نوشی سے صحت کھو بیٹھے۔ وہ مسلسل بیمار رہنے لگے۔ تاہم مے نوشی اب بھی جاری تھی جبکہ ڈاکٹر کہتے تھے اگر انہوں نے شراب نہ چھوڑی تو ان کی زندگی کے دن مختصر رہ جائیں گے۔ ایک طرف شوہر کی بیماری اور مے نوشی کا بوجھ تو دوسری طرف بچوں کے اخراجات تھے۔ دن رات محنت مشقت نے میری کمر توڑ کر رکھ دی۔ میں صبح کو ایک اسکول میں پڑھاتی تھی اور شام کو اکیڈمی میں جز وقتی ملازمت کرتی تھی۔ شام سے رات تک محلے کے طالب علم مجھ سے ٹیوشن پڑھنے بھی آتے۔

نانا کا گھر جس میں ہماری امی نے ہماری پرورش کی وہ بہن بھائیوں نے میرے حوالے کر دیا کیونکہ آصف نے گھر بھی فروخت کر دیا تھا جو کچھ ان کے پلے تھا وہ نشے کی نذر ہو چکا تھا۔

میں نے امی کے مکان میں اپنے بچوں کے ساتھ سر چھپالیا۔ اگر یہ مکان نہ ہوتا تو میں کہاں رہتی اور مکان کا کرایہ کہاں سے ادا کرتی۔ بچے ابھی زیر تعلیم تھے کہ آصف وفات پا گئے۔

بڑا بیٹا انجینئرنگ کر رہا تھا دوسرا مقابلے کے امتحان کی تیاری میں لگا ہوا تھا اور بیٹی ان دنوں میڈیکل کالج میں دوسرے سال کی طالبہ تھی۔ میں کیسے اپنے بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کر رہی تھی یہ تو میں ہی جانتی تھی یا میرا خدا۔ سارے دن کی مشقت کے بعد بھی آدھی رات تک میں ایک گارمنٹ فیکٹری سے کپڑے لا کر سلائی کرتی تاکہ روزی روٹی کا نظام چلتا رہے۔

مشقت کے ان دنوں میں، میں نے بھی اپنی ماں کی طرح کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ تاہم میری بہن کو میرا احساس تھا وہ ہر طرح کی میری مدد کرتی تھی۔ وہی مجھے حوصلہ دیتی تھی کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ برے بھلے دن بھی آخر کار گزر ہی جائیں گے۔ بچے جب پڑھ لکھ کر معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیں گے تو تمہارے دکھ کے دن ختم ہو جائیں گے دیکھ لینا۔ تم نے جو اپنے بچوں کی خاطر اتنی محنت کی ہے یہ کچھ بن کر تمہاری زندگی پُر آسائش بنا دیں گے۔"

امید پر دنیا قائم ہے، میں بھی اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے سپنے اپنی آنکھوں میں سجائے محنت کی چکی میں پستی رہی اور اپنی ہڈیاں گھس کر ان کو پروان چڑھاتی رہی۔ اپنی استطاعت سے زیادہ کام کرتی تھی اور خود پر پائی پیسہ بھی خرچ نہ کرتی تھی تاکہ اپنے بچوں کو اچھا کھلا سکوں اور پہنا سکوں تاکہ یہ خود کو دوسروں سے کم تر خیال نہ کریں۔

وقت سدا ایک سا نہیں رہتا، وقت کا کام ہے گزرنا سو گزر جاتا ہے۔ تب وہ وقت بھی آ گیا جس دن کی خاطر میں نے خود کو فراموش کر کے دن رات کولہو کے بیل کی طرح کام کیا تھا۔ وقت سے پہلے بڑھاپے کی سرحد تک پہنچ گئی تھی۔

بیٹا انجینئر بن کر ایک بڑی فرم میں تعینات ہو گیا۔ بہت اچھی تنخواہ کے ساتھ سہولتیں بھی ملنے لگیں۔ دوسرا بیٹا بھی مقابلے کا امتحان پاس کر کے افسر لگ گیا جبکہ بیٹی بھی ڈاکٹر بن گئی۔ سارے بچے کمانے والے ہو گئے پھر میں ان کی شادیوں کی فکر میں گھلنے لگی۔ اچھے گھرانوں میں بہت سے رشتے دیکھے بالآخر دونوں بیٹوں کی ایک ساتھ شادی کر دی اور بہوئیں گھر آ گئیں۔ دونوں آپس میں بہنیں تھیں۔ بیٹی کی بھی شادی ہو گئی تو میں نے ذرا سکھ کا سانس لیا۔

جس کے نصیب میں آرام نہ ہو اسے کہاں سے سکون ملتا۔ بہوؤں نے آرام دینے کے بجائے بڑھاپے میں بے آرام کر دیا۔ میں عمر کے تقاضوں سے تھکنے لگی مگر وہ ہل کر پانی نہ پیتیں۔ چاہتی تھیں کہ سارے کام ساس کرے۔ دونوں نے گھر کا نظم و نسق سنبھالا۔ میری مٹی پلید ہی رہی۔

کچھ عرصہ بعد دونوں کی نیت کھلنے لگی۔ دونوں یہ چاہتی تھیں کہ میں بیٹوں کے گھر نہ رہوں۔ گھر میرا تھا لیکن بہوئیں چاہتی تھیں کہ میں یہ گھر ان کے نام کر دوں۔

☆......☆......☆

اماں بعد میں خالائیں اور ماموں مسئلہ کریں

گے۔ بہتر ہے کہ نانا کا مکان آپ ہمارے نام کر دیں۔ اپنی زندگی میں ہماری ملکیت ہمیں دے دیں۔ تاکہ آپ کے بعد کوئی جھگڑا نہ ہو۔'' میں ان کی فکر سے آگاہ ہو کر حیران تھی۔ بیٹی سے ذکر کیا تو اس نے بھی سمجھایا کہ امی زندگی میں کیا ہوا فیصلہ اچھا ہوتا ہے۔ ہمارے دادا ایک بہت بڑے زمیندار تھے لیکن دیکھیں تو ہم کو کیا ملا۔ جاگیر ابو نے فروخت کر دی اور ہم نے کوڑی کوڑی کو محتاج ہو کر زندگی گزاری۔ ابھی وقت ہے اچھا فیصلہ کر دیں بعد میں کیا ہو کون جانے؟

میں بیٹی پر اعتماد کرتی تھی۔ اس کا کہا مان کر مکان دونوں بیٹوں کے نام کر دیا کیونکہ میری بیٹی حنا نے کہا تھا کہ مجھے اس میں سے حصہ نہیں چاہیے۔ میرے خاوند کے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ میرے دونوں بھائیوں کو ٹھکانہ دے دیجیے۔

جونہی میں نے مکان لڑکوں کے کام کیا دونوں بہوؤں کا رویہ مجھ سے اتنا بدل گیا کہ انہوں نے میرا جینا دوبھر کر دیا۔ لہٰذا اپنے بچوں کے سکون کی خاطر میں نے ان کا گھر چھوڑ دیا اور بیٹی کے پاس رہنے لگی۔

داماد اچھا ملا تھا مگر کب تک ماں بیٹی کے پاس کیسے رہ سکتی ہے جبکہ اس کے بیٹے بھی موجود ہوں۔ میں نے بیٹوں سے بات کی تو انہوں نے کہا۔

'' امی آپ حنا کے پاس ہی رہتی رہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ آپ کے آنے سے ہمارے گھر کا سکون خراب ہوتا ہے۔''

مجھ کو ان کا فیصلہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اِدھر بہن بھائی ناراض تھے کہ انہوں نے رحم کھا کر مجھے وہ گھر دیا تھا اور میں نے ان سے نہ پوچھا اور اپنے جیتے جی باپ کی ملکیت سے دستبردار ہو گئی۔ بس یہی میری بہت بڑی غلطی تھی۔ بیٹی اور داماد دونوں ڈاکٹر تھے اچانک ان کا بیرون ملک جانے کا سلسلہ ہو گیا اور وہ چلے گئے۔ میں پھر سے بے ٹھکانہ ہو گئی۔ دوبارہ مجبوراً بیٹوں کے گھر رہنے آ گئی تو بہوؤں نے [illegible] بھوں چڑھائی۔ دل بہت دکھا۔ من کو

مار لیا خودداری کا گلا گھونٹ دیا لیکن بہوؤں نے قسم کھائی تھی کہ ساس کو نہیں رہنے دینا۔ جب انہوں نے بات بات پر زندگی کو عذاب میں مبتلا کرنا شروع کیا تو میں شہر سے دوبارہ گاؤں آ گئی۔ سسر کے گھر میں دیولاتی رہتی تھی اس نے ترس کھا کر مجھے رکھ لیا۔

اب زندگی کے آخری دن ان کے در پر گزار رہی ہوں۔ یہاں بھی محنت مشقت کرتی ہوں گاؤں کے بچوں کو پڑھاتی ہوں قرآن پاک بھی ترجمے سے پڑھا کر اپنا گزارہ کر رہی ہوں۔ آج زندگی کا سورج ڈوبنے کو ہے۔ آنکھوں میں ابھی تک اولاد سے محبت کے خواب جگمگاتے ہیں۔ ان کی صورتیں دیکھنے کو ترستی ہوں لیکن وہ مجھ سے ملنے نہیں آتے۔ اپنی بیویوں اور بچوں میں خوش ہیں اور میں ہر نماز کے بعد دعا کرتی ہوں کہ وہ سدا خوش و خرم اور آباد رہیں۔ اولاد وفا کرے نا کرے ماں دعا ہی کرتی ہے ماں کا دل ممتا سے بھرا رہتا ہے۔ ہم ننھے منے پودے لگاتے ہیں اور انہیں سینچتے ہیں۔ اپنے خون اور پسینے سے لیکن جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں۔ پھل دار شجر بن جاتے ہیں تو ان کے پھل کوئی اور کھاتا ہے اور ان کی چھاؤں میں کوئی اور ہی لوگ پروان چڑھتے ہیں۔ انہیں لگانے والے اور پروان چڑھانے والے ان کی چھاؤں سے محروم رہتے ہیں۔ شاید یہی قانونِ قدرت ہے۔ میں بھی آج جوان اولاد کی چھاؤں سے محروم زندگی کی تپتی دھوپ میں جل رہی ہوں۔ میرا بڑھاپا ہے۔ سچ ہے اولاد سے وفا نہیں۔ بوڑھے ماں باپ کو آرام سکون دینا خود پر جنت کے دروازے کھولنے کے مترادف ہے۔ لیکن بچوں کو شاید ماں باپ کے بڑھاپے اور تکلیفوں کا احساس نہیں ہوتا جب تک وہ خود بڑھاپے میں نہ پہنچ جائیں۔ اور کسی کسی کے نصیب میں آرام نہیں ہوتا۔ عمر بھر کی مشقت لکھی ہوتی ہے۔ شاید میں انہی بدنصیبوں میں سے ہوں۔

☆☆......☆☆

مردوں کے معاشرے میں ایک عورت کی آبلہ پائی کی داستان، راولپنڈی سے۔

نئے سال کا سورج طلوع ہونے میں ابھی چھ گھنٹے باقی ہیں...... کل میری پچیسو سال گرہ بھی ہے۔ لیکن میں اپنی سالگرہ نہیں مناؤں گی۔ نئے سال کا سورج طلوع ہوتے ہوئے میں نہ دیکھ سکوں گی...... لوگ نئے سال کی پہلی رات دھوم دھام اور موج مستی کر کے مناتے ہیں...... مگر میں کتنی بدنصیب ہوں۔ کہ میں اس موج مستی کا ایک حصہ ہونے کے باوجود خوش نہیں ہوں۔

رات آدھی سے بھی زیادہ بیت چکی ہے...... ساری دنیا سو رہی ہے...... میرا خریدار بھی اپنا سودا خرید چکا ہے۔ اور اب گہری نیند سو رہا ہے۔ مگر میں جاگ رہی ہوں۔ میں ایک فائیوسٹار ہوٹل کے ایک کمرے کی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوں۔ یہ ایک ایسے ہوٹل کا کمرہ ہے۔ جس کے دن خوابناک اور راتیں پر اسرار ہوتی ہیں۔ یہ کمرہ نہایت پر آسائش اور پر آرائش ہے۔ لیکن اس کی تزئین اور آسائش کا منظر تو خود میرا اپنا سراپا ہے...... میں ہولے قدموں سے چلتی ہوں تو میرے سینڈل کی لمبی اور نوکیلی ایڑیاں دبیز قالین میں بغیر آواز پیدا کیے بار بار دھنستی اور ابھرتی ہیں۔ میں ایک قد آدم آئینے کی طرف بڑھتی ہوں اور اپنے سراپے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتی ہوں۔ کیونکہ لوگ کہتے ہیں...... کہ میں حسن اور تناسب کا ایک شاہکار ہوں۔ میرے جسم پر بڑی ہی گراں قیمت اور زرق برق پوشاک سجی ہوئی ہے۔ میں نے ہر زاویے سے تنقیدی نظروں کے ساتھ اپنا جائزہ لینے کے بعد اپنے چہرے کو دیکھا ہے، جسے میں نے بڑی چابکدستی اور نفاست سے مزید نکھار دیا ہے...... کیونکہ مجھے ایسا کرنے کا حکم ملتا ہے...... اس لیے کہ میرے سرپرستوں کے لیے میرا چہرہ نہایت ہی قیمتی ہے۔ میں آئینے کے مزید قریب ہوئی ہوں...... تو میرا چہرہ آئینے سے یوں منعکس ہوتا ہے جیسے شفاف پانیوں میں روشن چاند جھلملا اٹھے ہوں...... اس جگہ اگر میرے بجائے کوئی اور عورت ہوتی...... تو وہ اس لمحے جھوم اٹھتی، مغرور ہو جاتی اور بغیر پروں کے اڑنے لگتی۔ ایسا سوچ کر میری ہنسی نکل گئی ہے۔ میری اس ہنسی میں کتنی تلخی ہے۔ کتنی جلن ہے۔ میرا حلق۔ زبان اور ہونٹ بھی جل اٹھے ہیں...... میں اپنے چلے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے لگی ہوں جن پر گہرے شیڈ کی لپ اسٹک لگی ہوئی ہے جس کی قوسیں؟؟ گہری ہیں کہ مصور کی نظر بھی پھسل جائے۔ بڑی بڑی کٹیلی آنکھیں جو بے حد

سیاہ ہیں نازک نتھنوں، ستواں ناک...... چاند پیشانی...... گلاب عارض، لوگ کہتے ہیں تمہیں دیکھ کر تصور میں یونانی دیویوں کے چہرے ابھرنے لگتے ہیں۔ تم حسن کی شہزادی ہو۔ سندرتا کی ملکہ ہو۔ تم ایک ساحرہ ہو"

مگر ان کو یہ احساس نہیں ہے کہ میں اندر سے کتنی دکھی ہوں۔ میں اس گناہ بھری زندگی سے تنگ آچکی ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوگئی ہے۔ میں منتظر ہوں موذن کی آواز کی۔ جوں ہی اذان سنائی دے گی میں نماز پڑھ کر اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگوں گی۔ اور پھر اس کھڑکی سے کود کر جان دے دوں گی۔ کل یا پرسوں کے اخبار میں دو کالمی خبر شائع ہوگی۔

"ایک کال گرل نے ہوٹل کی کھڑکی سے کود کر خود کشی کرلی"

سی کو کیا معلوم کہ یہ کال گرل ایک عورت بھی ہے...... ایسی عورت جو اس معاشرے کا سب سے مظلوم طبقہ ہے۔ ایک کٹھ پتلی کی طرح مرد اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ہر الزام عورت کے لیے ہوتا ہے۔ وہ اگر دبلی ہے تو بری۔ موٹی ہے تو بری۔ امیر ہے تو بری۔ غریب ہے تو بری۔ روتی ہے تو بری۔ صبر کرتی ہے تو بری، نہ کرے تو بری۔ قدیم رسموں سے چمٹی رہے تو بری۔ آزادی چاہے تو بری۔ کنواری رہے تو بری۔ کسی سے تعلق جوڑے تو بری۔ حتی کہ اگر کوئی اس کے ساتھ زیادتی کرے تب بھی الزام اسی پر آتا ہے۔ اولاد پیدا نہ ہو۔ گھر اجڑ جائے تو تمام ذمہ داری عورت پر ڈال دی جاتی ہے۔ خوبصورت ہو تو ہر کوئی ہوس بھری نظروں سے دیکھے بدصورت ہو تو بڑی مجرم...... کاش میرا باپ سخت گیر قسم

کا مرد نہ ہوتا ...... تو شادی میری یوں برباد نہ ہوتی۔ میں یوں سسک سسک کر زندگی نہ گزار رہی ہوتی

...... کاش ...... اے کاش

قہر کیتا ای بابل میریا دے
جوڑی دیکھ کے جوڑ نہیں جوڑیا ای

...... ☆☆☆ ......

میرے ابا جان نہایت ہی سخت گیر قسم کے باپ تھے۔لڑکوں کو بھی ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔اور لڑکیاں تو ان کے سامنے جاتے ہی یوں سمٹ جاتیں جیسے ان کی روح بھی سکڑ گئی ہو۔اگر سر سے دوپٹہ بھی ڈھلک گیا تو اماں نے آڑے ہاتھوں لیا۔کبھی لاپروائی سے بھی قدم اٹھا تو اماں پکار ہیں۔

''اے لڑکی! تمیز سے چل۔کیا لڑکوں کی طرح کدکڑے لگاتی پھرتی ہو۔''

کہیں آنے جانے یا کسی کھڑکی دروازے سے تانک جھانک کرنے کی قطعی اجازت نہ تھی۔لیکن مجھے اس ماحول میں بھی گھٹن یا یکسانیت کا احساس نہ ہوتا تھا، نہ ہی میرے اندر کبھی بغاوت کا کوئی جذبہ پیدا ہوا تھا کیونکہ میں جیسے ماحول میں رہ رہی تھی۔وہاں ایسے خیالات کے در آنے کا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

ابھی مجھ میں کچھ ایسی سمجھ بھی نہ آئی تھی کہ ایک دن میری انگلی میں ایک خوبصورت سی طلائی انگوٹھی پہنا دی گئی۔میں نے صرف نواز کا نام سنا تھا...... اور پھر اس نام کو من ہی من میں اتنی بار دہرایا تھا کہ یہ نام اب میری ہستی میں جذب ہو گیا تھا اب میرے لیے یہ نام ہی سب کچھ تھا۔میرا دین، میری دنیا، میری زندگی، میری موت، میری ابتداء، میری انتہا اور اس نام کے پس پردہ جو کوئی بھی تھا، جیسا بھی تھا میرے لیے دیوتا تھا۔جس کی پرستش کرنا میرا مقدر تھا اور میں بھی اس کے چرنوں میں جھکنے کے لیے بے تاب سی رہتی تھی۔

پھر ایک روز میری ہتھیلیوں پر مہندی لگائی گئی...... ہتھیلیاں پہلے سرخ ہوئیں، پھر گہری سرخ اور آخر میں سیاہی مائل ہو گئیں۔ان دنوں میں خود میں سمٹی شرمائی لجائی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی رہی پھر بارات کا شور اٹھا...... اور بھگدڑ سی مچ گئی۔میرا کمرہ جو لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔چشم زدن میں خالی ہو گیا۔لیکن جس طرح لڑکیاں بھاگتی ہوئی باہر گئی تھیں۔اسی طرح واپس بھی آ گئیں...... مگر اُن کے چہروں پر وہ خوشی اور مسکراہٹیں نہ تھیں، جو باہر جاتے وقت تھیں۔میں متفکری ہو گئی۔اور پھر دبے دبے لفظوں میں میرے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی کہ دولہا کا دلہن سے کوئی جوڑ نہیں بنتا۔

''چاند کو گرہن لگ گیا۔'' یہ ایک عجیب سی سرگوشی تھی جو میرے پردہ سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔بڑی بوڑھیاں گردنیں جھٹک رہی تھیں اور لڑکیاں بالیاں میرے والدین کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہی تھیں۔جنہوں نے بقول ان کے کچھ دیکھے بھالے بغیر میرا نصیبہ پھوڑ ڈالا تھا۔وہ بے شمار دھیمی دھیمی ملی جلی آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر عجیب ماحول پیدا کر رہی تھیں ''حور کے پہلو میں لنگور'' کی سرگوشی سن کر میں لرز سی گئی۔مگر پھر بھی میں سر جھکائے، خود میں سمٹی یوں بیٹھی رہی۔جیسے مجھے کچھ سنائی ہی نہ دے رہا ہو۔پھر مجھے دلہن بنا دیا گیا۔مجھے دلہن بنانے والی سہیلیوں نے بے ساختہ میرے ہاتھ چوم لیے اور بولیں۔

''تمہاری قسمت میں نہ جانے کیا لکھا ہے، ورنہ تم تو کسی شہزادے کے سنگ سجنے کے قابل ہو۔''

میں ان کی باتیں سن کر حیران ہو رہی تھی۔خاوند تو مجازی خدا ہوتا ہے جس کے بارے میں گستاخی سیکھا ہوا ایک جملہ جہنم کا دروازہ کھول دیتا ہے۔جس سے بدنیتی یا بے وفائی کا خیال بد چلنی ہے۔مشرقی عورت کے لیے موت سے بھی بدتر...... اس کی شکل وصورت سے کیا غرض، دیوتا تو ہر حال میں دیوتا ہوتا ہے۔یہ کیوں سوچا جائے کہ وہ گورا ہے یا کالا...... خوبصورت ہے بدصورت!

جب میں نے ڈولی میں بیٹھ کر میکہ چھوڑا تو بھی ان ہی کاٹ دار فقروں کی گونج میرا پیچھا کر رہی تھی۔میں نے سوچا...... شادی والے دن جو کسی کا دل چاہتا ہے، وہ ان خیالات کا اظہار کرتا رہتا ہے کیونکہ ایسے

موقع پر صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں کہنے والوں کی شکلیں کوئی نہیں دیکھ پاتا۔

جب میں نے سسرال کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تو مجھے معلوم تھا...... کہ میں یہاں مرنے کڑھنے اور ساری عمر اسی طرح تمام کرنے آئی ہوں۔ کیونکہ مشرقی لڑکی جب سسرال کے آنگن میں پہلی بار داخل ہوتی ہے تو اسے خوب معلوم ہوتا ہے کہ وہ واپسی کے لیے تمام کشتیاں جلا کر اس سمندر میں کود رہی ہے۔ ایک امید وبیم لیے کہ خدا جانے وہ کنارے سے جا لگے گی یا ڈوب جائے گی۔

☆☆☆

سسرال میں لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر کوئی دلہن کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جیسے اب نہ دیکھ سکا تو پھر کبھی نہ دیکھ پائے گا۔ کان پھاڑ دینے والے شور شرابے میں جب میری بڑی نند نے میرا گھونگھٹ کھسکایا تو یوں یکبارگی سکوت طاری ہو گیا جیسے بھرے مجمع میں کسی نے اچانک گولی چلا دی ہو۔ پھر مجھے ان لوگوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ وہ سب دولہا کی قسمت پر رشک کا اظہار کر رہی تھیں۔ مجھے جس کمرہ میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ کوئی سجا سجایا نہ تھا۔ نہ فرش گل بچھا تھا۔ نہ رنگ و بو کے سیلاب امڈ رہے تھے۔ نہ روشنیوں سے بقعہ نور بنایا گیا تھا...... ہاں پس میرا وجود مہک رہا تھا۔ معطر پھولوں کی مانند جس سے سارا ماحول رنگ و بو میں بسا ہوا لگ رہا تھا۔

میں نے پہلی بار نواز کو دیکھا تو وہ مجھے بھلا لگا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میرے شعور یا لاشعور کسی بھی پرت میں کسی اور چہرے کا کوئی ہلکا سا عکس بھی موجود نہیں تھا۔ کہ میں جس سے نواز کا موازنہ نہ کرتی۔ اس لیے کہ نواز جس مقام پر تھا وہاں میں اسے ہر لحاظ سے مکمل سمجھتی تھی۔ سب سے بہتر۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا وہ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوا۔ جیسے اس کا دل بجھ گیا ہو۔ نواز کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں آج بھی محسوس کرتی ہوں کہ وہ مجھے دیکھ کر اداس ہی نہ ہوا تھا بلکہ فکر مند بھی ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہی نہ چندھیائی تھیں، دماغ بھی سن ہو گیا تھا۔ اس کی سوچیں بھی پراگندہ ہو گئی تھیں۔ اس زہر آلود سوچ نے اسے چکرا دیا تھا کہ میں اسے دل سے قبول کر لوں گی۔ یوں پہلے دن ہی سے نواز کے دل میں ایک چور سا گھس کر بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ شاید شادی کا تیسرا یا چوتھا دن تھا۔ جب میرے معصوم جذبات کو پہلا گھاؤ لگا۔ میں دلہن بنی کمرے میں بیٹھی تھی۔ عورتیں آ جا رہی تھیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کون آیا۔ کون گیا...... کہ اچانک مجھے باہر سے نواز کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔ مگر اس کی آواز میں اس قدر خفگی اور تحکم تھا۔ کہ میرے پاس بیٹھی ہوئی عورتیں مسکرانے لگیں۔ ایک عورت تو ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''دولہا میاں اپنی چاندسی دلہن سے یوں مخاطب ہیں۔ جیسے افسر اپنے ماتحت کو حکم دیتا ہے۔''

دیگر عورتیں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ اسی اثنا میں مجھے دوبارہ وہی کرخت آواز سنائی دی...... ایک عورت نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ نہ جانے ایسی کون سی افتاد آن پڑی ہے۔ جو وہ کچھ دیر انتظار بھی نہیں کر سکتا...... لیکن میں نواز کے تیور دیکھ کر دہل سی گئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں لہو ہو رہی تھیں۔ اس نے زبان کو منہ میں یوں گھمایا جیسے سوکھے ہوئے تالو کو گیلا کر رہا ہو۔ تاکہ منہ سے لفظ باہر نکل سکیں۔ پھر وہ بولا۔

''اگر خدا نے تمہیں خوش شکل بنا دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس کی سرِعام نمائش کرو۔ ایسے شوق کے لیے دوسرے ذرائع ہوتے ہیں۔ پھر یہاں آنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔''

میں نے محسوس کیا کہ بولتے ہوئے اس کے ہونٹ لرز رہے ہیں اور چہرے پر کرب اور اندرونی توڑ پھوڑ کے آثار واضح ہیں۔ جیسے وہ شدید قسم کے ذہنی اور نفسیاتی تناؤ میں الجھ گیا ہو۔ میں نے بمشکل پوچھا۔

''ہوا کیا ہے؟''

''تمہیں کچھ معلوم نہیں..... کچھ معلوم نہیں تمہیں؟''

اس کے چہرے اور گردن کی رگیں تن گئیں اور اس پر جیسے جنون طاری ہو گیا..... وہ اردگرد پڑی ہوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر فرش پر پٹخنے لگا۔ کانچ کی اشیا کرچی کرچی ہو کر ٹوٹنے لگیں۔ میں یوں ساکت و جامد کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ساری کاروائی کو دیکھتی رہی، جیسے میری رگوں میں گردش کرتا ہوا خون جام ہو کر سیسہ بن گیا ہو مجھ میں سوال کرنے کی طاقت ہی نہ رہی۔

پھر وہ میری جانب بڑھا۔ پھر اس نے پلنگ کا سہارا یوں لیا جیسے وہ گرنے لگا ہو۔ پھر وہ بولا۔

''تم ارشد کے سامنے کیوں بن سنور کر بیٹھی تھیں۔ تم یہ خوش فہمی دل سے نکال دو کہ وہ باہر جا کر یہ کہے گا کہ تم بہت خوبصورت ہو..... وہ یہ نہیں کہے گا۔ بلکہ وہ دوسروں کو بتائے گا کہ تم خود نمائی کرتی ہو۔ عزت اچھالے گا میری۔ وہ میرا شریک بھائی ہے۔ ایسے رشتوں کو تو موقع چاہیے بات کرنے کا۔''

یہ پھر جیسے وہ تھک گیا اور پلنگ پر ہی گر گیا۔ اب اس کا جنون ٹوٹ رہا تھا مگر میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ ارشد کون ہے؟ وہ کب آیا تھا۔ کہاں کھڑا رہا..... وہ نواز کا عم زاد بھائی تھا کہیں آیا ہو گا۔ اور شاید اس نے میری طرف دیکھا بھی ہو..... مگر یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جس کو اتنی شدت سے محسوس کیا جاتا۔

دکھ سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ جیسے میرے مردہ جسم میں جان پڑ گئی ہو۔ میں دیر تک کھڑی روتی رہی اور پھر میں اس کے قریب گئی اور پوری قوت اکٹھا کر کے بولی۔

''نواز! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون آیا، کون گیا؟''

وہ تکیے میں منہ دیے الٹا پڑا رہا میں وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ میں نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

''نواز! تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ خدا کے واسطے مجھ پر اعتماد کرو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے ایسی باتوں سے''

اسے یوں لگا جیسے اسے اپنے کہے ہوئے الفاظ کا مثبت جواب مل گیا ہے اور اسے میری بے گناہی اور معصومیت پر ترس آ گیا ہے۔ شاید وہ مجھ سے سوری کرے۔ اس ارادے سے اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا میرے آئینے کی مانند شفاف عارضوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔ نواز نے میرے چہرے کی طرف دیکھا تو میں سہم سی گئی۔ شاید وہ میرا سوگوار حسن دیکھ کر جل گیا تھا۔ میرے دل میں خوف کی ایک اذیت زدہ لہر دوڑ گئی۔ اس کا چہرہ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ مجھے جلا ڈالے گا۔ راکھ بنا دے گا۔ خون تھوکنے پر مجبور کر دے گا۔

......☆☆☆......

یہ جیسے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت کا آغاز تھا۔ میں ہر انداز میں، ہر ادا سے، ہر طور پر اتنی حسین لگتی کہ مجھے دیکھ کر ہر لمحہ نواز کے اندر ایک ہوک سی اٹھتی..... وہ سوچتا تھا کہ کیا میں اسے دل سے تسلیم کر لوں گی؟

اور پھر جیسے اس کے اندر انکار کی صورت وسوسوں کا شور سا برپا ہو جاتا اور اس شور کی بازگشت۔ ہر لمحہ، ہر وقت اس کا پیچھا کرتی..... اس پُر ہیجان اور تکلیف دہ شور نے اسے غیر متوازن کر ڈالا تھا..... نواز نے میرے ہمراہ شادی کی ایک تصویر تک نہ بنوائی تھی۔ میں اگر ڈھنگ کے کپڑے بھی پہن لیتی تو وہ مجھ سے بلا وجہ الجھنے لگتا جیسے جل گیا ہو۔ میں حیرت سے کہتی۔

''نواز! ابھی تو ہماری شادی کو چند دن ہوئے ہیں۔''

مگر وہ بگڑ کر کہتا ''مجھے نہیں اچھی لگتیں یہ سستی اور عامیانہ حرکتیں۔''

وہ بات بات پر مجھے ٹوکنے لگا۔ اور مجھ پر رعب اور دبدبہ جمانے لگا۔ جیسے یہ اس کا فرض ہو..... وہ بار بار کہتا..... ''شکل و صورت کی بھی بھلا کوئی اہمیت ہوتی ہے۔''

میں فوراً کہتی..... ''تم سچ کہتے ہو نواز! شکل و صورت تو ظاہری چیز ہے۔ سطحی۔ ناپائیدار۔ انسان کا اصل تو اس کا باطن ہے۔ وہی آئینہ ہے دھندلایا

شفاف اسے جھلکنا چاہیے۔''
وہ مجھے غیر یقینی نظروں سے دیکھتا۔
جیسے کہہ رہا ہو'' کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟''

......☆☆☆......

کچھ دنوں بعد نواز کے ہمراہ میں ایک دوسرے شہر میں آگئی ۔ جہاں نواز ملازمت کرتا تھا۔ یوں تو زندگی ایک عام ڈگر پر چلنے لگی لیکن نواز کے اندر جو شکوک وشبہات کا بیج بویا گیا تھا۔ وہ درخت بن کر پھیلتا ہی گیا اور میں ہر ممکن کوشش کے باوجود اس کی بیخ کنی نہ کرسکی۔ خدا جانے کیوں اسے مجھ پر ذرہ بھر بھی اعتماد نہیں۔ تھا میں کوئی عام بات بھی کرتی تو وہ اس کے الٹ معنی ڈھونڈ نکالتا......اور چلا اٹھتا۔ کہ میں اس کی تذلیل کررہی ہوں، اسے باور کرارہی ہوں کہ وہ مجھ سے کمتر ہے۔

وہ مجھے بار بار جتا چکا تھا کہ اس کے نزدیک میرا پاگل کردینے والا حسن کی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ میری خوبصورتی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں اس کی ایسی باتوں حیران ہوکر سوچتی۔

''بھلا بیوی کی بھی صورت ہوتی ہے۔ وہ تو بس بیوی ہوتی ہے خدمت گزار، وفا شعار، آن پر جان دینے والی۔ اور مشرقی بیوی تو ایک خاص الخاص فارمولے کا نام ہے۔ وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ اور مختلف طریقوں سے مجھ پر اپنی برتری کا احساس جتانا چاہتا تھا۔

وہ انتہائی شکی مزاج اور جنونی قسم کا انسان تھا۔ میں اس کے ماضی کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتی تھی جس نے اسے اس قدر احساس کمتری کا شکار کردیا تھا۔

اس کے پاس ایک ڈائری تھی۔ جسے وہ ہمیشہ تالے میں رکھتا تھا۔ شاید اس میں اس کا ماضی دفن تھا۔ ایک دن وہ غسل خانے میں گیا تو نہ جانے کس اضطراب میں اس سے یہ غلطی سرزد ہوگئی کہ وہ ڈائری میز پر بھول گیا۔ میں نے اسے اٹھالیا اور الٹنے پلٹنے لگی۔ ایک صفحہ پر میری نظریں جم گئیں۔ لکھا تھا۔

''آج جب اسکول میں ماسٹر صاحب نے لڑکوں کو ایک بات سنائی......کہ اسپارٹا کے لوگ پر ہیبت اور بھونڈی شکل وصورت والے ابنارمل بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ تو کلاس کے سب لڑکوں نے ایک بار مڑ کر میری طرف تمسخرانہ انداز میں دیکھا اور میں نے اپنا سر ڈیسک میں دھنسا لیا۔ مجھے اپنے خدا سے گلہ ہے کہ اس قانون کا اجراء ہر جگہ کیوں نہیں ہوجاتا۔''

میں یہاں تک ہی پڑھ سکی تھی......کہ نواز باہر نکل آیا اور میرے ہاتھ اپنی ڈائری دیکھ کر جیسے وہ پاگل سا ہوگیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے ڈائری چھین لی......اس کے بعد میں نے وہ ڈائری کبھی نہیں دیکھی۔

......☆☆☆......

ایک دن میں ایک رسالہ پڑھ رہی تھی کہ اچانک نواز وقت سے کچھ پہلے ہی گھر آگیا۔ میں اس کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا پڑھ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں ۔ یہ رسالہ ہے'' میں نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''نہ پڑھا کرو۔ یہ رسالے!

میں اس کے سامنے بیٹھ گئی اور چہرے کو ہاتھوں کے کٹورے میں تھام کر اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نواز! آج تو تم اماں کی سی باتیں کررہے ہو۔ حالانکہ تم میرے شوہر ہو۔''

اس کے چہرے پر بدستور کرختگی طاری تھی۔ وہ رسالہ اٹھا کر اسے الٹنے پلٹنے لگا۔ اور پھر بولا۔

''آئندہ میں گھر میں ایسی لغویات نہ دیکھوں۔''

میں حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی کہ یہ شخص جو میری دنیا کا مجازی خدا ہے کیا اس کے ذہن کی وسعت بس اس قدر ہی ہے؟ کیا اس کا باطن اتنا بدصورت ہے؟ اس کے ظاہر کے متعلق تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا لیکن اس کا باطن تو میرے خیال کے مطابق وسیع اور بلند تر ہونا چاہیے تھا۔

مجھے بہت ہی دکھ ہوا......میں نے کہا۔

''نواز! تمہاری سوچ اس قدر بچگانہ ہے یہ جان کر مجھے حیرت ہورہی ہے۔''

لیکن اس نے جیسے یہ سنا ہی نہ ہو کہ میں نے کیا کہا ہے۔ اس نے میرے ان الفاظ کو گالی تصور کیا۔ اس کی حالت یوں ہوگئی جیسے قتل کرنے سے قبل کسی جنونی کی ہوسکتی ہے۔ اس نے رسالہ کھینچ کر میرے منہ پر دے مارا اور زور سے چیخا۔

''مجھے طعنے دینے لگی ہو۔ میرے ذہن کی وسعت ناپنے لگی ہو۔''

اس کے دانت پس رہے تھے۔ چہرے کی ہڈیاں اور رگیں باہر ابھر آئی تھیں اور منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے جیسے وہ مکمل پاگل ہوگیا ہو...... پھر وہ دھاڑا۔

''میں آج تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آج میں اس روز روز کی اذیت کا خاتمہ کردوں گا۔''

وہ آگے بڑھا اور میری گردن کو دونوں ہاتھ میں دبوچ کر دبانے لگا۔ میری آنکھیں پھٹ کر باہر نکل آئیں میری زندگی اور موت میں بہت تھوڑا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جب اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے جیسے بے حس ہوگئے ہوں۔ شاید اس میں مجھے مار ڈالنے کی طاقت نہ تھی۔ پھر وہ برتن اور جو چیز بھی ہاتھ میں آتی اٹھا اٹھا کر توڑنے لگا۔ میں ایک طرف لڑھک گئی تھی اور سکتے کے عالم میں خشک آنکھیں لیے اس سارے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ پھر بہت کچھ توڑنے پھوڑنے کے بعد جیسے اس کا جنون ٹوٹ گیا۔ وہ باہر نکل گیا۔

اور میں ہر سوچ اور ہر احساس سے عاری پڑی رہی کیونکہ میں رو بھی نہ سکتی تھی...... کیونکہ رونے کے لیے بھی تو حسیات کا زندہ رہنا ضروری ہوتا ہے۔

☆☆☆

نواز اب وقت بے وقت گھر آنے لگا کبھی کہہ کر جاتا کہ آج دیر سے آؤں گا۔ اور جلدی چلا آتا۔ کبھی دن میں گھر کے کئی چکر لگاتا۔ میں کسی کام میں مصروف ہوتی اور دروازہ کھولنے میں ذرا سی دیر ہوجاتی۔ تو وہ سراغ رسانوں کی طرح مجھ پر جرح کرتا۔ گھر کا کونہ کونہ دیکھتا جیسے اسے یقین ہو کہ یہاں کوئی ضرور چھپا ہوا ہے...... ہر چیز کو اٹھا اٹھا کر دیکھتا...... جیسے وہ میرا پہرہ دے رہا ہو۔

عجیب زندگی تھی میری...... میں سوچتی جب کسی کو کسی پر اتنا بھی بھروسہ نہ ہو تو یہ عمر کیسے گزرے گی۔

بعض اوقات میرا جی چاہتا کہ میں اپنے اس حسین چہرے کو آگ لگادوں، تیزاب ڈال کر مسخ کردوں جو میرے لیے عذاب بن گیا ہے۔ میں بے بسی کے عالم میں سوچتی کہ کیا میری عزت کسی اعتماد کے قابل نہیں؟ آخر نواز کب تک مجھے یوں آزماتا رہے گا۔ کیا وہ مجھے ابھی تک جان نہیں سکا۔ پرکھ نہیں سکا۔ کیا میں اس کا اعتماد حاصل کرسکوں گی؟

پھر میں ایک عزم کے ساتھ سوچتی کہ ایسا ضرور ہوگا۔ لوگ تو برسوں کی ریاضت اور تپسیا کے بعد خدا کو پالیتے ہیں...... کیا میں نواز کا اعتماد حاصل نہ کرسکوں گی۔

☆☆☆

ایک روز میں کمرے کی پچھلی کھڑکی کھولے کمرے کی صفائی کررہی تھی کہ اچانک میری نظر باہر سامنے کی طرف جو اٹھی تو دیکھا سامنے بالکونی میں کھڑا ایک نوجوان مجھے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ میں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے اور جلدی سے کھڑکی کے پٹ بند کردیے۔ اس کے بعد میں نے وہ کھڑکی کبھی نہیں کھولی۔

پھر ایک دن اچانک کسی نے کال بیل بجائی۔ یوں کہ جیسے کوئی انگلی رکھ کر ہٹانا بھول گیا ہے۔ میں جلدی سے دروازے تک آئی اور پوچھا...... ''کون ہے؟''

جواب میں کسی بچے نے کہا۔ ''باجی...... دروازہ کھولیں۔''

میں شش و پنج میں پڑ گئی کہ دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں...... کہ اتنے میں بچے نے دوبارہ کہا۔

''باجی...... ! کھولیں نا!''

میں نے سوچا کہ شاید ساتھ والوں کا بچہ پانی لینے آیا ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو بچے نے وہیں کھڑے کھڑے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ تھماتے ہوئے کہا۔

''باجی! یہ آپ کا خط ہے۔''

میں ابھی بات کو سمجھی ہی نہیں تھی کہ بچہ نظروں سے غائب ہوگیا...... میں حیران حیران سی واپس پلٹی

اور وہیں صحن میں کھڑے کھڑے لفافہ چاک کیا۔ایک غیر مانوس سی تحریر میرے سامنے تھی۔ میں پڑھنے لگی۔لکھا تھا۔

''میں آپ کو نہیں جانتا...... میں یہ بھی نہیں جانتا کہ انجانے میں آپ سے کیا رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ میں کوئی کالج بوائے نہیں کہ جذبات میں بہہ رہا ہوں۔ ایک ذمہ دار انسان ہوں۔ پر آپ سے محبت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور اگر نا کام رہا تو سچ کہتا ہوں۔ شہر کی سڑکوں پر ایک اور پڑھے لکھے پاگل کا اضافہ ہو جائے گا۔''

میں غصہ سے تلملا اٹھی ''ذلیل۔کمینہ'' میرے منہ سے نکلا...... ''میں ہی ملی ہوں اسے یہ کھیل کھیلنے کے لیے'' مجھے جتنی صلواتیں یاد تھیں دے ڈالیں۔ میں خود ہی بڑ بڑا کر اپنا غصہ نکالنے لگی۔ میں فوراً اندر گئی ، ماچس اٹھائی اور اس کاغذ کو آگ لگا دی۔ پھر میرا جی چاہا کہ یہ خاک لے جا کر اس کے منہ پر ڈال دوں ۔میں نے فیصلہ کیا کہ نواز کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔

نواز جب واپس آیا تو اس کی تیوریاں آج کچھ زیادہ ہی چڑھی ہوئی تھیں۔آتے ہی بولا۔

''وہ بچہ کون تھا جو آج تقریباً دس بجے کوئی چیز دے کر گیا ہے؟''

میں سکتے میں کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی اور صرف اتنا پوچھا۔

''تمہیں کس نے بتایا ہے؟''

وہ دانت پیس کر بولا۔

''تو تم کیا سمجھتی ہو کہ یہاں جو کچھ میری غیر موجودگی میں ہوتا ہے۔ میں اس سے بے خبر رہتا ہوں۔ مجھے پل پل کی خبر ملتی رہتی ہے۔''

میں جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی رہ گئی اور سوچنے لگی کہ میرا اب کتنا کڑا امتحان باقی ہے۔ کتنی صدیوں کی تپسیا کے بعد میرا مجازی خدا مجھے ملے گا بھی یا نہیں۔

''وہ پھر چیخا۔''وہ کون تھا؟''

اس وقت تو میں نے بات بنا دی لیکن مجھے یہ سوچ کر بہت دکھ ہوا کہ نواز میرے پیچھے جاسوس لگا رکھے ہیں۔ میں روئی اور اتنا روئی کہ دن والا قصہ میرے دل و دماغ سے بالکل دھل گیا۔

شکاری کتا جب کسی جانور کو شکار کرتا ہے تو اسے ایک ہی بار پکڑ کر نہیں مار ڈالتا بلکہ پکڑ کر چھوڑ دیتا ہے۔ جانور موت کے منہ سے نکل بھاگتا ہے لیکن وہ پھر اسے پکڑ لیتا ہے اور منہ میں بھنبوڑنے لگتا ہے۔ جانور موت کو سامنے دیکھ آنکھیں بند کر لیتا ہے، لیکن وہ اسے پھر چھوڑ دیتا ہے۔ جانور پھر بھاگتا ہے لیکن کچھ دور جا نکلتا ہے تو اسے پکڑ لیتا ہے۔ اس طرح غریب جانور کو بار بار موت کے منہ میں جھونکتا اور پھر زندگی کی امید بخش دیتا ہے۔ اسے مارنے سے پہلے دیر تک جان کنی کی اذیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ اگر وہ اسے ایک بار ہی مار ڈالے تو وہ اتنی اذیت سے تو بچ جائے...... میری کیفیت بھی بالکل اسی مظلوم اور بے کس جانور کی سی تھی۔

☆☆☆......

اس دن میں گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف تھی کی اچانک پھر کال بیل پر کسی نے یوں انگلی رکھی کہ رکھ کر جیسے اٹھانا بھول گیا ہو...... میں دروازے پر آئی اور حسب معمول پوچھا۔''کون ہے؟''

جواب میں کسی بچے نے کہا۔''باجی دروازہ کھولیں''

میں نے دروازہ کھول دیا۔اس بچے پر نظر پڑتے ہی ایک بھولا بسرا چہرہ میرے ذہن میں ابھرا۔لڑکے نے جھٹ سے کہا۔''باجی! یہ آپ کا خط۔''

تب مجھے وہ چہرہ بڑا شناسا سا لگا۔لڑکا واپس بھاگنا چاہتا ہی تھا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور کہا۔

''آج میں تمہیں یوں نہیں جانے دوں گی'' میں نے ابھی بات مکمل بھی نہ کی تھی کہ اچانک کھلے دروازے سے نواز کو داخل ہوتا دیکھ کر میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور اپنی چیخ کو حلق میں ہی گھونٹ لیا۔ میری آنکھیں جو حیرت سے کہیں کانوں کے آس پاس تکھمٹ گئی تھیں اور پتھر ہو کر اسی پر جمی تھیں اور میری انگلیوں کی گرفت لڑکے کی کلائی پر

ا مسل پڑ گئی۔ لڑکا واپس بھاگ گیا تو اس کی ہتھیلی میں زخمی پرندے کی مانند پھڑ پھڑاتا ہوا لفافہ نیچے زمین پر گر پڑا۔ نواز جھپٹ کر اسے اٹھا لیا۔ میں دیوار کے سر تھ لگ کر ہانپنے لگی اور اپنی قسمت کا آخری فیصلہ سننے کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔ نواز نے لفافہ چاک کیا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے پڑھنے لگا۔ پھر وہ کاغذ فرش پر پٹخ کر کمرے میں گھس گیا۔

مگر میں زندہ تھی اس طرح کہ سانسوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ نہ جانے کتنی صدیاں مجھ پر سے گزر گئیں۔ پھر میں نے وہ کاغذ اٹھایا اور اسے بغیر پڑھے پرزے پرزے کر دیا۔ وہ پرزے ہوا کے دوش پر ادھر ادھر دیواروں سے سر ٹکرانے لگے۔ میں دیوار کے ساتھ چپنی سوچنے لگی کہ یہ کس طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

اس روز وہ خلاف توقع خاموش رہا۔ آج اس کا جنون کہاں سو گیا ہے؟ میں دیر تک کھڑی سوچتی رہی کہ میں اب اس کے پاس جاؤں یا اس کھولتے ہوئے لاوے کو اندر ہی اندر کھولنے دوں۔ اس کے باہر نکلنے کا راستہ نہ بناؤں...... لیکن ایسا کب تک ممکن ہو سکے گا۔

......☆☆☆......

رات اتر آئی تھی اور گھر میں یوں سکوت طاری تھا۔ جیسے کوئی طوفان آنے سے پیشتر فضا ساکن ہو جاتی ہے بہر حال میں مجرم نہیں تھی۔ اس سوچ نے میری ڈھارس بندھائی۔ میں کمرے میں آئی۔ اس کے قریب آ کر کہا۔

''نواز! دل میں کوئی بدگمانی نہ لانا۔ خدا کی قسم میں اس شخص کو جانتی تک نہیں۔ تم جا کر اس سے پوچھو کہ وہ ایسی بکواس کیوں لکھتا ہے؟''

نواز اٹھ بیٹھا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''بلقیس! میں نے بڑی کوشش کی کہ کس طور تم سے نباہ ہو سکے۔ لیکن میں غلطی پر تھا اور اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی کہ اس غلطی کو دہراتا ہی رہوں۔ تم آج سے آزاد ہو۔ جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔''

میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پھر بولا۔

''میرے اعصاب شل ہو گئے ہیں۔ دماغ کی نسیں چٹخ گئی ہیں۔ مر گیا ہوں میں۔ میں نے ان مہینوں میں لمحہ لمحہ عذاب جھیلا ہے'' اب جیسے جنون کے آثار اس پر طاری ہونے لگے وہ پھر بولا۔

''میں نے کئی بار چاہا کہ تمہیں مار ڈالوں اور خود کشی کر لوں۔ لیکن شاید میں بہت بزدل انسان ہوں مگر اب مجھ میں برداشت کی قوت ختم ہو گئی ہے۔ تم چلی جاؤ! آج سے اس گھر کے دروازے تم پر بند ہو گئے ہیں۔ میں...... میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''

طلاق کے لفظ نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں چلا اٹھی۔

''تم پاگل ہو نواز! جان جاؤ کہ تم پاگل ہو اور تمہارے اس پاگل پن نے مجھے بے موت مار ڈالا ہے'' میں غصے سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی۔ جی چاہتا تھا، اسے کچا چبا ڈالوں۔ مگر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بولا۔

''مجھ پر ہاتھ اٹھاتی ہے آوارہ عورت!'' یہ کہہ کر اس نے مجھے جھنجھوڑ کر تڑاخ سے فرش پر پھینک دیا۔ میری پیشانی فرش پر لگی اور اس سے خون پھوٹ گیا۔ میں غصہ سے بپھر گئی۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی اور چیخ کر کہا۔

''میں نے تمہارا ہر ظلم برداشت کیا ہے...... لیکن میں گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں خود مر جاؤں گی اور تمہیں بھی مار ڈالوں گی لیکن یہ کبھی نہ ہونے دوں گی۔''

اس نے پھر مجھے پکڑ لیا اور باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ وہ مجھے فرش پر گھسیٹتا ہوا دروازے تک لایا اور پاؤں کی ٹھوکر سے باہر پھینک کر کھڑاک سے بیرونی دروازہ بند کرتے ہوئے چلایا۔

''میں نے تمہیں طلاق دی۔ طلاق دی۔ طلاق دی۔''

میں دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹتی رہی اور چلاتی رہی کہ تم مجھ پر گھر کے دروازے بند نہیں کر سکتے لیکن شاید وہ آدھا پاگل انسان آج مکمل پاگل ہو گیا تھا۔ دروازہ پیٹتے پیٹتے میرے ہاتھ شل ہو گئے اور میں نے سدھ ہو کر وہیں گر گئی۔

خوفناک اندھیری رات پنجے پنجے پر اپنے پنجے

گاڑی رینگ رہی تھی۔ جنوری کی یخ بستہ رات میں ہوا تیز دھار نشتر بن گئی تھی۔ ٹھنڈی زمین پر میں بے حس پڑی تھی۔ اتنی وسیع دنیا میں میرے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی...... میں نہیں جانتی تھی کہ اب میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟ سامنے لمبی سیاہ سڑک سینہ کھولے ویران پڑی تھی۔ جو ہر کسی کو منزل کی طرف لے جاتی تھی۔ لیکن آج اس کے تمام راستے اور تمام منزلیں نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ میں انہیں کیسے تلاش کرتی۔ اچانک مجھے دور سے روشنی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جو سڑک پر آگے ہی آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ وہ ایک بھاری ٹرک تھا جس کی ہیبت ناک جسامت رات کے سناٹے میں اور بھی خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی روشنیاں ساری سڑک کو روشن کرتی ہوئی بڑھتی چلی آ رہی تھیں میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس روشنی نے جیسے مجھے ایک راہ دکھا دی اور میری آنکھوں میں فیصلے کی چمک ابھر آئی...... میں دوڑتی ہوئی گئی اور سڑک کے بیچوں بیچ اوندھے منہ لیٹ گئی۔ ٹرک قریب آتا چلا گیا...... میں نے دانت بھینچ لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ بس دو گھڑی دو گھڑی کی بات تھی۔ اس بھاری بلا نے مجھے روند کر گزر جانا تھا۔ اور میری ہڈیاں چیخ جاتی تھیں اور گوشت نے قیمہ ہو جانا تھا...... اور میں نے ہمیشہ کے لیے زندگی کے عذاب سے نجات پانی تھی۔

ٹرک میرے سر پر پہنچ گیا، میں نے اپنے دانتوں کو اور سختی سے بھینچ لیا اور پھر ایک خوفناک آواز پیدا ہوئی۔ مجھے ایسا لگا کہ ٹرک میرے مغز کو روندتا ہوا گزر گیا ہے۔ دوسرے ہی لمحے کسی نے مجھے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ میں نے ابھی تک آنکھیں بند رکھی ہوئی تھیں۔ تبھی میرے کانوں میں کسی کی انتہائی خباثت بھری آواز ٹکرائی۔

''اب آنکھیں کھول دو۔ ہمارے ہوتے ہوئے تم کیوں مرو۔ تمہاری جگہ ہم کیوں نہ مر جائیں۔''

میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اور ان مکروہ شکلوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ اپنے حکم کی یوں فوری تعمیل دیکھ کر وہ شیطانی ہنسی ہنسے اور بولے۔

''ہم اتنے ظالم نہیں ہیں کہ اس چاند سے چہرے کو کچل ڈالتے۔ ہم تو ایسے چہروں کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔''

میں سب کچھ جان گئی۔ میں نے پوری قوت سے چیخنا چاہا...... لیکن میری اس چیخ کو اندر ہی گھونٹ دیا گیا۔ اور یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ دوسرے ہی لمحے میں ٹرک کے اندر تھی...... جس میں بھیانک اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ اور وہ تیز رفتاری سے نہ جانے کس طرف رواں دواں تھا...... میں نے تو موت مانگی تھی لیکن قدرت کے خزانے میں میرے لیے موت کا سامان بھی نہ تھا۔ خود کو انسان کہنے والوں نے انسانیت اور آدمیت کی دھجیاں اڑا دیں۔ اور پھر مجھے ایسی جگہ پہنچا دیا، جہاں میں نہ جی سکتی تھی اور نہ مر سکتی تھی۔ میں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی لیکن شاید میں بہت ہی گناہ گار ہوں۔ کہ مجھے موت بھی نجات نہیں دلا رہی۔

یہ میری برسوں پر محیط زندگی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ مجھ سے کہاں، کس جگہ انجانے میں کیا گناہ سرزد ہوا ہے کہ جس کی اتنی کڑی سزا مل رہی ہے۔ شاید میں مظلوم ہوں...... لیکن پھر مجرم کون ہے؟

مرد! جو نئے افق تلاش کرنے کا عادی ہے۔ اس کی مثال تو سانپ کی ہے۔ جو بل کے باہر سیدھا چلتا ہے مگر بل میں داخل ہوتے ہی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ مرد بھی گھر سے باہر ساری زندگی سیدھا چلتا ہے۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی جون اور چال بدل جاتی ہے۔ میں بھی اس مرد کی ڈسی ہوئی ہوں۔ اس کے زہر نے میرے انگ انگ کو زخمی کر دیا ہے کہ آج اداسی میری نس نس میں رینگ گئی ہے۔ اس نے میرے روئیں روئیں کو چھید ڈالا ہے۔

دعا کریں مجھے اس زندگی میں پناہ مل جائے۔ میں اس زندگی کو دل و جان سے قبول کر لوں۔ مردوں کے اس معاشرے کی گھٹی گھٹی فضا میں سانس لینے کی عادی ہو جاؤں یا کل کا سورج مجھے موت کی پناہ میں دے دے۔

......☆☆☆......

کراچی سے اُس دوشیزہ کی کتھا، جس نے اپنی زندگی کو آپ ہی دیمک لگالی تھی۔

ہم سب عاشی کو نیا مکان بننے کی مبارک باد دینے اس گھر گئے تھے۔ دو کمروں پر مشتمل سادہ سا گھر حال ہی میں فواد نے بنوایا تھا۔ عاشی جب شادی ہو کر اس گھر میں آئی تھی تو وہ بالکل بوسیدہ اینٹوں کی چھت والا مکان تھا۔ بارہ سال جیسے تیسے کر کے عاشی نے اُس گھر میں گزارے اب جب فواد کے ہاتھ میں پیسا آیا تو اس نے اس کو نئے سرے سے تعمیر کروایا تھا۔ میں نے جو بات نوٹ کی وہ حیرت انگیز تھی۔ عاشی مجھے خوش نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ عجیب عجیب سی باتیں کر رہی تھی۔

''سمانہ میرے لیے دعا کرنا میں زندہ نہیں رہوں گی''۔ مجھے بڑا دھچکا لگا۔ عاشی کی بات سن کر۔''

عاشی تم ایسی بات کیوں کر رہی ہو۔ ایسی دعا منہ سے نکالنے سے پہلے کچھ اپنے بچوں کے بارے میں سوچ لو۔ خبردار جواب ایسی بات کہی بھی''۔

''سمانہ تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کیسی درد بھری زندگی گزار رہی ہوں۔ مجھے ان دردوں سے نجات ملے۔ اللہ میری زندگی میں کوئی خوشی دے۔ میں تنگ آگئی ہوں ایسی زندگی سے۔ یہ جو دل ہے نہ'' اُس نے اپنا ہاتھ سینے کے بائیں طرف رکھ کر کہا'' بڑا درد ہے یہاں درد کے بوجھ تلے دب گیا ہے۔ یہ اب ختم ہی ہونے والا ہے پھر مجھے نجات مل جائے گی اور دوسروں کو خوشیاں'' یہ کہتے ہی وہ زور زور سے ہنسے لگی اور ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اپنی انگلیوں کی پوروں سے آنسو پونچھ کر کہنے لگی۔

''یہ آنسو نہیں ہیں سمانہ، میرے ارمانوں کا خون ہے جو آنسوؤں کی شکل میں بہہ رہا ہے''

کیسا درد تھا اس کی آنکھوں میں، میں اپنے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ ''سمانہ یہ گھر میرے لیے نہیں بنا، نہ ہی اسے میرے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ تو بس وہ پھر خاموش ہوگئی۔ ''میری زندگی کے اب تھوڑے ہی دن باقی ہیں''۔ سچ کہا تھا عاشی نے کہ اس کی زندگی کے بس تھوڑے ہی دن باقی ہیں۔ وہ چند دنوں میں اتنی بیمار ہوئی کہ اُسے ہوسپٹل میں ایڈمٹ کیا گیا۔ اُسے آنتوں کا کینسر ہوگیا تھا۔ مگر جب تک اس کے ٹیسٹ وغیرہ ہوئے بہت دیر ہوگئی تھی۔ بیماری اپنی آخری اسٹیج پر تھی اور وہ چند ہفتوں میں ہی اپنے تمام دکھوں سے نجات پاگئی۔ اپنے بچوں کو بلکتا چھوڑ کر وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئی۔ پتا نہیں کیسا دکھ تھا، جو اُسے اندر ہی اندر کھا گیا تھا۔

عاشی کی موت کا اکیسوں دن تھا کہ فاطمہ پھوپی

کی زبانی یہی معلوم ہوا کہ فواد شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ بھی زوبی سے‘‘

یہ بات سُن کر ہی شاکڈ رہ گئی۔ پورے خاندان میں چہ میگوئیاں ہورہی تھیں۔ کہ کیسا شوہر ہے بیوی کے چالیسویں تک بھی صبر نہ کرسکا اور شادی کی خواہش کی بھی تو اپنی سالی سے کرنے کی۔ یہ ہی غم بچاری عاشی کو کھا گیا۔

لوگ طرح طرح کی باتیں کررہے تھے مگر حقیقت کیا تھی کیسے معلوم۔ کوئی زوبی کی تعریفیں کررہا تھا کہ کتنی بڑی قربانی دے رہی ہے زوبی۔ اتنا اچھا گھر جوان منگیتر چھوڑ کر بہن کے بچوں کی خاطر اپنے بہنوئی سے شادی کررہی ہے۔ یہی بات جب میں نے زوبی کی بڑی بھابی سے کی تو وہ کہنے لگی

’’کوئی قربانی وربانی نہیں دی زوبی نے بلکہ اپنی بہن عاشی کو قربان کیا ہے اُس بدبخت نے۔ اِسی کا درد وغم عاشی کو کھا گیا۔‘‘ اُس نے صرف مجھے اپنی دُکھی داستان سنائی تھی۔ اپنے دل کا بوجھ وہ مجھے بتا کر ہلکا کرتی تھی جو کچھ عاشی نے اپنی بھابی کو بتایا تھا۔ وہ میں عاشی کی ہی زبانی قارئین کے گوش گزار کررہی ہوں۔

میں جب رخصت ہوکر فواد کے گھر آئی تو اپنے ساتھ بہت سے خواب آنکھوں میں سجا کر آئی تھی۔ ہر لڑکی کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ میرا اپنا گھر ہو جس پر صرف اور صرف میری حکومت ہو۔ جان نچھاور کرنے والا شوہر ہو، جو میری ہر خواہش آنکھیں بند کرکے پوری کرے جو مجھے نگری نگری گھمائے۔ مجھ پر کوئی روک ٹوک نہ ہو۔ میرے سارے خواب پورے ہوئے مگر صرف تھوڑے عرصے کے لیے۔

جب مجھے آسمان سے زمین پر پٹخا گیا تو میں ریزہ ریزہ ہوگئی۔ شادی کے شروع میں فواد نے مجھے بے پناہ محبت دی۔ وہ میری ہر خواہش پوری کرتے، باہر گھمانے پھرانے لے جاتے، کھانا بھی اکثر باہر ہی کھاتے۔ میری ساس ہمارے گھر میں جو کھانا پکاتیں وہ میں کھاتی نہیں تھی‘‘۔

کہتی کہ ایسا بدمزا کھانا میں نہیں کھا سکتی‘‘ پھر فواد مجھے باہر کھانا کھلانے لے جاتے یا باہر سے لے کر آتے۔

میری ساس بہت اچھی عادت کی مالک تھی مگر پھر بھی مجھے اُن سے خدا واسطے بیرا ہو گیا تھا۔ گھر میں صرف ہم تین فرد تھے۔ ایک نند تھی، وہ بھی شادی شدہ تھی۔ میری ساس مجھ پر روک ٹوک بھی نہ کرتی تھیں پھر بھی میں انہیں زچ کرتی۔ ان کا وجود مجھے کھٹکتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ یہاں سے چلی جائیں۔ اس گھر پر صرف میری حکمرانی ہو"

میں نے انہیں اتنا تنگ کیا، فواد کو بھی ان کے بارے میں الٹی سیدھی پٹیاں پڑھائیں۔ وہ بھی اپنی ماں سے تنگ آ گئے پھر آخر میں کامیاب ہو گئی۔ میری ساس اپنی بیٹی کے پاس چلی گئیں، ہمیشہ ہمیشہ کیلیے اور یہیں سے میری بدبختی کا آغاز ہوا۔ میری ساس جنت تھی میرے پاس جو میں نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے کھو دی اور اپنے گھر کو دوزخ بنالیا۔

بزرگ ہمارے سروں پر گھنے سائے کی طرح ہوتے ہے جو ہمیں تکلیف اور مصیبت سے بچاتے ہیں۔

میں اُمید سے تھی ڈلیوری کے دن قریب تھے۔ فواد نے مجھے میرے میکے بھیج دیا۔ وہاں میری گود بھرائی کی رسم ہوئی میری ساس بھی آئیں۔ میرے خراب رویے کے باوجود مجھے ڈھیروں دعائیں دیں۔ وہ دن بھی آ پہنچا جب میں نے ایک پیاری سی بیٹی کو جنم دیا۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ میری ساس بھی پوتی کو دیکھنے آئی۔ میں کچھ دن میکے میں رہی پھر فواد کے کہنے پر اپنے گھر آ گئی۔

میری امی نے میری بہن زوبیہ کو میرے ساتھ بھیج دیا کیونکہ چھوٹی بچی کے ساتھ کام کاج میں مشکل ہوتی ہے۔ زوبیہ میرا بھی خیال رکھتی، میری بیٹی اقراء کے کپڑے وغیرہ دھوتی اور گھر کے چھوٹے بڑے کام بھی کرتی۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ میں نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ زوبیہ سولہ سال کی تھی یہ عمر نوخیز کلی سے گلاب بننے کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں عام سے عام لڑکی بھی بہار کی طرح لگتی ہے۔ زوبیہ تو پھر بھی حسین تھی اور اُسے پہننے اوڑھنے کا شوق بھی بہت تھا۔ وہ اکثر میرے جہیز کے کپڑے پہنتی ۔ میرے پراندے بالوں میں ڈالتی۔ میں اُسے منع نہیں کرتی تھی کہ وہ برا نہ مان جائے۔ بچی ہے اپنے شوق پورے کر رہی ہے میری سوچ بس یہی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ کیا گل کھلا رہی ہے۔

میری موجودگی میں وہ فواد سے ہنسی مذاق کرتی، اُس سے باتیں کرتی مگر پتا نہیں کب شیطان نے اُن دونوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ وہ دونوں کب شیطانی کھیل میں مصروف ہو گئے مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ پھر جب امی اُسے لینے آئیں۔ وہ اُداس تھی اور امی کے ساتھ چلی گئی۔ پھر بھی وہ ہفتے میں ایک یا دو دنوں کے لیے آجاتی۔

میں پھر اُمید سے ہوئی تو فواد نے مجھے زوبیہ کو بلانیکے لیے کہا کہ وہ یہاں ہوگی تو تمہارا بھی خیال کرے گی اور اقراء کا بھی، تم پریگنٹ ہو گھر کے کام وغیرہ کر کے تھک جاتی ہو۔ میں تمہارے لیے کہہ رہا ہوں۔ وہ تمہاری بہن ہے۔ ایسے دنوں میں وہی کام آئے گی تمہارے۔"

پھر میں نے زوبی کو بلا لیا مگر اب اُن دونوں کی حد سے بڑھی بے تکلفی مجھے سب سمجھا گئی۔

میں نے فواد کو یہ بات کہی تو وہ سرے سے ہی مکر گیا۔

"تم ہم پر بلاوجہ شک کر رہی ہو۔ تمہیں اپنی بہن پر بھروسا نہیں۔ تم شکی مزاج عورت ہو"

پھر جب میں نے زوبی کو واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا تو وہ بھڑک اُٹھا۔

"زوبی یہیں رہے گی جب تک تم فارغ نہیں ہو جاتیں"

میں نے کہا بھی کہ میں اپنے کام کاج خود ہی کر لونگی۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں"

دوسرے ہی دن میں نے اپنے بھائی کو بلا کر زوبی کو واپس بھیج دیا۔ وہ جانے پر رضامند نہ تھی، بہت افسردہ ہو کر ہو گئی۔

اُس کے جاتے ہی فواد کا رویہ میرے ساتھ بہت خراب ہو گیا، ایک ہفتہ زوبی کے بغیر اُس نے جیسے تیسے کر کے گزارہ پھر اُس نے مجھے زبردستی زوبی کو فون کر کے بلانے کا کہا۔ میں نے انکار کیا تو وہ مجھے مارنے لگا۔ میری حالت اس کی مار برداشت کرنے کی

قطعی نہ تھی سو نہایت مجبور ہو کر میں نے زوبی کو بلالیا۔ وہ یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ فواد بھی اُس کے آنے پر بہت خوش تھا، نا خوش تھی تو میں۔

میرا رویہ زوبی کے ساتھ ٹھیک نہ تھا پھر بھی وہ بے غیرت بن کے میرے گھر میں رہ رہی تھی۔ اب تو سب کچھ کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے تھا۔

''فواد مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ تم آخر چاہتے کیا ہو۔ تم کیوں میری بہن کے ساتھ اتنے بے تکلف ہو۔ جیسے میں تمہاری بیوی نہیں وہ تمہاری بیوی ہے۔''

غصے اور اشتعال سے میں پاگل ہو رہی تھی۔

''کاش ایسا ہوتا تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا'' فواد نے سرد آہ بھری۔ اس کے جواب پر میں آگ بگولہ ہو گئی۔

''فواد میں اب تم دونوں کی رنگ رلیاں برداشت نہیں کر سکتی۔''

مجھے تمہارا ڈر نہیں۔ میں محبت کرتا ہوں زوبی سے۔ اگر تم نے کسی کو بتایا تو تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں ۔ویسے بھی اگر تم نے ہمیں بدنام کرنے کی کوشش کی تو کیا تمہاری بیمار ماں یہ صدمہ برداشت کرلے گی؟ وہ نہ تم پر طلاق کا دھبہ برداشت کرے گی اور نہ ہی زوبی کی رسوائی'' وہ مکروہ ہنسی ہنستا ہوا گھر سے نکل گیا۔

میں نے زوبی کو بھی بہت سمجھایا مگر وہ عشق کے نئے خمار میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے نہ اپنی عزت کا خیال تھا نہ اپنی بہن کے گھر اجڑنے کا۔

پھر میری ڈلیوری ہو گئی۔ میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ مجھے اب کچھ امید بندھی کے شاید اب وہ سدھر جائے مگر اُسے نہ سدھرنا تھا نہ سدھرا۔

اب اگر زوبی ایک ہفتہ اپنے گھر ہوتی تو مہینہ ہمارے گھر۔ وہاں جاتے ہی وہ بیمار ہو جاتی تھی۔ بیماری کا وہ ناٹک کرتی تھی۔ ہمارے گھر میں وہ بھلی چنگی ہوتی۔

سادہ لوح ماں باپ یہ کہتے ہے کہ اُسے اپنا گھر راس نہیں آتا۔ یہی ٹھیک ہے۔ یہ بھی اس کی بہن کا گھر ہے''

اب میں اپنے غریب ماں باپ کو زوبی کی بیماری

کیا بتاتی۔ وہ پہلے ہی اپنی دوسری بیٹیوں کی وجہ سے پریشان تھے۔ میری دوسری بہن جو مجھ سے چھوٹی تھی۔ وہ اپنے ہی محلے میں بیاہی گئی تھی، اس کے سسرال والے اس پر بہت ظلم کرتے تھے مگر میرے ماں باپ اُسے ہر حال میں سسرال ہی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُس کی طلاق ہو اور وہ اُن کی دہلیز پر آ کر بیٹھے۔ میری دوسری بہن کی ایک ہی گھر میں شادی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بھی خود نوکریاں کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی تھیں۔ ان کے شوہروں کا کھلا روزگار تھا، جس میں اس مہنگائی کے زمانے میں گزارہ مشکل تھا۔

اب میں اپنی پریشانی بیان کر کے اُنہیں پریشان نہیں کر سکتی تھی۔

میرے ماں باپ کا چھوٹا سا گھر تھا، جس میں دو کمرے تھے ایک کمرہ شادی شدہ بھائی کا اور ایک کمرے میں امی ابو، دو بھائی ایک بیمار بہن اور ایک زوبی جو اب زیادہ تر میرے گھر میں ہوتی تھی۔ اب میں کیسے ان کے غموں میں اضافہ کرتی۔ اب میری توجہ کا مرکز صرف اور صرف میرے بچے تھے۔ میں صرف اور صرف اپنے بچوں کی ماں تھی۔

فواد اور زوبی کے ساتھ میرے بچے اور میں بھی گھومنے جاتے کیونکہ وہ دونوں اکیلے تو جا نہیں سکتے تھے۔ ہمارا سہارا لازمی تھا ورنہ وہ دنیا والوں کی نظر میں آ جاتے۔

اب بھی زوبی کا یہی حال تھا، کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ اسے وہاں کچھ زیادہ دن ہو جاتے تو فواد میرے سر ہو جاتا تھا کہ اسے جلدی بلاؤ۔ اب کوئی اندازہ لگائے کہ اس وقت میرے دل کی حالت کیا ہوتی ہوگی۔ چڑیل بھی چار گھر چھوڑ کر نقب لگاتی ہے مگر میری بہن میں خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ بچپن ہی سے خالہ فاطمہ کے بیٹے علی سے منسوب تھی۔ علی ہر لحاظ سے فواد سے بہتر تھا۔ وہ زوبی کا ہم عمر، خوبصورت اور وجیہہ نوجوان تھا۔ اچھی عادتوں کا مالک مگر زوبی اس کے لائق ہی نہ تھی۔

زوبی اور فواد کے غم نے مجھے اندر ہی اندر گھلا کر رکھ دیا تھا۔ بیماری میرے اندر پنپ رہی تھی، صرف اور صرف اُن دونوں کی وجہ سے یا شاید میری نادانی کی وجہ سے۔ میں نے جو کچھ اپنی ساس کے ساتھ کیا، مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ میں نے کتنا غلط فیصلہ کیا تھا۔ اپنے پیروں تلے سے خود ہی جنت نکال لی تھی۔ میری ساس اب بھی کبھار ہی ہمارے گھر آتی تھیں۔ میں نے ان سے معافیاں مانگیں۔ انہوں نے مجھے معاف کر دیا مگر میرے اصرار پر بھی وہ یہاں رہنے کے لیے رضامند نہ ہوئیں۔

زوبی کو میرا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ میں زوبی کی وجہ سے اس حال کو پہنچی ہوں مگر اس کم بخت کو ذرا رحم نہ آتا۔

''بتاؤ بھابی میں کیا کروں۔ جب اپنے ہی اتنے ستم کرتے ہیں تو انسان اندر ہی اندر ختم ہو جاتا ہے۔''

عاشی نے صحیح کہا تھا اپنوں کے ستم اندر سے ختم کر دیتے ہیں اور وہ ختم ہوگئی۔

عاشی کی جب طبیعت بہت خراب ہوئی تو اس نے ہوسپٹل میں اپنی خالہ علی کی ماں کو کہا کہ خالہ میرے مرنے کے بعد آپ زوبی کی شادی فواد سے کروا دینا۔ یہ ہی سب کے حق میں بہتر فیصلہ ہوگا۔ آپ علی کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈنا۔ ویسے بھی زوبی علی کے قابل نہیں''۔

عاشی کے مرنے کے بعد جب فواد نے زوبی سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو خاندان والوں نے بہت مخالفت کی تھی۔ فاطمہ خالہ نے عاشی کی خواہش کا بتا کر سب کو خاموش کروا دیا کہ فواد کہیں نہ کہیں تو شادی کرے گا ہی۔ دوسری عورت پتا نہیں کیسی ہو، بچوں کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ زوبی تو پھر بھی خالہ ہے۔ ماں جتنا نہیں خالہ جتنا پیار تو دے گی ہی۔''

اس کے ظالم شوہر اور خود غرض بہن نے اس کی قبر کی مٹی سوکھنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ چالیسویں کے فوراً بعد ان دونوں کا نکاح ہو گیا۔ عاشی کی شاید زندگی اتنی ہی تھی۔ وہ اکثر اپنے لیے رب سے موت مانگتی تھی۔ کیونکہ کچھ لوگ زندگی کو دیمک بن کر کھوکھلا کر دیتے ہیں۔

......☆☆☆......

ساتویں سچ بیانی

علاج

کوثر خان

نفسیاتی مسائل کا شکار ایک دوشیزہ کی توجہ طلب کتھا

''خالہ جلدی چلو نوراں باجی کو پھر دورے پڑ گئے ہیں''

محلے کا کوئی بچہ خالہ نفیسن کو جو کچھ دیر پہلے ہی پڑوس میں آ کر بیٹھی تھیں ڈھونڈتا ہوا آ پہنچا۔

''اللہ خیر'' خالہ نے فوراً اپنا ٹوپی والا برقعہ سنبھالا اور گھر کی جانب دوڑیں۔ نفیسن خالہ کا کنبہ راجن پور میں آباد تھا دو بیٹیاں سلمٰی اور نوراں تھیں۔ میاں صاحب، خالہ کے شوہر ایک مل میں منشی تھے۔ میاں صاحب کے زیادہ تر رشتہ دار فیصل آباد میں رہائش پذیر تھے۔ میاں صاحب میٹرک پاس تھے۔ خالہ چٹی ان پڑھ جبکہ نوراں آٹھ جماعتیں پاس تھی۔ البتہ سلمٰی کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا سو وہ میٹرک کے بعد اپنی پھوپو کے پاس فیصل آباد چلی گئی تھی تاکہ آگے پڑھ سکے۔

اب وہ ایف اے کے امتحان دے رہی تھی۔

نوراں سولہویں سال میں تھی جب خالہ نے اپنے رشتہ کے بھانجے سے اسے بیاہ دیا۔ کام چور تو تھا ہی شادی کے بعد پتا چلا کہ وہ نشئی بھی ہے۔ نشے میں دھت نوراں کو پیٹتا جس کی وجہ سے وہ ایک بار ماں بننے سے بھی محروم رہ گئی۔ مگر اشرف پھر بھی نہ سدھرا بلکہ بری صحبتوں میں ہی وقت گزارتا۔ کچھ عرصہ بعد اللہ نے نوراں کو ایک بیٹی سے نوازا سب کا خیال تھا اب اشرف سدھر جائے گا مگر یہ سب خام خیالی ہی تھی۔ ان ہی لڑائی جھگڑوں اور اشرف کے فساد نے نوراں کا گھر بسنے نہ دیا۔

''کیا ہوا نوراں ہوش کر''

خالہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں نوراں کی وحشت زدہ آنکھیں اور بکھرے بال دیکھ کر ان کے ہاتھ پیروں سے جان نکل گئی۔

''کیا ہوا پتر؟''

مگر نوراں بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالہ کو دیکھتی گئی۔ پہلے بھی نوراں کو کئی بار ایسے دورے پڑے مگر وہ کبھی ہنستی تھی کبھی رونے لگتی مگر اب تو عجیب ہی حلیہ ہو رہا تھا۔

''اے پتر کی تاڑے تیرا تو چھیتی ماسی شیداں نوں بلا لا، وہ کچھ جھاڑ پھونک کریگی اس پر''۔

خالہ نے اسی محلے کے بچے کو مخاطب کیا جو انہیں بلا کر لایا تھا۔ اور وہ آناً فاناً ماسی کو بلا لایا۔

''ویکھ ماسی کی ہویا میری دھی نوں''

''ہٹو پرے سب ای کی رش لگایا اے''

آس پڑوس کے لوگ جمع ہو چکے تھے، ماسی نے سب کو پرے کیا اور خود عجیب عجیب کلمات ادا کرنے لگی، تھوڑی دیر بعد وہ خالہ سے مخاطب ہوئی۔

''نہ نفیسن یہ میرے بس کا نہیں، کئی بار دسیا سائیں بابا کو وخا۔ پر تو جھلی تو نے سنیا ای نئی''

''پر ماسی ہویا کی اے دس تو''

''ارے کی ہونڑا اے، جن نے قبضہ کرلیا ہے تیری دھی پر۔'' یہ سن کر محلے کے لوگ ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سنگ۔

''ہائے میں مرگئی'' خالہ نے اپنے سینے پہ دو ہتھڑ جڑے۔

''اب میں کی کروں، ماسی کچھ تو کر!''

''میں نے منتر پڑھے ہیں، چنگی ہو تو جائے گی پر تو جب تک ڈیرے وچ نئی لے کے جائے گی گم نئی نبڑے گا۔ تو سوچ سمجھ لے۔ شام تک میرے ویہڑے آجانا، ہن میں چلی آں۔''

''نوراں، نوراں پتر!'' خالہ نے ڈرتے ڈرتے نوراں کو آواز دی۔ اب اس پر پہلے والی کیفیت نظر آنے لگی، اس کے آنسو تواتر سے بہنے لگے پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ خالہ کو پکا یقین ہوگیا کہ یہ سب جن کر رہا ہے۔

''اماں، کہاں جا رہے ہو تم لوگ''

ابھی سلمٰی گھر میں داخل ہو رہی تھی کہ اماں اور نوراں کو برقعے میں دیکھا، ''ہم ذرا سائیں بابا کے ڈیرے تک جا رہے ہیں۔''

''تو تو ٹھیک ہے پتر؟''

''ہاں اماں، میں تو ٹھیک ہوں پر باجی ٹھیک نہیں لگ رہی؟ کیا ہوا اماں؟''

''ہونڑا کی ہے پتر وہی دورے پڑتے ہیں۔ ماسی شیداں نے بتایا ہے، جن نے قبضہ کرلیا ہے۔ وہی اُتار کرانے جا رہی ہوں۔''

"یہ کیا کہہ رہی ہو اماں! کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی چلو باجی چادر اتارو۔"

"ارے کیا باؤلی ہوئی ہے۔ بہن بیمار ہے اور تو منع کر رہی ہے۔"

"ہاں اماں اسی لیے منع کر رہی ہوں کہ باجی بیمار ہے۔ کوئی جن ون نہیں ہے۔ سب جہالت ہے، حد ہوگئی اماں اب کوئی عورت اتنے صدمے سہے، شوہر کے ظلم سہے، پھر جب شوہر چھوڑے تو طعنے بھی وہی سہے، اپنے جگر گوشے، اپنی ہی بیٹی کو نہ دیکھ سکے، کوئی جب ماں سے اس کا بچہ چھین لے تو عورت صدمے سے پاگل ہو ہی جائے گی، کیا ہے یہ، کچھ عقل کے ناخن لیں اماں، اس ماسی نے جو خود مہینوں کنگھا نہیں کرتی، جو نماز نہیں پڑھتی، منہ سے جس کے بدبو کے بھبکے اٹھتے ہیں اس نے بتایا کہ باجی پر جن ہے اور آپ ایمان لے آئیں، خدا کا خوف کریں اماں۔ کیوں باجی کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہیں۔"

"نہ میں کیوں دشمن ہونے لگی اپنی دھی کی، مجھ سے اس کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ اگر اس پر جن نہیں ہے تو یہ کبھی ہنستی کیوں ہے اور خود خود رونے کیوں لگتی ہے، آنکھوں میں ایسی وحشت ہوتی ہے کہ مجھے ہول اٹھتے ہیں۔"

"اماں یہ ایک قسم کی بیماری ہے جو ذہنی پریشانی اور صدمے کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔ ابھی میں چھٹیوں میں آئی ہوئی ہوں۔ دیکھو کیسے باجی کو ٹھیک کرتی ہوں بس اب آپ کہیں نہیں جائیں گی اور جیسا میں کہوں گی وہ کریں گی۔"

سلمیٰ نے نوراں کی چادر اتار دی اور اسے چارپائی پر بیٹھایا جبکہ نوراں بے آواز رو رہی تھی۔

"لے چار جماعتیں کیا پڑھ لیں، تُو تو ہم پر حکم ہی چلانے لگی۔"

اماں نے خفگی سے برقع اتارا۔

"اماں ذرا چائے تو پلا دو بہت تھکن ہو رہی ہے۔" سلمیٰ نے بہانے سے اماں کو بھیجا۔

"اور باجی کیسی ہو؟ مجھے یاد کیا تھا؟"

سلمیٰ نے نوراں کا ہاتھ تھام کر پوچھا پر نوراں کچھ نہیں بولی ٹکر ٹکر سلمیٰ کو دیکھنے لگی۔

"چلو جب تک اماں چائے لاتی ہیں میں تمہارے سر میں تیل لگا دوں۔"

سلمیٰ نوراں کے بالوں میں تیل بھی لگاتی جاتی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جاتی۔ اپنے کالج کے

قصے، پھوپو کے گھر کی باتیں غرض کہ چائے ختم ہونے تک وہ پٹر پٹر بولتی رہی، مگر نوراں کچھ نہ بولی۔ سلمیٰ کو بے حد دکھ ہوا۔ کئی بار آنکھوں میں نمی آئی مگر اس نے ضبط سے کام لیا اور تہیہ کیا کہ چند ہی دنوں میں باجی کو صحیح حالت میں لانا ہے۔

☆☆☆......

''ابا مجھے آپ سے ضروری بات کرنی۔'' رات کو جب سلمیٰ کا باپ واپس آیا تو کھانے کے بعد سلمیٰ نے باپ سے کہا۔

''ہاں پتر بول کیا بات ہے؟''

ابا آپ تو پڑھے لکھے اور سمجھدار ہو، باجی کی اس حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ آپ کو سب پتا ہے۔ جس کی پیدا شدہ بچی، ماں کے لمس سے محروم ہو جائے، تو یہ بچی اور اس کی ماں کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی ہے، باجی نے اپنی شادی کے چار سالوں میں اتنے دکھ سہے ہیں کہ وہ نفسیاتی مریضہ بن گئی ہیں۔ میں تو پوری کوشش کرتی ہوں ان کو اصلی حالت میں لانے کی، پھر بھی ابا، باجی کا علاج بھی ضروری ہے۔''

پر پتر یہاں اس کا علاج کون کرے گا؟'' ابا نے فکرمندی سے کہا۔

''ابا میں باجی کو شہر لے جانا چاہتی ہوں، پھوپا باجی کا علاج کروا دیں گے پر ابا میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ حسن بھائی (پھوپی زاد) سے بات کریں کہ باجی کی بچی واپس مل جائے، ان سے کہیں وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں بلکہ ابا اس کی تو نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اشرف حد درجہ لالچی ہے اس کو کچھ رقم دیدی جائے یا ڈرا دھمکا کر مطالبہ کریں۔''

''پتر تُو تو بڑی سیانی ہو گئی ہے۔'' ابا نے اپنی معصوم، پیاری سی بیٹی کو شفقت سے دیکھا۔

''نہ ابا یہ صرف تعلیم کا اثر ہے، تعلیم انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ اگر گاؤں کا ہر فرد پڑھ لکھ جائے تو یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود پسماندگی خود بخود ختم ہو جائے گی۔''

آج سلمیٰ کو گاؤں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور ان سات دنوں میں نوراں میں جو تبدیلیاں آئی تھیں، اس سے اماں کو یقین ہو گیا تھا کہ نوراں کے دوروں کی اصل وجہ کیا تھی، نہ صرف یہ کہ نوراں کے دوروں میں کمی آئی تھی بلکہ اب وہ سلمیٰ کی باتوں کے بھی جواب دینے لگی تھی۔ صبح سب لوگ فیصل آباد جا رہے تھے اور نوراں سلمیٰ کے ساتھ مل کر پیکنگ کروا رہی تھی۔

''باجی آپ کو آگے پڑھنے کا شوق ہے؟'' سلمیٰ نے نوراں سے پوچھا۔

''پتا نہیں سلمیٰ اب تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا، کچھ سوچتی ہوں تو دماغ میں درد سا ہونے لگتا ہے۔''

''وہ اس لیے کہ الٹا سیدھا سوچتی ہو، اچھی اچھی باتیں سوچا کریں، جو ہوا اسے بھول جائیں۔ ہم سب ہیں، ہمارے بارے میں سوچیں۔ ابا تمہاری وجہ سے فکرمند رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو مصروف رکھو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پڑھو گی نا آگے؟''

''ہوں، کوشش کروں گی۔''

پھوپو، پھوپا حسن بھائی، شیراز اور مونا سب ہی بہت محبت کرنے والے لوگ تھے، نوراں کو سائیکاٹرسٹ کو دکھایا گیا، وہاں ہنستے کھیلتے ماحول میں نوراں بہت خوش رہتی۔ مکمل علاج اور دیکھ بھال سے نوراں اپنی زندگی میں واپس لوٹ آئی، حسن بھائی ایک بڑے وکیل تھے چند ماہ قبل ان کی بیوی ایک حادثے میں فوت ہو گئی تھی، سلمیٰ کی کوششوں سے نوراں کی شادی حسن بھائی سے ہو گئی اور تو اور اس کی بیٹی بھی اسے مل گئی۔ سلمیٰ تو پہلے ہی سے شیراز سے منسوب تھی، غرض زندگی اسی ڈگر پر لوٹ آئی، نوراں نے آگے پڑھنا شروع کر دیا ہے اور حسن اس کی بہت مدد کرتا ہے، سلمیٰ اور شیراز کی شادی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہو گی مگر وہ تعلیم کے سلسلے میں یہیں رہتی ہے، اور نوراں کی خوش حال زندگی دیکھ کر اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اب کبھی نوراں دکھی نہ ہو، مستقبل میں اس کا ارادہ گاؤں میں اسکول کھولنے کا ہے تاکہ علم کی روشنی گھر گھر پہنچائی جا سکے۔

☆☆☆......

انوکھا نشہ

کراچی میں مقیم، دنیا کے انوکھے نشے کے شکار ایک نوجوان کی سچ بیتی۔

بہت سناٹا تھا۔ ہر سو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سخت سردی کی وجہ سے خون رگوں میں جما جا رہا تھا۔ کہیں دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو کوستا ہوا لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ پتا نہیں مجھے کیا ضرورت تھی اس سردی میں گھر سے نکلنے کی۔ چوکیدار کا خوف بھی تھا کہ کہیں وہ مجھے چور ہی نہ سمجھ لے۔ اس آبادی میں متوسط طبقے کے لوگ آباد تھے۔ تمام ہی گھر پکے اور دو منزلہ بنے تھے۔ نوکری پیشہ لوگ تھے اس لئے تقریباً دس بجے ہی گلیاں سنسان ہو جاتی تھیں اور صبح فجر کے بعد سے ہی دوبارہ زندگی رواں دواں ہو جاتی تھی۔

میں خود بھی ایک پرائیوٹ بنک میں اچھی پوسٹ پہ تھا اور صبح نو بجے تک مجھے بھی بنک پہنچنا ہوتا تھا۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی میں کمبل اوڑھ کے سو جاؤنگا۔ کیا کروں اس کمبخت نشے کی وجہ سے بڑی خواری اٹھانی پڑتی تھی۔ میں اس نشے کی لت میں تقریباً دو سال قبل گرفتار ہوا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ لت بہت پختہ ہو گئی تھی۔ نشے کا نام سن کر آپ کے ذہن میں یہی آ رہا ہوگا کہ میں چرس، شراب، افیون یا ہیروئین جیسی چیزوں کا نشہ کرتا ہوں گا مگر نہیں میرے نشے تک آپ کی سوچ نہیں جا سکتی۔ میری حقیقت جاننے کے لیے میری پوری کہانی پڑھیے۔

میں اس وقت کو آج بھی گالیاں دیتا ہوں جب شیریں مجھ سے مارکیٹ جانے کی ضد کر رہی تھی۔ شیریں میری چھوٹی بہن ہے۔

''ندیم بھائی مجھے مارکیٹ لے چلیں۔ بس سینڈل لینی ہے۔ پندرہ منٹ کا کام ہے اور کچھ نہیں لینا ہے''

''یار شیریں تم پندرہ منٹ کا کہہ کر ایک گھنٹہ لگا دو گی۔ مجھے مارکیٹ میں گھومنا بہت برا لگتا ہے۔ سینڈل لے کر تم کسی کاسمیٹک شاپ میں گھس جاؤ گی۔ میں بیوقوف بنا تمہارے پیچھے پیچھے گھومتا رہوں گا۔ اگر تمہاری کوئی دوست مل گئی تو اس کے ساتھ گپیں لگانے لگو گی اور میں کھڑا رہوں گا کہ کب شہزادی صاحبہ فارغ ہوں، کب غلام انہیں لے کر گھر جائے۔''

''ندیم بھائی آپ بھی بات کی کہانی بنا دیتے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا، مجھے بس سینڈل خریدنا ہے۔ میرے اچھے بھائی پلیز لے چلیں ورنہ امی سے کہلوا دوں گی تو لے جانا ہی پڑیں گا۔''

''چل میری ماں! امی کی دھمکی کیوں دیتی ہے

لیکن صرف پندرہ منٹ۔ دیر ہو جائے گی تو وہیں چھوڑ کے آجاؤں گا۔"

"پرامس! دیر نہیں ہوگی"۔

میں شیریں کو قریبی مارکیٹ لے گیا۔ مرجان شوز مارکیٹ کی سب سے بڑی دکان تھی۔ شیریں اور امی وہیں سے جوتوں اور سینڈل کی خریداری کرتی تھیں۔

شیریں دکان کے اندر چلی گئی جبکہ میں وہیں دکان کے باہر لگی ٹیبل پہ سینڈل اور چپلوں کے ڈیزائن دیکھنے لگا۔ سینڈل دیکھتے دیکھتے انجانے میں سینڈل کو ناک کے قریب کر کے لمبی سانس لینے لگا۔ میں نے دو تین لمبی سانسیں بھریں...... کیا مسحور کن خوشبو تھی۔ یہی وہ منحوس لمحہ تھا جب میں اس نشے کا عادی بنا۔ میں نے سینڈل

رکھ کر دوسری سینڈل اٹھائی اور پھر وہی عمل دہرایا۔
جب میں نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو ایک لڑکی عجیب نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے جھینپ کر جلدی سے سینڈل رکھی اور دکان کے اندر چلا گیا۔
شیریں سینڈل خرید چکی تھی اور پیسے دے رہی تھی۔ میں شیریں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ شیریں میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔
''دیکھا بھائی دیر نہیں ہوئی نہ۔ میں کہہ رہی تھی صرف سینڈل خریدنی ہے۔ مجھے شیریں کی آوز کہیں دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ میں تو سینڈلوں کی مسحور کن خوشبوؤں میں کھویا ہوا تھا۔ گھر آ کر میں شیریں کو کہا کہ دکھاؤ تم کون سی سینڈل لائی ہو'' شیریں نے ڈبہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ڈبہ لیتے ہوئے کہا۔
''جاؤ اب ایک کپ اچھی سی چائے تو پلا دو'' شیریں چائے بنانے چلی گئی۔ میں نے ڈبہ کھول کر سینڈل سونگھنا شروع کر دی۔ میں جذبات کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یقین کیجئے اس کی خوشبو میں وہ سرور تھا جو کسی اور نشے میں نہ تھا۔ ابھی میں نے چار پانچ ہی سرور بھری سانسیں لی تھیں کہ امی کی آواز آ گئی۔
امی کی آواز سن
میں نے شیریں کو آواز لگائی۔
''ندیم بیٹا بازار سے ڈبل روٹی تو لا دو۔''
''جلدی سے چائے لے آؤ پھر مجھے روٹی لینے بھی جانا ہے۔ امی نے ابھی حکم نامہ جاری کیا ہے۔''

......☆☆☆......

تمام دن گزر گیا۔ رات اپنی سیاہ چادر اوڑھے آ گئی مجھ میں سینڈل سونگھنے کی تڑپ بھڑک اٹھی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر شیریں کی سینڈل لینے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ شیریں صوفے پہ بیٹھی ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا
''کیا ہوا بھائی کوئی کام تھا''
''نہیں بس ایسے ہی دیکھنے آیا تھا کہ سب سو گئے یا نہیں۔''
میں نے بے بسی سے کہا اور واپس اپنے کمرے کی طرف لوٹ آیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ عجیب بے چینی تھی جیسے نشہ کرنے والوں کو ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد مجبور ہو کر میں نے پھر ڈرائنگ روم میں جھانکا۔ شیریں اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ میں سینڈل کا ڈبہ اپنے کمرے میں اٹھا لایا۔ اگر وہیں بیٹھ جاتا تو ہو سکتا تھا امی یا شیریں دیکھ لیتیں۔ میں نے اپنا نشہ پورا کرنے کے بعد سینڈل کا ڈبہ بند کر کے واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ نشہ پورا ہونے کے بعد مجھے بہت پرسکون نیند آئی۔

......☆☆☆......

صبح میں آفس میں بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ کس طرح کا نشہ ہے اور میں اس کا عادی کیوں ہوا جا رہا ہوں۔ شاید سینڈلوں اور چپلوں کو جوڑنے کے لیے جو سلوشن استعمال ہوتا ہے یہ نشہ اس کا ہے کیونکہ میں نے کئی لوگوں کو یہ سلوشن کپڑے میں لگا کر سونگھتے دیکھا تھا۔ شاید میں بھی اسی نشہ کا عادی ہو گیا تھا۔
یہ باقاعدہ ایک نشہ تھا اور میں اس نشے کے عادی کئی افراد کو جانتا تھا۔ میں پڑھا لکھا ایک بنک ملازم ایک مہذب فیملی کا فرد...... اس طرح کے نشے کا شکار ہو جانا میرے لیے خطرناک تھا۔ اب مجھے اس عادت پہ قابو پانا تھا۔ میں پرسکون ہو گیا۔ مجھے اپنے اوپر پورا کنٹرول ہے انشاء اللہ میں اس عادت پہ قابو پا لوں گا۔
مگر یہ میری خام خیالی نکلی رات پھر میں شیریں کی سینڈل ڈھونڈتا پھرا مگر سینڈل نہ ملی اس مرتبہ امی کے شوز سامنے رکھے تھے کیونکہ امی شوگر پیشنٹ تھیں اس لیے شوز پہنا کرتی تھیں۔ یہ شوز کافی پرانے تھے۔ میں وہ شوز اٹھا کر کمرے میں لے گیا اور پھر وہی عمل...... ''پندرہ بیس منٹ کے بعد میں نے امی کے شوز واپس رکھ دیے اور گہری نیند سو گیا۔ اگلی صبح غور کرنے پر یہ بات سامنے آئی کہ مجھے جوتے سونگھنے کا نفسیاتی مرض لاحق ہو گیا ہے۔ پھر وہ نئے ہوں یا پرانے، یہ کپڑے میں سلوشن لگا کر سونگھنے والا نشہ ہرگز نہیں ہے میری زندگی روٹین کے مطابق چل رہی تھی کوئی بھی چیز اپنی ڈگر سے نہ ہٹی تھی بس یہ فرق آیا تھا کہ میں اس گندے نشے کا عادی ہو گیا تھا۔
فرحین جو آفس میں میری کولیگ تھی کچھ عرصے تک میں اسے مسکرا کر دیکھتا تھا۔ وہ بھی میری مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتی تھی۔ بنک میں ہم سب لنچ ساتھ ہی کرتے تھے۔ منیجر صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر

ہم اپنے اپنے لنچ بکس کھول لیتے تھے اور ایک دوسرے کیساتھ لنچ شیئر کرتے تھے۔ ہم کمرے میں جانے سے پہلے جوتے کمرے کے باہر ہی اتار دیتے تھے۔

ایک دن میں سب سے آخر میں اپنا لنچ بکس لیکر کمرے میں جانے لگا۔ میں فرحین کی سینڈل کمرے کے باہر موجود تھی اور بھی کئی جوتے چپلیں تھیں میں نے موقع پا کر فرحین کی سینڈلوں کی خوشبو دو تین گہری سانسیں لے کر اپنے اندر اتار لی۔ یہاں سے مجھے دوسرے لوگوں کی چپلیں سونگھنے کی عادت پڑی مگر میں صرف خواتین کی چپلیں سونگھتا تھا۔

دو سال گزر گئے پر میں اس گندے نشے سے اپنی جان نہ چھڑا سکا اس نشے کو پورا کرنے کے لیے میں نے صدر کے ٹھیلوں سے عورتوں کی پرانی چپلیں بھی خریدیں۔

نشہ جنون کی حدوں کو چھونے لگا تو میں لوگوں کے گھروں میں گھس کر عورتوں کی سینڈلیں اور جوتے چپلیں چرانے لگا۔ نشہ پورا کر کے سب جوتے چپلیں پھینک دیتا آفس کی مس فرحین جب بھی مجھے مسکرا کر دیکھتی تو میں مسکرا کر اس کی سینڈل دیکھتا میرے لیے صنف نازک سے زیادہ کشش ان کے جوتے اور سینڈلوں میں ہے۔ اپنے آپ کو باز رکھنے کی دس ہزار بار کوشش کر چکا ہوں مگر نتیجہ وہی صفر اچھی بات یہ تھی کہ یہ راز اب تک راز ہی تھا جو کسی بھی دن فاش ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا میں کسی کے گھر میں گھستا ہوا پکڑا جاتا 'لوگ تو مجھے چور ہی سمجھتے۔ اس نشے کی وجہ سے میں جیل جا سکتا تھا میری بات پہ کون اعتبار کرتا"

میں جب اپنے بارے میں سوچتا تو خود سے ہی شرمندہ ہو جاتا۔ آپ میں سے کئی لوگ یہ حقیقت جان کر ناک منہ سکیڑیں گے کہ یہ کیا بات ہوئی۔ یہ کیا نشہ ہوا مگر میں حقیقت میں آج بھی اس نشے میں مبتلا ہوں'

گوگل پہ سرچ کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ میرے علاوہ چودہ لوگ۔ اور ہیں جو اس نشے میں مبتلا ہیں۔ وہ تمام ہی مرد ہیں۔ پاکستان سے میں واحد ہوں' باقی اور ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں یہیں کراچی کے ایک علاقے میں رہتا ہوں۔ اگر کبھی آپ کی سینڈل گم ہو تو مجھ پر شک نہ کیجیے گا۔

......☆☆☆......

خیالات کی ندرت

نیا سال شروع ہونے کو ہے۔ اپنے خیالات کو پوزیٹو انرجی دے کر نئے سال کی شروعات ایک نئی امنگ، ارادے، حوصلے اور تمنا سے کریں۔ سب سے پہلے 'خیالات کا انخلا' ضروری ہے۔ اگر آپ کے کمپیوٹر یا موبائل کا INBOX بھر جائے تو ہم کچھ Delete کرتے ہیں اسی طرح اپنے دماغ میں بھی کچھ Space نئے سال کے لیے بنائیں۔ ہمارا دماغ بھی نئے خیالات کے لیے کچھ Space چاہتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس وقت آپ فارغ ہوں۔ اپنے لیے تھوڑا وقت نکالیں اور پرسکون ہو کر بیٹھ جائیں۔ آنکھیں بند کریں اور گزشتہ سال کو اپنے ذہن میں لے کر آئیں۔ اب خیالات کو تنہا چھوڑ دیں۔ کچھ باتوں پر آپ کو رونا آئے گا، کچھ پر خوشی محسوس ہوگی۔ اب جو بھی خیال آرہا ہے آنے دیں۔ اب اپنی کامیابی اور ترقی کے لیے اپنے خیالات کو نیا Style دیں۔ آنکھیں کھولیں اور کاغذ اور قلم لے کر بیٹھیں۔ دسمبر کی جاتی ساعتوں میں 2016ء کی منصوبہ بندی کریں۔ لکھ لیں کہ اس سال آپ کو کیا حاصل کرنا ہے۔ اس کے لیے کون کون سے کام کرنے ہیں۔ اپنے کاموں کو عملی شکل دیں۔ Points لکھ لیں اور پھر ایک نظر ڈال کر اپنے نئے سال کے لیے Planner2016 تیار کرلیں اور لکھ کر رکھ لیں۔ درود شریف پڑھ کر اپنے اور اپنے چاہنے والوں کے لیے دعا کریں۔ نئے سال میں ایک نئی سوچ کے ساتھ اپنے کاموں کا ایک اچھا آغاز کریں۔ انشاء اللہ! کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

حسن خیال: نزہت ناز۔ کراچی

اُس نوجوان کی کہانی، جسے کراس ٹاکنگ نے بڑے امتحان سے بچالیا تھا۔

''زندگی بھی عجیب مذاق ہے۔ جو نہ مل سکے ہم اس کی تلاش میں پریشان رہتے ہیں۔ جو سامنے ہے اسے نظر انداز کیے جاتے ہیں، عجیب مذاق ہے نا! مس انیلا! تمہیں زندگی کے کسی موڑ پہ خوشی ملے تو زیادہ خوش نہ ہونا، غم مقدر بن جائے تو افسوس نہ کرنا، اپنے آپ کو بدنصیب نہ کہنا، کہ یہی پیار کا اصول ہے، پیار کوئی سودا، کوئی مزدوری تو ہے نہیں کہ۔ ہم صلہ بھی مانگیں۔ یہ تو صرف احساس ہے، صرف احساس۔''

''افوہ! حد ہوگئی! لعنت ہے۔'' عارفہ نے ڈائجسٹ پڑھتے پڑھتے جھلا کر دور میز پر اچھال دیا۔

''کم بخت محبت ہوگئی۔ جان کا عذاب ہوگئی۔ ناول، رسالے، ٹی وی، ڈرامے، فلمیں ہر جگہ ایک ہی ماتم، آہیں، آنسو سسکیاں، محرومیاں، وہ بکھرے بال سمیٹتی، ننگے پاؤں باہر ٹیرس پہ آ کھڑی ہوئی۔ تیز دھوپ سے آنکھیں چندھیا سی گئیں تو گھبرا کر پلٹی اور ٹی وی لاؤنج میں جا بیٹھی۔

'کس قدر سکوت ہے گھر میں!!!' جلتے تلوؤں میں جاں فزا ٹھنڈک محسوس کرتے ہوئے اس نے پل بھر کو پیر اٹھائے اور پھر زمین پہ پٹخ کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔

'ماں باپ کی چپقلشوں میں اولاد کس قدر تنہا ہو جاتی ہے۔ یہ احساس کاش کہ میری تعلیم یافتہ مما اور بزنس مین ابو کو ہوسکتا'۔ لڑکوں کو گھروں میں مقید رکھا جا سکتا ہے اور نہ لڑکیوں کو دوسرے گھر جانے سے روکا جا سکتا ہے۔ اچھی رہیں آپا تم!!! خدا کرے اس سرد ملک میں تم کاشان بھائی کی گرم جوشیوں کے حصار میں محفوظ رہو۔'' اس نے خلوص دل سے دعا کی۔

فہیم نے میوزک کلب، دوستوں اور جاب میں پناہ ڈھونڈ لی ہے۔ ایک میں ہوں' ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟؟ صرف اور صرف شادی ہو جانے کا انتظار کرنا!!!! اور پھر...... پھر کی پھر دیکھی جائے گی۔ ذیشان احمد!! تمہارے کورسز تو ختم ہوں جنہوں نے مجھے انتظار کی سولی پہ ٹانگ رکھا ہے۔ پتا نہیں میں ایسی پاگل کیوں ہوں''!!!! اس پہ قنوطیت کا زبردست دورہ پڑا ہوا تھا۔

'میں بھی اور لڑکیوں کی طرح تفریح کرتی ہوں' پہنتی ہوں اور بہت سی لڑکیوں سے بہتر آسائشات

50 کلومیٹر سے بھی زیادہ تھا۔ اس کے باوجود جنید کی ملازمت سے پہلے تک وہ اکثر چھٹیاں ہمارے پاس ہی گزارتا تھا اور کبھی میں ان کے گھر گزارتا تھا۔ بچپن کی دوستی گہری ہوتی گئی۔ ہمارا تعلق روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ ایسی کوئی بات نہ تھی کہ جو ہم ایک دوسرے سے چھپاتے۔ جن دنوں وہ ملازمت کر رہا تھا۔ میں کالج میں ایف اے میں زیر تعلیم تھا۔ اس کے باوجود میں اکثر ہر دس پندرہ دن بعد اس سے ملنے ضرور جاتا تھا۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ جس شہر میں جنید زیر ملازمت تھا وہیں میرے بڑے ماموں کا گھر تھا۔ میں جب بھی جنید سے ملنے جاتا، ٹھہرتا ماموں کے گھر ہی تھا۔ جنید حالانکہ اسی شہر میں تھا۔ اس کے باوجود وہ ان کے پاس نہیں رہتا تھا۔ بس کبھی کبھار چکر لگا لیتا تھا۔

ان دنوں بار بار جانے کی وجہ سے ماموں کی ایک بیٹی نگہت سے میری دوستی ہوگئی جو جلد ہی پیار میں بدل گئی۔ نگہت مجھ سے سال بھر ہی چھوٹی تھی یعنی جنید اور نگہت تقریباً ہم عمر ہی تھی۔ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ کب دوستی پیار میں بدل گئی۔ پتا تو جب چلا جب ہم پور پور ایک دوسرے کے عشق میں ڈوب چکے تھے اور میں نے اسی وارداتِ عشق کا جنید سے بھی لمحہ بہ لمحہ تذکرہ کیا تھا۔

ٹرن ٹرن ٹرن......

بے تحاشا خموشی میں ٹیلی فون کی کرخت سی گھنٹی نے خیالات بکھیر دیے تھے۔ کاہلی، بیزاری سے اس نے فون کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھا لیا اور اگلے لمحے ہی پٹخ دیا۔

''اُف توبہ''، اس کا چہرہ خون کی روانی سے تپ سا اٹھا۔

'میرے اللہ!! وہ باتیں جن کو سوچتے ہوئے ذہن بھی جھجک جاتا ہے یہ لوگ اس روانی سے زبان پر

جہاں فائلوں کاغذوں، مسودوں کے انبار تھے۔ ڈاک سے آئے ہوئے ردی خطوط اور ردی کاغذ ٹوکری سے ابل پڑنے کو بے تاب تھے اور دو چار اس کوشش میں کامیاب ہو کر اب پنکھے کی ہوا سے اِدھر اُدھر ڈول رہے تھے۔ سائیڈ میں ایک لمبی پتلی درازوں والی میز تھی جس پہ فرہنگ آصفیہ کی جلدیں اور رسالے کے شمارے ترتیب وار رکھے تھے۔ کمرے کے درمیان میں تین میزیں تھیں جن کے پیچھے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے جمیل مدیر، شاہد نائب مدیر سر جھکائے تیزی سے

قلم گھسیٹ رہے تھے کہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور آرٹسٹ عالم کاغذ پر لکیریں کھینچ کھینچ کر کوئی خاکہ ابھارنے کی فکر میں تھا۔ اس سکوت وغویت کے عالم میں اچانک فون کی گھنٹی نے ارتعاش پیدا کر دیا......
جمیل نے سستی سے جماہی لی، نیم وا آنکھوں سے فون کی طرف سے دیکھا، گھنٹی دوبار بجی ......شاہد نے خونخوار نگاہوں سے فون کو دیکھا......وہ قسط وار کہانی کلائیمکس پر تھی جو شمراز کے عنوان اور عارف بن احسان کے نام سے شائع ہوتی تھی......عاصم اپنے آپ میں گم آنکھوں کے خاکے میں تحیر کی لکیریں ابھارنے میں مصروف تھا......جمیل نے بے دلی سے ریسور اٹھایا اور غنودہ غنودہ سے لہجے میں بولا ''ہیلو......''

''سو رہے تھے؟؟''

دوسری جانب سے کھنکتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی تو وہ اچک کر بیٹھ گیا۔

''جی!!'' واقعی وہ بوکھلا گیا تھا......

''جی!!'' تمسخرانہ ہنسی کی آواز آئی اور جمیل بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

''یار شاہد! تم بات کرو''۔ شرمیلے اور جھینپو جمیل نے فون اٹھا کر شاہد کی میز پر رکھ دیا۔ ایسے فون وہ ہی نمٹایا کرتا تھا مگر اس وقت وہ بگڑ اٹھا۔ ایسے میں جب کہ بہت ہی خوبصورت خیالات و الفاظ کی آمد کی سی کیفیت طاری تھی، اس نامعقول فون کی دخل اندازی اسے بہت ہی ناگوار گزری تھی۔

''یار!! ایک تو میں تیرے اس شرافت کے ہیضے سے عاجز ہوں!!'' شاہد نے بڑبڑاتے ہوئے ریسور کان سے لگایا اور پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا ''جی فرمایئے......''

''اے!! ذرا دھیرے سے۔'' ہنسی سے مترنم آواز کا لہجہ شرارتی تھا۔

''محترمہ!! کام بتایئے۔ کام......''

''میاں عورت سے بات کر رہے ہو یا بھینس ہنکا رہے ہو۔ عاصم نے اس عرصے میں پہلی بار زبان کھولی

''کام!! کام سوچ کر بتائیں گے'' وہ اترائی

''اچھا!! تو سوچتی رہیے، خوب سوچیے۔ اللہ آپ کو نیک ہدایت دے'' یہ کہہ کر شاہد نے بھنا کر ریسیور کریڈل پہ دے مارا اور ساتھ ہی قلم و عینک بھی۔ موڈ ''غارت کر دیا کم بخت نے۔ یار یہ لڑکیاں ہیں یا آفت!!''

''بھائی یہ پندرہویں صدی ہے، پندرہویں جو کچھ سامنے نہ آئے کم۔'' عاصم نے اسکیچ میں شیڈ دیتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہی تھی؟'' شاہد کو اس قدر آؤٹ دیکھ کر جمیل نے دھیرے سے پوچھا کہے گی کیا سالی!! ہسٹریا کے دورے سے افاقہ ہوا ہوگا۔ تو فون سامنے نظر آ گیا ہوگا شاہد چڑ کر بولا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

دوسرے دن جمیل ابھی نہیں آیا تھا۔ عالم اور شاہد اپنی میزوں پہ تھے شاہد خطوط پڑھ رہا تھا۔ لوگوں نے عارف بن احسان کی شمراز، کو بہت سراہا تھا نیلے پیڈ پہ لکھے ہوئے خوبصورت ونفیس لکھائی والے خط میں ایک لڑکی نے عارف بن احسان کی تصویر کی اشاعت کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''مجھے یقین ہے کہ ان کی شخصیت اپنی تحریر کی طرح دلکش ہوگی۔''

شاہد کے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ آگئی تب ہی فون کی گھنٹی گنگنائی۔

''جی فرمایئے!!'' اس نے بہت نرمی و تہذیب سے کہا

''آداب عرض!'' نسوانی آواز نے بہت قرینے سے آداب جھاڑا۔''

''آداب! اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ کوئی قاری یا کہانی کار ہے، یہی سوچ کر اس نے شائستگی و شگفتگی سے پوچھا ''جی! کس سے بات کریں گی؟''

''آپ سے''

''جی!!'' شاہد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

شکر ہے آج مطلع صاف ہے اور شاہد ٹھنڈی ہوائیں بھی چل رہی ہیں! نسوانی آواز کھلکھلاتے، مسکراتے لہجے میں بولی تو لمحہ بھر کو شاہد کی پیشانی شکن آلود ہوئی اور پھر وہ مسکرا دیا۔

''اچھا!! تو یہ آپ ہیں۔'' وہ کل والی آواز

پہچان گیا تھا۔

''جی''۔ اس کی ہنسی بڑی دلربا تھی۔

''اور سنائیں کیا حکم ہے ہمارے لیے؟'' یہ کہتے ہوئے شاہد عاصم کے سوالیہ نشان بنے چہرے کو دیکھ کر ایک آنکھ میچ کر ہنس دیا۔

''کیا ہوا؟ آپ ہنسے کیوں؟'' اس نے پوچھا

''کچھ نہیں آپ یہ بتایئے کہ آپ کو پتا ہے کہ آپ کہاں فون کر رہی ہیں؟ شاہد نے پوچھا تو اس نے نفی میں جواب دیا۔

''پھر؟؟'' شاہد کی ایک ''پھر'' میں بہت سے سوال تھے۔

پھر وہ اترائی اور بڑی ادا سے بولی

''میں یونہی بیٹھی بور ہو رہی تھی''

''اور آج پھر آپ بور ہو رہی تھیں؟ بائی داوے آپ کا دورہ کتنے دورانیے کا ہوتا ہے؟'' شاہد کے لہجے میں طنز کی چبھن بے پناہ تھی جسے یا تو اس نے محسوس نہیں کیا۔ یا نظر انداز کر گئی اور ہنس کر بولی۔

''یہ نہیں پوچھیں گے کہ آج پھر کیوں رنگ کیا؟''

''یہی تو پوچھ رہا ہوں بندہ پرور!! آپ ارشاد تو فرمائیں۔'' شاہد نہایت عاجزانہ انداز سے بولا۔

''دراصل'' کل آپ نے بہت بیزاری سے بات کی تھی نا تو''

''تو؟'' شاہد کے پلے خاک نہیں پڑا۔

''تو یہ کہ'' وہ میرے سے ہنسی

''آپ مجھے سب سے کچھ مختلف لگے ورنہ لوگ تو لڑکی کی آواز سنتے ہی ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں۔'' کس قدر معصومیت تھی اس کی آواز میں شاہد بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ وہ لڑکی کچھ زیادہ ہی احمق معلوم ہوتی ہے۔

''اصل میں!!'' وہ بہت ہی میٹھے لہجے میں بولا''

موڈ موڈ کی بات ہوتی ہے کل فون کی آواز بہت کرخت، چیختی ہوئی اور آپ کی آواز نہایت زہریلی لگی تھی، اس لیے کہ کل میں ایک بہت اہم کام میں مشغول تھا، آج فون کی آواز گنگناتی ہوئی اور آپ کی آواز واقعی بہت سریلی، بہت مترنم، بہت ہی پیاری لگی''

''اچھا اچھا خدا حافظ پھر رنگ کر دوں گی''

مترنم آواز نے اچانک فون بند کر دیا۔

شاہد چند لمحے ریسیور کو ہاتھ میں تھامے تکتا رہا اور پھر آہستگی سے کریڈل پہ رکھ دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگائی۔

''کیا بات ہے بیٹے!! گئے کام سے؟''

عاصم اپنے لمبے گھونگریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا تو شاہد مسکرایا۔

''نہیں یار!! وہ گھر میں جو نیک خاتون میرے تین عدد نونہالوں کو سمیٹے بیٹھی ہے وہ مجھے کام سے یوں آسانی سے جانے دے''

''تو؟؟ اس بات کا سوگ ہے؟'' عاصم نے پھر چھیڑا

''نہیں دوست!'' شاہد پرُ خیال لہجے میں بولا۔

''میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ لڑکیاں واقعی اسی قدر بے وقوف ہوتی ہیں یا ہمیں بے وقوف بناتی ہیں؟''

''چھوڑو یار، مٹی پاؤ یہ بتاؤ یہ کیسا ہے؟''

عاصم نے ایک خاکہ اس کے سامنے رکھ دیا اور باتوں کا رخ پلٹ گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن عاصم و شاہد غیر شعوری طور پر اس فون کا انتظار کرتے رہے۔ ایک مرتبہ جو گھنٹی بجی تو دونوں چونک گئے اور جمیل نے فون اٹینڈ کرنے کے بعد پوچھا ''کیا بات ہے؟ کس کے فون کا انتظار ہے؟

''نہیں تو۔'' شاہد جھینپ سا گیا۔ ''تم نے کیسے سمجھا؟''

''یونہی تم دونوں دراصل ہر بیل پر کچھ چونک سے جاتے ہو'' اور عاصم قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

''ہاں جمیل بھائی! وہی پرسوں والی لڑکی کا انتظار ہے''

''اچھا!'' جمیل حیرت سے بولا۔

''کیوں کیا کل بھی اس کا فون آیا تھا؟''

اور پھر ساری رام کہانی عاصم نے اسے سنا دی جسے سن کر جمیل نے شانے اچکائے اور اداریہ کی پروف کاپی دیکھنے لگا۔

چوتھے دن فون ریسو کرنے والا شاہد ہی تھا۔

''کیا حال ہیں جی؟'' مترنم آواز نے خیریت پوچھی۔

حال کیا ہونے ہیں، آپ تو شاید پھر ہمیں بھول ہی گئیں؟''

وہ شاکی لہجے میں بولا عاصم وجمیل نے پل کو چونک کر اسے دیکھا۔ گویا حال سے بے حال ہیں؟''
اس کی ہنسی تھی یا کلیوں کے چٹکنے کی صدا شاہد مبہوت سا ہو گیا۔

''ہیلو! اس نے شاہد کے ہونے کا یقین چاہا۔

''ہاں'' میں سن رہا ہوں بلکہ دیکھ رہا ہوں'' وہ خوابناک لہجے میں بولا

''کیا؟'' وہ حیران ہو گئی۔

''ہنسی کے دائرے کیا تم نے محسوس کیے ہیں کبھی؟''

''نہیں تو'' وہ بدستور حیران سی تھی۔

''کبھی اپنی ہنسی ٹیپ کرو اور پھر تنہائی میں خموشی میں سنو''

''اف! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ کھسیا گئی

''باتیں؟'' وہ جذباتی ہو گیا۔

''میں باتیں کہاں کر رہا ہوں میں تو امرت رس جذب کر رہا ہوں''

''آپ آپ شاعر تو نہیں؟'' ہنسی کے گھنگرو پھر چھنکے۔

''ہوں نہیں۔ تو ہو جاؤں گا کہ۔ میں سوچ رہا ہوں کہ

رنگ، مہک، رفتار
خوشبو ہے یا تتلی ہے
''یہ لحہ اے یار!''

وہ پل بھر کو چپ رہی، پھر بڑی سنجیدگی سے بولی

''دیکھیے! آپ ایسی باتیں کریں گے تو میں آئندہ بات نہیں کروں گی''

''اوہ نہیں نہیں اب ایسا غضب نہ ڈھایئے گا۔

''اب اتنی سی بات پہ کیا ترک گفتگو اے دوست!!''

''چلیں کوئی اور بات کرتے ہیں'' وہ جلدی جلدی گھبرا کر بولا۔ چلیں آپ اپنا تعارف کرایئے!!''

''تعارف!! تعارف میں کیا رکھا ہے؟ کیا یہ جاننا ہی کافی نہیں کہ میں ایک احمق لڑکی ہوں'' وہ لاپروائی سے بولی۔

(اوہو یہ خود آگہی!!) شاہد پل بھر کو چپ رہا پھر بولا

''چلیے مکمل تعارف نہ سہی نام ہی بتا دیں''

نام! ناموں میں کیا رکھا ہے؟ کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ'' وہ شرارت سے بولی۔

''گویا آپ بتانا نہیں چاہتیں وہ اداسی سے بولا۔

''کیا کریں گے پوچھ کر؟'' دھیرے سے کہا گیا۔

''آپ کو مجھ پر اعتماد ہی نہیں، تو کیا کروں بتا کر کہ کیا کروں گا'' وہ بدستور رنجیدہ شکل بنائے ہوئے تھا۔

''زمانے بھر کی نحوست ٹپک رہی ہے اس وقت کم بخت پر'' عاصم دانت پیس کر منمنایا اور شاہد نے مسکرا کر اسے دیکھا وہ لحہ بھر کو تھمی اور پھر بولی

''اس دن آپ نے کہا تھا ناں کہ میری آواز بڑی مترنم ہے؟''

''ہوں وہ تو ہے'' شاہد خوشامد سے بولا۔

''تو بس میرا نام ترنم ہے''

تب ہی کچھ لوگ آ گئے اور شاہد نے معذرت کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اگلے دن اسی مخصوص وقت پر نسوانی آواز سنتے ہی جمیل نے فون کا ریسیور شاہد کی طرف بڑھا دیا۔

''لو بھی تمہاری وہ آ گئیں''

''میری وہ''!! شاہد ہنس دیا۔

''کیا بات ہے موڈ بڑا خوشگوار ہے''۔ وہ ہنسی کی ہی آواز سن سکی تھی۔

''ارے تمہاری آواز سنائی دے۔ اور موڈ خوشگوار نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے''

''اوہ ہوں'' وہ دھیرے سے ناز سے ادا سے ہنسی

''ایک بار پھر ہنسو پلیز وہ یکدم ہی تم پر آ گیا تھا''

''نہ پہلے اپنا نام بتایئے وہ اترائی۔

''اجی ہم نام کیا، کام اور قیام بھی بتا دیں گے بس

تم ہنسو ہنستی رہو سنو!! میرا نام شاہد ہے کام قلم گھسٹینا قیام جہانگیر آباد ناظم آباد اور کچھ؟''

وہ اس کے یوں جلدی جلدی بولنے پر کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ پھر بولی'' نام اور قیام تو سمجھ میں آ گیا، پر کام ذرا وضاحت کریں گے؟''

بھی میں قلم کار ہوں، مدیر ہوں ایک رسالے کا لیکن رسالے کا نام میں تم کو بطور راز نہیں بتاؤں گا اور ایڈیٹر بھی کیا ایک ادنیٰ کار ہیں اس رسالے کے اگر چہ ممی ڈیڈی کے اکلوتے اور جائیداد کے تنہا وارث ہیں چاہیں تو گھر بیٹھ کر مزے اڑائیں ساری زندگی، مگر بات یہ ہے بی بی کہ......''

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی علمی و ادبی ذوق چین سے بیٹھنے نہیں دیتا، سو یہاں اپنی تئیں ادب کی خدمت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں'' شاہد ٹھہر ٹھہر کر بڑے اسٹائلش انداز میں بتا رہا تھا اور عاصم حسب عادت مسلسل بول رہا تھا۔

ایمان سے بالکل کسی تھرڈ کلاس خاتون مصنفہ کا افسانہ لگ رہا ہے یہ تو''

''تو کیا آپ کہانیاں لکھتے ہیں؟'' وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔

''لکھتا تو کم ہی ہوں کہ فرصت ذرا کم ملتی ہے دراصل سارا وقت تو اشاعت کے لیے آئی ہوئی کہانیوں کی اصلاح در ستگی میں گذر جاتا ہے، شاہد نے لاپرواہانداز میں اپنی اہمیت و لیاقت بتائی، اچھا اب تم بتاؤ اچانک اس نے ٹریک بدل لیا۔

''میں! میں کیا بتاؤں؟'' وہ حسب عادت اترائی

''جو دل چاہے مثلاً یہ کہ رہتی کہاں ہو! کرتی کیا ہو؟''

''رہتی یہیں اس عالم رنگ و بو میں ہوں اور ہر روز آپ کو فون کرتی ہوں''

''اوہ'' شاہد نے اس کی بات سن کر گہری سانس لی اور چپ ہو گیا۔ ریسیور تھامے سن ہو چکا تھا اور اس کا طبیعت بھی بدمزہ کر چکا تھا۔ لہٰذا اس نے اجازت چاہی۔

''ٹھہریئے سنیئے!! آپ ناراض تو نہیں ہو گئے''

وہ جلدی سے بولی۔

''نہیں جی ہماری یہ مجال کہاں'' شاہد نے سنجیدگی سے کہا اور اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ان تینوں کے درمیان اس عجیب و فالتو لڑکی سے متعلق گفتگو کا دفتر کھل گیا۔

تنہائی اور گھٹن کی ماری ہوئی ہوتی ہیں یہ لڑکیاں. ذہنی اپنی ذات کو تسکین اپنے جذبوں کو زبان بخشتی ہیں۔ ہمدردی کے لائق ہیں بے چاریاں اعتدال پسند اور سنجیدہ جمیل کی رائے یہ تھی۔

جب کہ لاابالی عاصم کا کہنا تھا کہ ہاں جی ہمدردی کے لائق ہوسکتی ہیں بیویاں بننے کے لائق نہیں، میں تو بھیا کبھی بھی ایسی لڑکی سے شادی نہ کروں جس کے گھر فون ہوگا۔ جانے کتنے عشق لڑا چکی ہوگی۔ جانے کتنے عشق روزانہ لڑاتی ہوگی۔''

دشت امکان بے کراں ہے پیارے! جمیل نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ زمانہ قدیم کی ہیر، سوہنی، ساحبہ، لیلیٰ اور دور حاضر شبنم، عابدہ، نادرہ، زاہدہ وغیرہ۔ سب کو ہی تو فون پہ عشق کی گھاتیں لگانا میسر نہیں پھر بھی رومانی کہانیاں زندہ ہیں''

شاہد جو خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا بولا

''کچھ بھی ہو مگر یہ ضرور یات چلنا چاہیے کہ یہ ذات شریف ہیں کون؟''

''یونہی میٹھی میٹھی، شاعرانہ، فن کارانہ، فدویانہ باتیں کرتے رہو، ایک دن اپنا اتا پتا تو کیا پورا شجرہ نسب بتا دے گی۔'' عاصم نے تسلی دی۔

اور پھر حسب معمول ہر دوسرے چوتھے دن اس کا فون آتا، ڈھیروں الٹی سیدھی باتیں کرتی کبھی تو بے وقوف، نا سمجھ اور احمق لگتی، کبھی بہت ہی فلسفیانہ اور شاعرانہ گفتگو، شاہد ہزار حیلوں بہانوں کے باوجود اس کے بارے میں کچھ بھی نا جان سکا، سوائے اس کے کہ اس نے بی۔اے۔ کا امتحان دیا ہے، گھر میں اس کی مما، ابو ایک بھائی ہے اور بس۔ اس لاحاصل سلسلے سے اب کبھی کبھی اکتاہٹ بھی محسوس ہونے لگی تھی اور یہ اکتاہٹ اس دن چڑچڑاہٹ میں بدل گئی جب وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو ڈاکٹر کو دکھا کر اس کی دوائیاں

دغم خرید کر اور اسے اور بیوی کو گھر پہنچا کر آیا تھا۔ ڈاکٹر کی فیس کے علاوہ، ڈاکٹر تک پہنچنے کا ضروری طریقہ کار وقت کے اس بے دریغ زیاں سے اسکی کھوپڑی گھوم گئی تھی۔

سونے پہ سہاگے کا کام دواؤں کی قیمت نے کر دیا۔خالی جیب ،طبیعت جھنجلاہٹ زمانے بھر کے لیے غصہ بھر دیتی ہے۔سو اس نے یہ غصہ رکشے والے کے میٹر کو بہانہ بنا کر اس پر نکالا اور پھر کافی لیٹ وہ دفتر پہنچا تو درحقیقت وہ کسی ذہنی کام کے لائق نہ رہا تھا کہ منی بس نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔

عاصم کان ریسیور پر لگائے میز سے ٹیک لگائے مزے سے باتوں میں مگن تھا۔گاہے بہ گاہے قہقہہ بھی لگ جاتا،اس نے اپنی پریشانی میں کوئی نوٹس نہ لیا اور روبوٹ کی مانند پہلے تو ڈاک دیکھی۔پھر کہانیوں کے مسودے نکالے تب ہی اسے یاد آیا کہ شمع ارم نے حسب وعدہ خاص نمبر کے لیے اب تک کہانی نہیں بھیجی ہے۔فون کر کے یاد دہانی کرانی پڑے گی، اس نے سوچا،اور سر اٹھا کر عاصم کو دیکھا وہ ریسیور کان سے لگائے مسلسل چہک رہا تھا۔جب کافی دیر ہوئی تو اس کا صبر جواب دے گیا۔

''یار بس بھی کرو پھر کر لینا''

عاصم چونک گیا۔

''اوہو تم آ گئے، مجھے پتا ہی نہ چلا ریسیور۔''اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دھیرے سے بولا۔کال تو اصل میں تمہاری تھی۔ میڈم ترنم،ترنم ریزیاں فرما رہی تھیں''

شاہد اس وقت اس قسم کی عیاشی کے موڈ میں قطعاً نہ تھا ریسیور کریڈل پہ دے مارا۔

''عجیب فضول سی لڑکی ہے کوئی کام ہی نہیں سوائے دل لگی کرنے کے۔''

دوسرے دن ڈھائی بجے پھر گھنٹی بجی، جمیل نے ریسیو کیا،اور خاموشی سے شاہد کی طرف بڑھا دیا۔

''ہونہہ'' اس کے حلق میں کڑواہٹ سی گھل گئی ناقابل اشاعت کہانی کا مسودہ ردی ٹوکری میں ڈالتے ہوئے اس نے ریسیور کانوں سے لگایا۔

''کل آپ کہاں تھے؟'' بے قراری آواز کانوں میں رس گھول گئی۔اپنی اہمیت کا احساس مسکراہٹ بن کر لبوں پہ رقصاں ہو گیا۔

گھٹن زدہ اور حالات سے فرار، وقتی طور پر ہی سہی والی بات کا اطلاق کیا صرف لڑکیوں پہ ہوتا ہے؟؟؟ جمیل نے نگاہ بھر کر شاہد کو دیکھا اور سوچ کر رہ گیا کہہ نہ سکا۔وہ جمیل کے گھریلو حالات اور مسائل سے بخوبی آگاہ تھا۔

''پتا ہے! کل میں نے دو مرتبہ رنگ کیا تھا۔''

وہ کہہ رہی تھی اور شاہد کا موڈ بگڑ گیا۔

''اور پھر میں نہ ملا تو میرے دوست سے ہی گپیں ہانکتی رہیں''

ہائے! وہ وہ آپ کے دوست تھے'' وہ کچھ گھبرا سی گئی

''جی نہیں، دشمن تے بولیے''

''آپ آپ'' وہ روہانسی سی ہو گئی میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی ان سے'' شاہد ایک گہری سانس لے کر پل بھر کو رکا پھر بڑے شانت لہجے میں گویا ہوا ''معاف کرنا اچھا سناؤ کیا حال ہیں؟ رزلٹ تو ایک دو دن میں آنے والا ہے، پھر کیا ارادے ہیں؟''

''ارادے کیا ہونے ہیں؟ ہم کیا اور ہمارے ارادے کیا''

وہ کچھ افسردہ سی ہو گئی تھی۔

''بھئی یہی کہ بی اے کے بعد ایم اے میں داخلہ لیں گی یا شہنائیاں بجوائیں گی؟''

شاہد نے پوچھا۔

خوش گپیوں کا سلسلہ جانے کتنا دراز ہوتا کہ چند ملاقاتیوں کو آتا دیکھ کر اس نے معذرت کر کے فون بند کر دیا۔

......☆☆☆......

ذیشان احمد ایک دن قبل ہی جاپان سے آیا تھا، اس کی فرم نے اسے کسی خاص کورس کے لیے دو ماہ کے لیے بھیجا تھا، اس کی کارکردگی بہترین تھی، وہ یہیں اور کچھ کرنے کی امنگوں سے بھرپور نوجوان تھا لہٰذا سال بھر میں تیسرا موقع تھا جو اندرون و بیرون

ملک کورسز کے سلسلے میں اسے ملا تھا اور بڑا عجیب اتفاق تھا کہ جب بھی شادی کا پروگرام بنتا تب ہی کسی نہ کسی کورس کی آفر آجاتی اور وہ بہتر سے بہترین مستقبل جو کہ عارفہ کا بھی اتنا ہی تھا۔ جتنا کہ اس کا وہ شادی کا پروگرام موخر کر کے ترقی کی ایک اور سیڑھی کی جانب بڑھ جاتا۔ آج صبح ناشتے پہ امی نے عارفہ کے بی اے کے رزلٹ کے بارے میں بتایا تھا کہ آج ہی آیا ہے اور اس کی مما کا فون آیا تھا کہ فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوگئی ہے۔ امی کہہ رہی تھیں کہ شام کو ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا تاکہ مبارکباد دینے کے لیے جائے اور شادی کی تاریخ کے بارے میں بھی بات کرلی جائے۔ دفتر تو اس نے کل ہی جوائن کرلیا تھا، آج دوپہر کے بعد گھر واپسی کے لیے اٹھتے اٹھتے وہ بیٹھ گیا۔

''ذرا عارفہ بیگم کو مبارک دے دی جائے دو چار باتیں کرلی جائیں وہاں سب کے سامنے کیا خاک موقع ملے گا''

خیال یار کی رعنائی دل کش مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پہ بکھر گئی۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہاں جاپانی گڑیوں، گڑیاں سی دوشیزاؤں کے جمال میں اس کا ہی عکس دیکھتا رہا ہے۔ کچھ بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ اس نے نمبر ملایا انگیج تھا چند منٹوں کے توقف کے بعد بھی نمبر انگیج ہی ملا۔

''ہوں تو محترمہ مبارکبادیں وصول رہی ہیں'' گہری سانس لے کر اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی اور پاؤں پھیلا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی، فون اپنے قریب کھسکا لیا اور پھر نمبر ملایا وہ یہ کھنکتی آواز گنگناتی سی ہنسی ہزار آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی

''جی جی جناب پاس ہوگئی ہوں۔''

''اوہو مبارکاں مبارکاں لیکن کس ڈویژن سے؟'' وہ کوئی مرد تھا۔ بھاری مگر خوابناک سی آواز تھی،

ذیشان بے ساختہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''جناب فرسٹ آئی ہوں۔'' وہ چہکی

''واہ پھر تو مٹھائی تم پر فرض بھی تو ہے'' عارفہ اترائی۔

''لیکن جناب!! جہاں حق ہے وہاں فرض بھی تو ہے'' عارفہ اترائی۔

''ارے جانم! ہم نے کب انکار کیا ہے؟ حکم کرو'' مرد سراپا فدوی معلوم ہو رہا تھا۔

''پہلے میرا انعام'' وہ دھیرے سے ہنسی۔

''ضرور، ضرور۔'' وہ خوشدلی سے بولا۔

تم آؤ تو، (حسرتیں، حسرتیں)

''جی نہیں'' وہ پھر ہنسی ''اب آپ کا امتحان ہے، بتایئے آپ کیا دے رہے ہیں''

''ارے! تم آؤ گی بھی نہیں اور تحفہ بھی لوگی یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ حیران تھا اور وہ دھیرے سے ہنسی۔

''پھر تو ایک ہی صورت ہے وہ گہری سانس لے کر بولا''

''کیا؟'' وہ اشتیاق سے بولی۔

''تیرا قصیدہ لکھوں گا چراغ جلنے تک''

وہ چپ رہی تو وہ چند لمحوں توقف کے بعد بڑے جذباتی سے لہجے میں بولا۔

کہاں پہنچ کے مکمل ہوئی تری تصویر!!
تُو چپ ہے تیرے پیکر کا شور سنتا ہوں۔

ذیشان کی قوت برداشت جواب دے گئی ریسیور اس نے کریڈل پہ پٹخا اور سر میز پہ ٹیک دیا۔ سانس اس کے سینے میں نہیں سما رہی تھی، یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ میلوں دوڑتا رہا۔ زندگی کیسے کیسے بھیانک منظر دکھاتی ہے!!! اب تک اس کی زندگی میں کسی بدصورتی کا دخل نہ تھا۔ اس نے ہمیشہ زندگی کے خوبصورت رنگ ہی دیکھے تھے، لیکن آج ......

اس نے چند لمحوں بعد اپنے آپ پر قابو پا کر بیل بجائی، چپڑاسی سے پانی مانگا۔ ٹھنڈا پانی پی کر حواس کچھ بحال ہوئے تو اٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اسے یاد آیا کہ کل امی ابو سے کہہ رہی تھیں کہ یہ کراس ٹاکنگ بھی عذاب ہے۔ لائن ایک مرتبہ میں تو کلیئر ملتی ہی نہیں کراس ٹاکنگ لوگوں کے لیے عذاب ہوگئی میرے لیے تو نہیں کم از کم میں تو زندگی کا سب سے بڑا دھوکہ کھانے سے بچ گیا۔

......☆☆☆......

اشفاق شاہین

بیوی سے بے وفائی کرنے والے ایک شوہر کی داستان، اوکاڑہ سے۔

جنید میرے ماموں کا بیٹا ہے اور مجھ سے سال بھر ہی چھوٹا ہے۔ میری عمر اس وقت 37 سال ہے۔ جنید ابھی بہت چھوٹا سا تھا کہ اس کے سر پر ڈھیروں ذمہ داریاں آن پڑیں۔ عیدالاضحیٰ کے دن قریب تھے کہ میرے ماموں شدید بیمار ہو گئے بالکل اچانک، اور نجانے کیا مرض تھا جو ڈاکٹر سمجھ ہی نا سکے اور تین دن بعد ہی عید سے ایک دن پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ جنید اور اس کے گھر والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی، ماموں کی ابھی عمر ہی کیا تھی، یہی کوئی چالیس سال کے ہوں گے، اس کے گھر والوں کو اور اسے غموں کے جس طوفان کا سامنا کرنا پڑا، یہ تو وہی جانتے ہیں لیکن دیکھنے والی ہر آنکھ اشک بار تھی۔ ماموں تھے ہی اتنے شفیق۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب بھی وہ ہمارے گھر آتے تھے تو ہمیں بہت سارا پیار کرتے تھے، پیسے بھی دیتے تھے اور میری امی تو ان سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں، وہ سب سے چھوٹے جو تھے، الغرض بچپن میں ہی جنید بھاری ذمہ داریوں تلے دب گیا، حالانکہ ہم سب کے اور ان کے گاؤں والوں نے بھی ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا، لیکن کب تک، آخر اسے خود ہی اپنے گھر والوں کے لیے گھر سے نکلنا پڑا۔

جنید کے دو چھوٹے بھائی اور دو ہی بہنیں تھی۔ اس نے مڈل تک اسکول میں پڑھا تھا پھر اسے اپنی تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا کیونکہ گھر کے حالات اس ڈگر پر آ گئے تھے کہ گزارا بالکل ناممکن تھا۔ جمع پونجی جو تھوڑی بہت تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔

اس نے شہر میں ایک لیبارٹری سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ ڈیوٹی کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ درمیان میں اپنی پڑھائی کے لیے بھی وقت نکال لیتا تھا، اس نے میٹرک کا پرائیوٹ امتحان دینے کے لیے اپنی تیاری شروع کر دی، گھر والوں کو بھی سپورٹ کرتا رہا۔ یہ نہیں کہ اس کی تنخواہ بہت زیادہ تھی، بس اس کی امی کھینچ تان کے گزارا کر ہی لیتی تھی۔ ایک چھوٹے بھائی کو اس نے اسکول سے اٹھوا کر حفظ کے لیے مدرسے میں داخل کروا دیا تھا۔ اور باقی ایک بھائی اور دو بہنیں گاؤں میں ہی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔

جنید کا گاؤں اور ہمارا گاؤں دونوں ایک ہی ضلع میں واقع تھے یہ الگ بات ہے کہ کا فاصلہ زیادہ تھا۔ کوئی

سے میسر ہیں۔ پھر بھی ...... یہ بے کلی! یہ بے چینی! ایک عجیب تضاد کی سی کیفیت ہے، جسے صرف میں ہی محسوس کرسکتی ہوں۔ میں، میں خوش ہوں بہت ...... لیکن مجھے پتا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ جو میرے گھر میں، میرے شہر میں، میرے ملک میں اس دنیا میں ہو رہا ہے، ایسے نہ ہوتا جیسا کہ ہے۔ میرے پیکر میں تخریب کی روح جانے کیوں آسمائی ہے کہ میری تعمیر، میری تکمیل نہیں ہو پاتی۔

کیسے لے آتے ہیں!! شاہدہ کہتی تھی کہ یار تیرے گھر تو فون ہے اور تیری ممی بھی پہرہ دینے والوں میں سے نہیں پھر بھلا بوریت کا کیا سوال''

اپنی ایک کلاس فیلو کی کہی ہوئی بات یاد آئی تو اس نے سوچا' کیا واقعی؟؟؟ اچھا کیا ہرج ہے؟ چلو ٹرائی کرلیتے ہیں۔' یوں اگلے لمحے نیلی فون اس کی گود میں تھا اور انگلیاں ڈائل کے نمبروں سے کھیل رہی تھیں۔

اور پھر...... رسالے کے دفتر کے اس کمرے میں

اسی طرح کرتے کرتے جنید نے پرائیوٹ میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ کچھ خاص نمبر تو نہ لیے تھے بس سیکنڈ پوزیشن میں پاس ہوگیا تھا۔ اس کو گویا کہ تعلیم میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ پھر بھی گھر والوں، دوستوں اور میرے کہنے پر اس نے میٹرک تو کرلیا لیکن آگے پڑھنے سے صاف انکار کردیا اور فل ٹائم اپنی لیبارٹری کو دینے لگا۔ تقریباً دو سال میں وہ ایک ماہر ٹیکنیشن بن چکا تھا اور تقریباً اکثر ٹیسٹ وہ خود ہی کرلیتا تھا۔

......☆☆☆......

یہ غالباً 1994ء کی بات ہے۔ میرا اور نگہت کا عشق زوروں پر تھا اور اب جنید کا بہانہ ہوتا تھا اور میں اکثر نگہت سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔

میرے ماموں، نگہت کے والد جو کافی بیمار رہتے تھے اور کچھ عرصہ پہلے ان کا گردے کا آپریشن بھی ہوا تھا۔ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

مرنے سے ایک دو دن پہلے انہوں نے اپنے گھر والوں سے وصیت کی کہ میری بیٹی نگہت کا رشتہ جنید کو دے دینا۔

جنید ان کا بھتیجا تھا، یتیم بھی تھا، ان کو پیارا بھی بہت تھا تو انہوں نے جنید کے لئے اپنی بیٹی نگہت کا رشتہ دینے کا کہہ دیا۔ یہاں آکر میں بے اختیار ہوگیا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے، ایک طرف جنید تھا، ایک طرف نگہت تھی، ایک طرف ہمارا پیار تھا اور آخری فیصلہ ماموں جان مرحوم کا فیصلہ تھا۔ جس نے میرے ہاتھ باندھ دیے اور میں کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہ کرسکا کہ شاید یہی خدا کو منظور تھا۔

اسی دن سے میں نے نگہت سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کرلی اور بعد میں جنید کو باور بھی کروادیا کہ میرا اس سے اب کوئی ایسا تعلق نہیں۔

یہاں سے ان کی دوستی، محبت کا نیا آغاز ہوا اور میں ان الجھے ہوئے حالات میں اپنی تعلیم پر مکمل توجہ نہ دے سکا اور بمشکل انٹر کا امتحان پاس کرسکا۔ جنید کو قریبی شہر میں اس سے اچھی ملازمت آفر ہوگئی تو وہ وہاں چلا گیا۔ اپنے گاؤں وہ پندرہ بیس دن کے بعد چکر لگالیتا تھا۔ گھر پر سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے اس کا چھوٹا بھائی جو حفظ کررہا تھا وہ مدرسے سے بھاگ گیا اور آوارہ گردی میں لگ گیا۔ اس نے بہت سمجھایا لیکن بے سود۔ وہ مجھ سے اکثر ہر بات میں مشورہ لیتا تھا لیکن نگہت کے بارے میں اس نے کبھی تذکرہ نہیں کیا تھا، حالانکہ ان کا تعلق تھا، ان کی منگنی کی رسم بھی ہوچکی تھی وہ ملتے بھی تھے لیکن وہ نگہت کی کوئی بات مجھ سے شیئر نہیں کرتا تھا۔

ایف اے کے بعد میں فارغ تھا تو میرے چچا نے مجھے فوج میں بھرتی کروادیا۔ اور میں کراچی چلا گیا۔ 2004ء میں میرے رشتہ داروں میں ہی میری شادی ہوگئی تھی اور میری شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی جنید اور نگہت کی شادی بھی ہوگئی تھی۔

اس کی شادی میں ہر لمحہ اس کے ساتھ تھا، میرے دل میں نگہت کے لیے ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا اور نہ میں نے کبھی سوچنے کی جسارت کی تھی۔ نگہت وداع ہوکر جنید کے گھر اس کے گاؤں چلی گئی۔ انہی دنوں جنید اپنے ایک دوست کے کہنے پر یہ ملازمت چھوڑ کر فیصل آباد کسی فیکٹری میں چلا گیا۔ اب وہ ہر ماہ دو تین دن کی چھٹی لے کر اپنے گھر چلا جاتا، اسی دوران چھوٹے بھائی کو بھی اللہ نے ہدایت دی تو وہ دوبارہ مدرسے جاکر حفظ مکمل کرنے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے جنید کو پہلی بار دو جڑواں بیٹوں سے نوازا، لیکن نجانے کیا پیدائشی مسئلہ تھا ایک بیٹی معذور ہوگئی، اس کی ٹانگیں اپنا وزن نہیں سہار سکتی تھیں وہ بس چارپائی کی ہوکر رہ گئی تھی۔ پھر اس کے بعد اللہ نے جنید کو نعمت سے بھی نوازا۔ اس کا بیٹا عاشراب تقریباً 5 سال کا ہوچکا تھا۔

جنید سے میری اکثر بات چیت رہی تھی فون پر بھی، کبھی کبھار عید بقرعید یا چھٹی پر ملاقات بھی ہوجاتی تھی اور نگہت سے بھی ملنا تھا۔ لیکن میں نے کوئی بات محسوس نہیں کی، کہنے والوں نے بہت کہا کہ جنید اب بدل گیا ہے۔ فیصل آباد میں ہی اس نے شادی کرلی ہے اور مگر نگہت پر توجہ بالکل نہیں دیتا۔ اس میں کچھ سچ تو یوں تھا کہ اب وہ گھر پیسے کم دیتا تھا۔ چھوٹا بھائی حفظ کرنے کے بعد شادی کرکے الگ ہوگیا تھا اور تیسرے بھائی کو

میٹرک کے بعد نوکری کرنا پڑی گھر کے حالات کو سنبھالنے کے لیے، میں نے کئی بار کہا بھی تو وہ یہی جواب دیتا۔

''کیا کروں تنخواہ ہی اتنی ہے۔ زیادہ تر پیسے گھر ہی بھیجتا ہوں۔'' البتہ کسی اور لڑکی سے تعلق کے بارے میں اس نے مجھ سے کوئی استفسار نہیں کیا تھا۔

......☆☆☆......

نگہت نے میٹرک تک پڑھا تھا پھر پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ بڑی حساس اور نازک مزاج تھی۔ بہت زیادہ اسمارٹ، بھوری سی آنکھیں، رنگ گورا تھا، دیکھنے میں بہت کمزور لگتی تھی لیکن اس کے حوصلے جوان تھے۔ بڑے صبر اور حوصلے سے گاؤں کے کچے مکان میں اٹھ ،نو سال گزار دیے۔ اس دوران جنید نے گھر میں بس ایک پکا کمرہ بنا کر دیا تھا۔ چار دیواری بھی پکی دیوار کی تھی اور دوسرا کمرہ بھی کچا۔ لیکن نگہت نے سسرال والوں سے تنگی کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ اور وہ ہر ایک سے انسانی خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی۔ گھر میں جب بھی نگہت کا تذکرہ ہوتا تو میری بیوی کہتی کہ اچھا تم اب تک اسے بھول نہیں پائے؟ اپنا پہلا پیار تو کوئی بھی نہیں بھول پاتا اور وہ تو تھی ہی اتنی پیاری، نہ بھولنے والی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ جو اللہ کو پیارے ہوتے ہیں وہ بہت کم عمر لکھوا کر لاتے ہیں۔ ایسا ہی نگہت کے ساتھ ہوا۔ جب مجھے اس کی اچانک وفات کی اطلاع ملی تھی تو میں حواس باختہ ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے ہوا کیا۔ اچھی بھلی تھی صبح بچوں کو ناشتا کروا کے اسکول بھیجا اور کام کاج مکمل کر کے سو گئی۔ دوسری بیٹی جو چل پھر نہیں سکتی تھی وہ بھی سو گئی۔ بچوں کا اسکول نزدیک ہی تھا۔ بریک ٹائم میں بچے گھر آئے تو ماں کو سوتا دیکھ کر واپس چلے گئے۔ پھر چھٹی کے بعد آئے تو ماں کو اسی حالت میں دیکھا بیٹی 8 سال کی اور بیٹا 6 سال کا تھا۔ انہوں نے ماں کو ہلایا جلایا۔ کچھ سمجھ نہ آیا تو ساتھ ہی ڈاکٹر کا گھر تھا اس کو بلانے بھاگ پڑے۔ گھر میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی ساس کسی کام کے سلسلے میں شہر گئی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے بچے کو پریشان دیکھا تو اس کے ساتھ گھر آ گیا اس نے نگہت کی حالت دیکھی۔ وہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر اپنے گھر کی عورتوں کو بلوا لیا تاکہ وہ بچوں کو سنبھال سکے۔ لمحوں میں محلے والوں کو پتا چل گیا۔ ہر کوئی غمگین تھا۔ سب پریشان تھے۔ کوئی گھر والا بھی گھر پہ نہیں تھا جنید کو فوراً اطلاع کر دی گئی۔ جنید کی امی بھی دو تین گھنٹے کے بعد گھر پہنچی تو حقیقت جان کر ان کو بھی اپنا کوئی ہوش نہ رہا۔ ابھی دو دن پہلے ہی میری ایک خالہ زاد بہن کی فوتگی ہوئی تھی، ساتھ والے گاؤں میں۔ سارا خاندان اکٹھا ہوا تھا اور بس ایک دن بعد ہی، جنید کا بھی برا حال تھا، مجھے بھی بر وقت اطلاع تو ہو گئی تھی لیکن کچھ پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی وجہ سے مجھے چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ رشتہ داروں نے جنید اور اس کی امی کو مشکل سے سنبھالا، نگہت کی دونوں بہنیں چاروں بھائی غرض پورا خاندان غم سے نڈھال تھا، بے وقت تو نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے، اچانک موت ضرور ہم سب کو غمزدہ کر گئی تھی۔

نگہت کے چہلم پر میں نے خاص طور پر چھٹی لی تھی، گو کہ جنید سے میں نے فون پر تعزیت کر لی تھی، کئی بار بات کی تھی لیکن میرا ملنا اپنی جگہ۔ بہت ضروری تھا اس سے دلی افسوس کا اظہار کیا۔ اسعر سے میں جنید کی ایک شادی شدہ بہن ایک ماہ تک بچوں کو سنبھالتی رہی تھی۔ جنید مجھے تو بہت زیادہ غمزدہ لگتا تھا لیکن کہنے والوں نے کہا کہ اسے اتنا زیادہ افسوس ہوا نہیں کہ جتنا ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال میں واپس آ گیا تھا۔ یہ رمضان المبارک کا آغاز تھا جب نگہت کا چہلم ہوا۔

اب اس کے بچوں کو اس کی امی یعنی بچوں کی دادی ہی سنبھال رہی تھیں، گویا کہ بہت مشکل کام تھا لیکن اور کوئی صورت بھی نہ تھی۔

......☆☆☆......

نگہت کی وفات کو دو مہینے مشکل سے گزرے ہوں گے کہ لوگوں نے باتیں کرنا شروع کر دیں کہ جنید کا فیصل آباد میں کسی لڑکی سے کوئی چکر ہے۔ یا تو شادی کر چکا ہے یا کرنے والا ہے۔ میں نے بھی باتیں سنیں لیکن اب جب نگہت ہی نہیں رہی تھی تو اب اس سے کچھ پوچھنا بنتا نہیں تھا، ان شبہات کو جنید کے ایک اقدام

سے تقویت یوں ملی کہ جنید اپنا تمام سامان جو نگہت جہیز میں لائی تھی سارے کا سارا فیصل آباد لے گیا۔ اب تو سب سیفر ض کیا، یقین کر لیا کہ جنید نے مکان لے کر سامان بھی شفٹ کر لیا ہے تو ضرور شادی بھی کر چکا ہے۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کے پلان کا ہمیں پتا نہیں تھا اور ویسے بھی ہوتا تو وہی ہے جو کہ منظور خدا ہوتا ہے۔

دراصل جنید نے اپنی امی اور بھائی کے ساتھ مل کر دوا قعتا ہی عیدالاضحیٰ کے بعد شادی کا پروگرام بنا لیا تھا لیکن...... عید سے ایک دن پہلے وہ بچوں کی شاپنگ کر کے اپنے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ سامنے سے تیزی سے آتی بائیک اس سے ٹکرا گئی تھی۔ جنید بھی بائیک پر تھا۔ حادثہ شدید تھا، وہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ یہ اس وقت جڑانوالہ کے قریب ہی کہیں تھا۔ کسی نے اطلاع دی تو Rescue والوں نے آ کر اٹھایا اور ہسپتال لے گئے، جنید کی بری حالت تھی دائیں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی دایاں بازو بھی نکل گیا تھا اور سر پر بھی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ جڑانوالہ ہسپتال والوں نے ابتدائی طبی امداد دے کر اسے فیصل آباد الائیڈ ہسپتال منتقل کر دیا، اس دوران پولیس والوں نے اس کا تمام سامان قبضہ میں کر کے اس کے بھائی حافظ کو اطلاع دے دی تھی جو فوراً ہی گھر سے کرائے کی گاڑی لے کر فیصل آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے جنید کا چیک اپ کروایا تو انہوں نے وہی بتایا، ٹانگ ٹوٹ گئی بازو بھی اور سر پر شدید چوٹ جس کی وجہ سے پورا سر بھی سوجا ہوا تھا اور دماغ کے متاثر ہونے کا بھی خدشہ تھا۔

مجھے بھی عید کی شام اطلاع ملی تو بڑا افسوس ہوا۔ چھٹی بہت کم تھی پھر عید بھی تھی، فوراً نہ جا سکا البتہ عید سے اگلے دن ضرور پہنچ گیا۔ میرے جانے سے پہلے تک حافظ جنید کے تمام ٹیسٹ کروا چکا تھا۔ دماغ محفوظ رہا تھا، ٹانگ میں فریکچر ہو گیا تھا اور بازو بھی نکل گیا تھا۔ بڑی بری حالت تھی جنید کی، اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا، اسے میری آمد کی کوئی خبر نہیں تھی۔ مجھے سامنے پا کر اسے بہت خوشی ہوئی لیکن اسے دیکھ کر میں خود پہ قابو نہ پا سکا اور آنکھ سے آنسو گرنے لگے، حافظ نے کچھ حوصلہ دیا، بچپن کا یار تھا کزن تھا اور بہت کچھ تھا۔ کچھ باتیں بھی جنید نے اپنے جانے اور ایکسیڈنٹ ہونے تک جہاں تک اسے ہوش تھا اتنا اس نے بیان کیا۔ اسی دوران ڈاکٹر بھی آ گیا جس نے عندیہ دیا کہ ہو سکتا ہے کہ کل آپریشن ہو لہٰذا آپ خون کا بندوبست کر لو۔

میرے ذہن میں تھا کہ جنید کی حالت بہتر ہوئی تو ضرور اس سے شادی سے متعلق اور افواہوں سے متعلق بات کروں گا، لیکن اس کی حالت دیکھ کر میں اس سے کوئی بات نہ کر سکا اور اجازت لے کر واپس آ گیا۔ لیکن اس دوران جو بات مجھے سب سے زیادہ مشکوک لگی وہ تھا حافظ کا رویہ تھا۔ گو کہ کسی نے جنید کو شادی سے منع نہیں کیا تھا لیکن سب کا یہی خیال تھا کہ ابھی تو نگہت کو مرے چھ مہینے بھی نہیں ہوئے اور اس کو شادی کی پڑ گئی ہے لیکن درحقیقت اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک ضرور رہی تھی جو کہ اب ساری بات سامنے آ گئی تھی۔

حافظ نے بتایا کہ 11 تاریخ کو انہوں نے جنید کے نکاح کا پروگرام ترتیب دیا تھا، یہ الگ بات کہ اس کا ذکر حادثے سے پہلے کسی کو نہیں تھا۔ عید والے دن جانے کیسے نگہت کے چھوٹے بھائی کو یہ خبر مل گئی کہ جنید کا 11 کو نکاح تھا تو عید والے دن پہلے روز وہ اور اس کا بڑا بھائی جنید کو دیکھنے ہسپتال جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے جونہی ان کو کسی ذریعے سے یہ خبر ملی تو انہوں نے فیصل آباد جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا، سب کو دکھ تو یہی تھا کہ جنید نے چھ ماہ بھی صبر نہ کیا اور لوگوں کو ان باتوں میں صداقت نظر آنے لگی کہ نگہت کے ساتھ جنید کا رویہ ٹھیک کیوں نہیں تھا۔ ظاہر ہے فیصل آباد میں اس کے کسی لڑکی کے ساتھ تعلقات کافی عرصے سے چل رہے تھے بھی تو اب بات شادی تک پہنچی تھی۔ مگر! ہونی ہو کر رہتی ہے نگہت سے کی گئی بے وفائی نے جہاں نگہت کو جیتے جی کھا لیا تھا وہیں منصفِ تقدیر نے خود جنید کو بھی چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

جنید کو اپنے کیے اور نگہت سے بے وفائی کی یہ کڑی سزا ملی تھی۔ اللہ اس کے حال پر رحم کرے۔

......☆☆☆......

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

قسط نمبر: 16

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہم شکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہم شکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہوجاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی

شکل عالی سے مشابہ ہے۔ بہرکیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہوگئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فوراسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آ جاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

شیرون ایک دم سے پھسلتی ہوئی نیچے آ کر شاہ زیب کے پاس پہنچ گئی۔ اس کی پھرتی قابل دید تھی، سب مشین گن ہاتھ میں لیے وہ کسی خونخوار بلی کی مانند چاروں طرف نگاہیں جمائے ہوئے تھی، لیکن گولیوں کا یہ حصار نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ پھر ایک غراتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

''کتے کے بچو! اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ تمہارے خون کے چھینٹے ان پہاڑی پتھروں سے چپک جائیں گے۔''

زبان انگریزی تھی، لیکن لہجہ کسی اور ملک کے باشندوں کا معلوم ہوتا تھا۔ شیرون نے اس سمت گولیاں برسائیں جدھر سے یہ آواز آئی تھی، لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔ ان کی تعداد کافی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ لوگ کہہ رہے ہیں وہ کر کے دکھا سکتے ہیں۔ پھر دفعتاً ہی سب مشین گن کا ایمونیشن ختم ہوگیا، اب اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے دوبارہ لوڈ کیا جائے۔ شیرون نے تھیلے کی جانب چھلانگ لگائی تو شاہ زیب نے اسے روک دیا، اس نے عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا تھا، ایک بار پھر گولیاں برسائی جانے لگیں، یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ لوگ شاہ زیب اور شیرون کے گرد دائرہ تنگ کر رہے ہوں غالباً وہ لوگ اپنے دشمنوں کا ہر قیمت پر زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ شاہ زیب نے محسوس کر لیا کہ ان سے جنگ کرنا بیکار ہے چنانچہ اس نے آہستہ سے شیرون سے کہا۔

''میرا خیال ہے گولیاں برسانا بیکار ہے، اگر وہ اپنے ارادے پر عمل پیرا ہونے کے لیے تل گئے تو ہم زندہ نہیں بچیں گے۔''

شیرون نے ایک لمحے کے لیے شاہ زیب کی طرف دیکھا، پھر سب مشین گن ایک طرف پھینک دی۔ گویا اس نے شاہ زیب کے جملوں کی حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ورنہ شیرون کے پچھلے واقعات بتاتے تھے کہ وہ کسی بھی حالت میں شکست تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔ شاہ زیب کے ذہن میں ایک اور خیال بھی آیا تھا۔ پچھلی دفعہ وہ دلدل عبور کر کے اپنے دشمنوں کو جل دے کر نکل گئی تھی، لیکن اس بار اس نے شاہ زیب کو اکیلے چھوڑ کر جانا مناسب نہ سمجھا ورنہ شاید وہ یہاں بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیتی۔ سب مشین گن پھینک دی گئی، چند لمحات کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی، پھر ایک بڑی چٹان کی چوٹی کے عقب سے ایک انسانی جسم برآمد ہوا، اس کے ہاتھ میں خاص قسم کی رائفل دبی ہوئی تھی، اس کے پیچھے کئی لوگ چوٹیوں کے عقب سے نکل آئے تھے، وہ سب کے سب مسلح تھے اور ان کی تعداد سولہ سترہ

سے کم نہیں تھی، تاروں کی چھاؤں میں یہ لوگ ان کے ہیولوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ شاہ زیب نے ایک گہری سانس لے کر شیرون سے کہا۔

''شیرون!،، اس وقت کسی قسم کی مداخلت مناسب نہیں ہے، وہ لوگ اگر ہمیں ہلاک کرنا چاہتے تو یہ کام ان کے لیے مشکل نہ ہوتا، وہ ہماری گرفتاری چاہتے ہیں اور میرے خیال میں ان سے مقابلہ بے مقصد ہوگا۔ ہم کسی دوسرے مرحلے پر ان سے نمٹنے کا فیصلہ کریں گے۔''

شیرون خاموش رہی، یہ لوگ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے اور جب دشمنوں کے قریب پہنچے تو ان کے حلیے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ایک لمحے کے لیے شاہ زیب کو یہ گمان بھی گزرا تھا کہ ہوسکتا ہے یہ اسنون برادرز کے آدمی ہوں۔ لیکن اب ان کے حلیوں کو دیکھ کر اس اندازے کی تردید ہوگئی تھی۔ ان کے لباس چیتھڑوں کی شکل میں ان کے جسموں پر جھول رہے تھے، چہرے نمایاں نہیں تھے لیکن یہ احساس ہوتا تھا کہ افریقی نہیں ہیں۔ ان کے جسموں پر جو لباس تھے وہ جدید ساخت کے ہی تھے، یہ دوسری بات ہے کہ اب وہ تار تار ہورہے تھے، لیکن ان کے بدن قوی ہیکل تھے اور ان کے آگے بڑھنے کا انداز بے حد جارحانہ تھا، چند ہی لمحات کے بعد انہوں نے شاہ زیب اور شیرون کے گرد دائرہ بنالیا۔

چند منٹ بالکل خاموشی طاری رہی اور اس کے بعد دفعتاً ہی ان کے حلق سے عجیب وحشیانہ آوازیں بلند ہوئیں اور وہ شاہ زیب اور شیرون پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے دونوں کے ہاتھ پشت پر کس دیے پھر ان کے لباس کی تلاشی لی گئی اور شاہ زیب اور شیرون کے پاس سے جو کچھ بھی دستیاب ہوسکا انہوں نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ شاہ زیب اور شیرون نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ بہرطور انہوں نے شاہ زیب اور شیرون کو ڈھلانوں کی سمت دھکیلنا شروع کردیا۔ رات کی تاریکی میں ان ڈھلانوں کو عبور کرنا بہت مشکل کام تھا۔ لیکن انہوں نے شاہ زیب اور شیرون کے بازو پکڑ لیے اور انہیں گھسیٹتے ہوئے نیچے لے چلے تھے۔ شاید وہ اس اترائی سے خوب واقف تھے، بہرطور یہ آسان کام بھی نہیں تھا اور اس میں کافی وقت صرف ہوا۔ چونکہ شاہ زیب اور شیرون ان سے پوری طرح تعاون کررہے تھے اس لیے ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں برتی گئی تھی۔

بالآخر یہ لوگ پہاڑوں کے دامن کے دوسری جانب پہنچ گئے۔ پھر وہ لوگ شاہ زیب اور شیرون کو دھکیلنے لگے۔ یہ سفر بھی کافی طویل تھا، اس کے بعد تاروں کی چھاؤں میں کچھ عجیب سے ہیولے نظر آئے، یوں لگتا تھا جیسے زمین پر بہت سے کوہان ابھر آئے ہوں، ان کا رخ انہی ہیولوں کی جانب تھا۔

وہاں پہنچے تو عجیب و غریب قسم کی بوسیدہ چھولداریاں دیکھیں جن کا پورا شہر سا آباد تھا۔ ان کا احاطہ بے حد وسیع تھا۔ ان دونوں کو ایک جگہ درخت کے تنے کے ساتھ باندھ کر بٹھادیا گیا۔ عجیب قسم کے رسے جو غالباً کسی قسم کی چھال سے بنائے گئے تھے ان کے جسموں کے گرد لپیٹ دیے گئے تھے اور اتنی کس کر لپیٹے گئے تھے کہ وہ دونوں جنبش بھی نہیں کرسکتے تھے۔ پھر دو آدمی ان پر تعینات ہوگئے اور باقی چھولداریوں کے اندر چلے گئے، اس کے بعد ان دونوں سے کسی نے گفتگو نہیں کی تھی۔ شاہ زیب نے شیرون کی طرف دیکھا وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کسی گہری سوچ میں تھی، تب شاہ زیب نے آہستہ سے کہا۔

''اس صورت حال سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے شیرون، پتا نہیں یہ کمبخت کون لوگ ہیں، تعلق مہذب دنیا سے ہی ہے، لیکن یہاں صحرائے اعظم میں آکر وحشی بن گئے ہیں۔''

شیرون نے شاہ زیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا پھر آہستہ سے مسکرادی جیسے یہ تاثر دے رہی ہو کہ وہ ان واقعات سے خوفزدہ نہیں ہے۔ شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ وہی شیرون تھی جو اسٹون برادرز کے بہترین لڑاکوں کو طویل عرصے سے جل دے رہی تھی، لیکن اب پھنس گئی تھی اور اس کے پھنس جانے کی وجہ شاہ زیب تھا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی اور پھر صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔ چھولداریوں کے اندر زندگی شروع ہوگئی تھی۔ بہت سی آوازیں ابھر رہی تھیں، ان میں نسوانی آوازیں بھی تھیں اور کچھ عجیب سی چیخیں اور کراہیں بھی۔ دن کی روشنی میں شاہ زیب نے غور سے ان لوگوں کو دیکھا تھا۔ ان کے لباس درحقیقت مہم جوؤں کے سے تھے لیکن اتنے بوسیدہ کہ ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ پھر سورج نکل آیا دو آدمیوں نے شاہ زیب اور شیرون کو درخت کے تنے سے کھولا اور دھکا دیتے ہوئے چھولداریوں کے درمیانی حصے میں لے گئے۔ وہاں بہت سے لوگ قطار بنائے بیٹھے تھے جن میں اسٹون برادرز کے گروہ کے افراد بھی شامل تھے۔ شاہ زیب اور شیرون کو بھی وہیں بٹھا دیا گیا اور پھر سب میں خوراک تقسیم کی جانے لگی۔

عجیب وغریب خوراک تھی، کسی درخت کے پھل اور ایک عجیب سا سیال جو گرم تھا ظاہر ہے یہ کھانے پینے کی چیزیں نہیں تھیں، سیال چکھ کر دیکھا تو بالکل پھیکا تھا۔ البتہ پھل ذرا ذائقے میں اچھے تھے۔ شاہ زیب اور شیرون نے پھل کھا لیے۔ کھانے کے بعد شیرون چند لمحات اسی طرح بیٹھی رہی اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹون برادرز کے گرفتار شدگان کا جائزہ لینے لگی، شاہ زیب نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا، شاہ زیب نے آہستہ سے کہا۔

''ان لوگوں کی گرفتاری باعث حیرت ہے، ویسے ان کا ساز وسامان بھی غالباً انہی لوگوں کے قبضے میں آچکا ہے۔'' شیرون نے اٹھ کر جائزہ لیا اور ایک طرف اشارہ کر دیا۔ وہاں اسٹون برادرز کی جیپیں اور ٹرک وغیرہ کھڑے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص شاہ زیب کے سامنے سے گزرا وہ ایک انتہائی خوبصورت کپڑے کا ریشمی سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اوپری بدن پر پھٹا لباس تھا سر اور ڈاڑھی کے بال اسی انداز میں بکھرے ہوئے تھے جیسے دوسرے لوگوں کے نظر آتے تھے۔ دوسرے لوگ اس کے سامنے مؤدب نظر آرہے تھے۔ وہ شاہ زیب سے چند گز کے فاصلے پر رکا اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی شیطانی چمک تھی۔ پھر وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ غالباً شاہ زیب یا شیرون کو اس نے کسی قابل نہیں سمجھا تھا۔ بڑا ہی خوفناک ماحول تھا۔

وقت گزرتا رہا پھر دوپہر کو سب کو کھانا دیا گیا، یہ کھانا ابلے ہوئے جوار کے دانوں اور پھلوں پر مشتمل تھا۔ یہ اسی طرح کے پھل تھے جیسے صبح کو ناشتے میں انہیں دیے گئے تھے، غالباً پھلوں کے درخت پاس ہی موجود تھے اس لیے یہی کھانے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ بہرحال کھانا کھا لیا گیا، شاہ زیب چاہتا تھا کہ اسٹون برادرز کے لوگوں کا جائزہ لے۔ اسٹون برادرز کے آدمی بھی قیدی تھے اور چل پھر رہے تھے مسلح افراد ان کی نگرانی ضرور کر رہے تھے۔ لیکن ان کی کسی بات میں دخل انداز نہیں تھے۔ شاہ زیب ان کا جائزہ لیتا رہا۔

شام کو تقریباً چھ بجے تھے۔ فضا میں تاریکیاں اتر رہی تھیں۔ جب شاہ زیب ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھا اور شیرون سے کہا

''تم اطمینان سے بیٹھو، میں تھوڑی دیر کے بعد واپس آ جاؤں گا، خوفزدہ تو نہیں ہو۔''
جواب میں شیرون نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی اور شاہ زیب آہستہ قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ان لوگوں کے درمیان تھا۔ ان میں سے کچھ نے شاہ زیب کو پہچان لیا تھا اور ان کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکل گئیں۔ پھر ایک جانب سے اسٹون برادرز کی آواز سنائی دی۔
''اوہ مائی گاڈ، تم بھی گرفتار ہو گئے۔''
شاہ زیب نے پلٹ کر دیکھا تو دونوں بھائیوں میں سے ایک وہاں موجود تھا، مگر بری حالت میں تھا، اس نے پتلون قمیص پہنی ہوئی تھی اور اس کی حالت بہت خراب تھی، شاہ زیب نے کافی فاصلے پر مسٹر گرج اور سونارا کو بھی دیکھا، شاہ زیب کے بارے میں شاید دور دور تک اطلاع پھیل گئی تھی کیونکہ اسی وقت اسٹون برادرز کا بھائی بھی ایک جانب سے تیز تیز چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا پھر وہ بھی نزدیک پہنچ گیا۔
''اوہ شاہ زیب تم تم ان لوگوں کے درمیان کیسے آ پھنسے، اچانک ہی نظر آئے ہو تم؟''
''ہاں میں بھی اسی مصیبت کا شکار ہو گیا جناب، میں انہی پہاڑیوں میں قیام پذیر تھا کہ رات کو وہ لوگ مجھ پر حملہ آور ہوئے۔''
''اوہ مائی گاڈ، کیا تم نے مشین گن سے مقابلہ کیا تھا؟''
''ہاں۔''
''رات کو مشین گن کی آواز سنی گئی تھی، جبکہ ان میں سے کسی کے پاس مشین گن نہیں ہے''
''یہ مشین گن شیرون کے پاس تھی۔''
''شیرون، تو کیا وہ بھی ان کے قبضے میں ہے؟''
''ہاں وہ بھی ان کے قبضے میں ہے۔''
''کہاں ہے؟ کس جگہ ہے وہ؟''
''لکڑیوں کے ڈھیر کے اس جانب۔''
''اوہ یہ تو بہت برا ہوا، کیا شیرون خود کو قابو میں رکھے گی۔ وہ آتشی عورت ہے، کہیں وہ ہم سب کے لیے بھی موت کا باعث نہ بن جائے۔''
''نہیں میں اسے کنٹرول میں رکھوں گا۔''
''تم۔'' اسٹون برادراز میں سے ایک نے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔''
''مگر تم غائب کہاں ہو گئے تھے، تم نے ایک بار بھی ہم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ تم نے شاید بدعہدی کی ہے۔''
''اب یہ آپ لوگوں کی سمجھ ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں، کیا آپ اس خوفناک آتش فشانی سے بچے جس کا میں شکار ہو گیا تھا؟''
''ہم لوگ خوش قسمتی سے اس علاقے میں تھے جہاں زلزلے اور آتش فشانی کے اثرات نہیں ہوئے، مگر تم؟''
''... میں عین اسی جگہ تھا جہاں آتش فشانی نے تباہ کاریاں پھیلائی تھیں، مگر میری زندگی بچ گئی، یہی

تعجب کی بات ہے۔ میرا ٹرانسمیٹر وغیرہ بھی سب اسی زلزلے کی نذر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں بھلا آپ لوگوں سے کیا رابطہ قائم کرتا۔''

''اوہ سوری ڈیئر ہم نے اس انداز میں بھی سوچا تھا لیکن تم جانتے ہو کہ انسانی ذہن شیطانی خیالات کی آماجگاہ ہوتا ہے، بہرحال دیکھ لو ہم بھی اسی عذاب کا شکار ہو گئے۔''

''میں اس عذاب کی نوعیت جاننا چاہتا ہوں۔''

''یہ پرتگالی باشندے ہیں، کمبخت یہاں کیا کر رہے ہیں اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا، ویسے غالباً یہ بحری قذاق ہیں ان کی خونخوار کیفیت یہی بتاتی ہے ہو سکتا ہے کسی تباہ شدہ جہاز سے اتر کر افریقہ کے ان علاقوں میں آپھنسے ہوں، ان کے سردار کا نام شابورا ہے۔ شابورا انتہائی وحشی آدمی ہے، غالباً تم نے اسکرٹ پہنے ہوئے کسی شخص کو دیکھا ہوگا وہی ان کا سردار ہے شابورا۔''

''ہاں میں اسے دیکھ چکا ہوں۔''

''وہ مردود بے حد شاطر اور خونخوار ہے۔ ذرا سی گڑبڑ خطرناک ہو سکتی ہے۔ ہم تم سے دوبارہ ملیں گے، اس وقت تک شیرون کو قابو میں رکھنا تفصیلی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

شاہ زیب نے گردن ہلا دی تھی اور واپس شیرون کے پاس آ گیا تھا۔ وہ شاہ زیب سے بے نیاز اسی طرح لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس لاتعلق سی بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے انداز میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بہرحال وقت گزرتا رہا، بہت سے معاملات شاہ زیب کے ذہن میں الجھے ہوئے تھے لیکن ظاہر ہے کسی کے پاس اس کا حل نہیں تھا۔

......☆☆☆......

دوسرے دن صورت حال پرسکون نظر آئی۔ کھانا تقسیم ہوا اور ان لوگوں کی وہی کیفیت رہی۔ کھانا تقسیم ہوا۔ ظاہر ہے کھانے میں تھا ہی کیا۔ وہی پھل زہر مار کر لیے گئے، لیکن اس صورت حال سے کچھ اور اندازے بھی قائم ہوئے تھے، مثلاً یہ کہ شابورا کے آدمی کب تک ان لوگوں کو قید میں رکھیں گے، کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کرنا پڑے گا نہیں، ویسے اس واقعے کے بعد جو سنسنی پھیلی ہوئی تھی وہ اب آہستہ آہستہ زائل ہوتی جا رہی تھی۔

شاہ زیب نے ایک فیصلہ کر لیا کہ اب اس کی زندگی کا اولین مقصد شیرون کو اس کی منزل تک پہنچانا ہے۔ راستے میں چاہے شابورا آئے یا اسٹون برادرز، اب وہ ہر مشکل سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔

ویسے شابورا کا حدود اربعہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا، اس واقعے کے بعد جو سنسنی پھیلی تھی وہ آہستہ آہستہ زائل ہو رہی تھی اور اسٹون برادرز کے آدمیوں میں نقل و حرکت پائی جاتی تھی، تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص شاہ زیب کے قریب پہنچ گیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔

''وہ تمہارے منتظر ہیں۔''

''آ رہا ہوں۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

شہزادے اپنے مخصوص گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی کیفیت مزید ابتر ہو گئی تھی، ان کے چہرے پتھروں کی طرح سنگین نظر آ رہے تھے۔

''کل تم سے گفتگو ادھوری رہ گئی تھی، مگر یہ بتاؤ کہ تمہیں نقشہ مل سکا یا نہیں؟''

''نقشہ اس کے پاس ہے اور اس کا حصول اب مشکل نہیں ہے، میں اس دوران جن مشکلات کا شکار رہا، اس کا اندازہ آپ کو ہو ہی چکا ہوگا۔''

''ہاں، کسی حد تک، یہ کمبخت شابورا ایک عذاب کی حد تک مسلط ہو گیا ورنہ ہم کامیابی سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔''

''مگر یہ شابورا ہے کیا بلا؟''

''خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ پرتگال کا باشندہ ہے اور نجانے کن ارادوں کے تحت ان علاقوں میں نکل آیا ہے۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لوگ کافی عرصے سے یہاں ڈیرے ڈالے ہوئے ہوں، ہوسکتا ہے یہ قانون کے باغی ہوں اور پورے گروہ نے یہاں پناہ لے رکھی ہو، ان کے پاس کھانے پینے کی اشیاء ختم ہو چکی ہیں، لیکن اسلحہ کافی مقدار میں موجود ہے اور غالباً انہوں نے ہم پر حملہ کھانے پینے کی اشیاء کے حصول کے لیے ہی کیا ہے اور کوئی ارادہ نہیں معلوم ہوتا۔''

''لیکن پھر ہمیں قید رکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟''

''اسی کے لیے میں پریشان ہوں، لیکن فکر کی بات نہیں، تمام انتظامات تقریباً مکمل ہو چکے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ہوشیار رہو، اور سنو شوراک کا کھیل ختم کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہوسکتا، میں تمہیں تمام صورت حال سمجھائے دیتا ہوں۔'' اسٹون برادرز میں سے ایک نے کہا دوسرا شہزادہ خاموش تھا، شاہ زیب نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔

''ہم لوگ بظاہر قیدی ہیں، لیکن میرے چند ذہین آدمی مسلسل کام کر رہے ہیں، ہم نے وہ جگہیں تلاش کر لی ہیں جہاں ان لوگوں نے اسلحہ کا ذخیرہ چھپایا ہوا ہے اور شاید آج کی رات یا اگر آج ممکن نہ ہوسکا تو کل یقیناً اسلحے کے اس ذخیرے پر قبضہ کر لیا جائے گا اور اس کے بعد ہم ان پر موت برسا دیں گے، ان کے پاس گھوڑے وغیرہ کافی تعداد میں موجود ہیں، لیکن ہمیں ان سے فیصلہ کن جنگ کرنا ہوگی، بے شک ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، لیکن ان میں سے ہر شخص کی ہلاکت بہت ضروری ہے کیونکہ یہاں سے فرار ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ فرار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اپنا تمام ساز و سامان یہیں چھوڑ دیا جائے اور اس ساز و سامان کے بغیر ہم بالکل بیکار ہیں، چنانچہ ہمیں ان میں سے ہر شخص کو قتل کرنا پڑے گا اور اسی کی پلاننگ جاری ہے۔ مسٹر شاہ زیب! اسلحہ تمہیں بھی فراہم کر دیا جائے گا، تمہیں ان لوگوں کے ساتھ شوراک کو بھی ہلاک کر دینا چاہیے۔ جونہی آپریشن شروع ہو تم شوراک کو گولی مار دینا، کم از کم یہ بات تو تمہیں معلوم ہوگی کہ اس نے نقشہ کہاں چھپا رکھا ہے بس وہ نقشہ حاصل کر لو، لیکن سنو، شوراک کی ہلاکت بہت ضروری ہے اسے زندہ نہیں رہنا چاہیے، ورنہ ہم لوگوں کے لیے عذاب بن جائے گی، تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ہماری آخری کوشش یہی ہوگی کہ ہم ان میں سے ہر شخص کو ہلاک کر دیں اور اس کے لیے ہم نے اپنے مورچے بھی منتخب کر لیے ہیں تمہیں ہر لمحے مستعد رہنا ہوگا۔''

شاہ زیب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''میری جانب سے آپ لوگ مطمئن رہیں اور اس کا وعدہ بھی میں کرتا ہوں کہ شوراک کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر ڈالوں گا اور نقشہ اس سے حاصل کر لوں گا۔''

''ویری گڈ، ویسے ان بدمعاشوں نے ہمیں کافی دن پیچھے دھکیل دیا ہے، لیکن کیا کیا جاسکتا ہے، ہم کسی بھی جنگ کے لیے ہر لمحہ تیار رہتے ہیں، یہ کچھ اس انداز سے ہم پر آ پڑے ہیں کہ کہ ہم ان سے مقابلہ بھی نہ

کر سکے، پھر جب شابورا نے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کیں تو ہم نے اپنے تمام کیمرے وغیرہ ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا کہ ہم تو صرف فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں اور افریقہ کے اندرونی مناظر فلماتے ہوئے اس طرف آ نکلے ہیں، کیمرے وغیرہ دیکھنے کے بعد ہی انہوں نے ہماری جان بخشی کر دی تھی، شابورا کا حلیہ غیر مہذب انسان کا سا ضرور ہے، لیکن بیرونی دنیا کے بارے میں یہ لوگ سب جانتے ہیں چنانچہ اس ساز وسامان کی موجودگی ہمارے لیے عارضی زندگی کا باعث بن گئی ہے، مگر جس طرح یہ لوگ وحشت خیزی کر رہے ہیں تم نے اس کا بھی اندازہ لگا لیا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے اسٹون برادرز، میں اپنی ذمے داریاں با آسانی پوری کروں گا۔''

''ہم نے تمہیں اسی لیے تکلیف دی تھی، اب تم چاہو تو دوبارہ شوراک کے پاس جا سکتے ہو'' شاہ زیب نے گردن ہلائی اور ٹہلتا ہوا وہاں سے واپس چل پڑا۔

صورت حال میں ایسی کوئی نئی تبدیلی پیدا ہوئی تھی جو قابل ذکر ہوتی۔ شاہ زیب کی زیرک نگاہیں مسٹر گرج کا جائزہ لے رہی تھیں، ابھی تک ان سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی یہ سچی بات کہ اُسے کہ مسٹر گرج سے بھی دلچسپی نہیں تھی، لیکن وہ بہر حال ایک شخص سے مفاہمت کر رہا تھا تو پھر دوسرے کو نظر انداز کرنا کیا معنی رکھتا ہے، چنانچہ وہ موقع کی تاک میں رہا، براہ راست مسٹر گرج سے ملاقات کر کے وہ اسٹون برادرز کو اپنی طرف سے مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا، البتہ شام کو اسے مسٹر گرج سے ملنے کا موقع نصیب ہو گیا۔

جھٹپٹا ہو گیا تھا اور وحشیوں کے کیمپ میں عجیب وغریب قسم کی اچھل کود ہو رہی تھی، وہ لوگ اپنے طور پر شغل کر رہے تھے میں نے شوراک سے اجازت لی اور پھر یونہی ٹہلنے کے سے انداز میں مسٹر گرج کی جانب بڑھ گیا، جس جگہ مسٹر گرج نے اُدھر اُدھر دیکھا اور شاہ زیب ان کے پاس بیٹھ گیا، ان کی بیٹی بھی چند فٹ کے فاصلے پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی ہوئی تھی۔

''ہیلو مسٹر گرج کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''

''میں بے چینی سے اس بات کا منتظر تھا کہ تم میرے پاس آؤ، شاید میں رات کو تم تک پہنچتا، لیکن اس واقعے کی وجہ سے وہ لوگ رات کو مستعد تھے، عجیب وحشی لوگ ہیں یہ، تمیز کرنا ہی مشکل ہو رہا ہے کہ ان کا تعلق صحرائے اعظم کے کسی قبیلے سے ہے یا باہر کی دنیا سے۔ بہر طور یہ بتاؤ کیا رہا؟''

''اس بات کا علم آپ کو ہو چکا ہوگا کہ شوراک میرے ساتھ ہے۔''

''کیا وہ تعاون کر رہی ہے؟'' مسٹر گرج شاہ زیب کی بات کاٹ کر بولے۔

''ہاں میں نے اسے تعاون پر آمادہ کر لیا ہے۔''

''مگر اب صورت حال بالکل تبدیل ہو گئی ہے مسٹر شاہ زیب، اور میں تم سے اسی تبدیل شدہ صورت حال کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے بے چین تھا۔''

''میرے خیال میں کسی تمہید کے بجائے اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہے تو فوراً کہہ ڈالیں''

''شاید تمہیں اس بات کا علم نہ ہو کہ اسٹون برادرز کے بہت سے کارکن ایسے پوائنٹس پر پہنچ گئے ہیں جہاں اسلحہ ان کی پہنچ سے دور نہیں ہے، وہ آج رات یا کل کسی وقت اپنی مہم کا آغاز کر دیں گے کاش اس سلسلے میں رات کا وقت ہی منتخب کیا جائے۔ بہر حال موقع ملنا شرط ہے، اسٹون برادرز کا منصوبہ ہے کہ اسلحے پر مکمل قابو پانے کے بعد ان لوگوں کو ختم کر دیا جائے، کیونکہ انہیں ختم کرنا بے حد ضروری ہے، اس

سلسلے میں ہر فرد کام کرے گا زندگی۔اور موت کا معاملہ ہے، ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کے بعد صحرائے اعظم میں جینے کے لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، چنانچہ اپنی بقاء کی خاطر ان تمام لوگوں کو ہلاک کر کے اپنا سامان لینا ضروری ہوگا، لیکن سنو ڈیئر شاہ زیب اب جبکہ تم گئے ہو تو میرے اس منصوبے کو زیادہ تقویت پہنچ گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ پہلے میں نے سوچا کہ صرف اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں، لیکن اب تم دونوں میرے ساتھ ہو۔تم نے وہ جگہ دیکھی ہے جہاں ان کے گھوڑے بندھے ہوئے ہیں''

''نہیں۔''

''تو میرے بیان کے مطابق اس جگہ کو ذہن نشین کرلو وہ جو بائیں سمت کا حصہ نظر آرہا ہے، چھولداریوں کے اس طرف اصطبل ہے۔جس وقت یہاں آپریشن ہوگا تمہیں شوراک کے ساتھ سیدھے اصطبل کی طرف جانا ہے، ہوسکتا ہے تمہیں اسلحہ بھی دے دیا جائے، وہاں میں تمہارا انتظار کروں گا، یا اگر تم چھ بجے سے پہلے پہنچ جاؤ تو تم میرا انتظار کرنا، بظاہر ہم ان لوگوں کو گھوڑوں تک پہنچنے سے روکنے کا کام سنبھالیں گے، تاکہ کوئی فرار نہ ہو سکے، لیکن حقیقت یہ ہوگی کہ ہم چاروں یہاں سے فرار ہو جائیں گے، بے شک، ہم کوئی اور سامان ساتھ نہیں لے سکتے، لیکن فی الحال اس سے بہتر اور کوئی خوش نصیبی نہیں ہوگی، پہلی بار اسٹون برادرز افراتفری کا شکار ہو رہے ہیں، اور میں اس سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

شاہ زیب نے مسٹر گرج کی بات پر گردن ہلا دی تھی، ظاہر ہے وہ خود بھی یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا، بہرطور مسٹر گرج اگر ساتھ لگ گئے تو پھر بعد کی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی، اُس نے مسٹر گرج سے وعدہ کیا

کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق عمل کرے گا۔"

مسٹر گرج مطمئن ہو کر بولے "بس میں تم سے اسی لیے ملاقات کا بے چینی سے منتظر تھا۔ اب تم جاؤ۔"

شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا شوراک کے پاس پہنچ گیا۔ کسی وہاں سے اوپر شبہ نہیں ہوا تھا۔ کسی کو شاہ زیب کے اوپر شبہ نہیں ہوا تھا۔ شوراک بالکل پرسکون تھی۔ شاہ زیب نے آہستگی سے اسے اپنا سارا پروگرام سمجھا دیا اور شوراک نے مستعدی سے گردن ہلا دی۔ شاہ زیب نے اسے مسٹر گرج کے بارے میں بھی بتا دیا تھا اور اس نے اس بات پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بڑی سنسنی خیز کیفیت تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ اسٹون برادرز کے آدمی موقع کی تاک میں لگے ہوئے تھے اور پھر اسی رات جب تقریباً ڈھائی بجے تھے، ایک آدمی نے شاہ زیب کی پنڈلی میں ٹھوکر ماری اور شاہ زیب نیم غنودگی کے انداز میں چونک پڑا۔ دوسرے لمحے شاہ زیب کے ہاتھ میں ایک شاندار رائفل اور کارتوس کی پیٹی دے دی گئی۔ ایسی ہی ایک رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی شوراک کو بھی دے دی گئی شاہ زیب بری طرح اچھل پڑا تھا۔ وہ شخص چھلاوے کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا اور اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ گیا تھا کہ اسٹون برادرز کے آدمی اسلحہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور انتہائی احتیاط اور خاموشی کے ساتھ یہ اسلحہ تقسیم ہو رہا تھا۔ ویسے کم از کم اس کارکردگی کی انہیں داد دینی چاہیے تھی ورنہ شابورا کی آدمی غیر مستعد نہیں تھے۔ اسٹون برادرز کے ساتھیوں نے ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

شاہ زیب نے رائفل چھپالی کیونکہ شابورا کے پہرے دار زیادہ دور نہیں تھے۔ اس کے بعد شاہ زیب نے شوراک کی جانب دیکھا، اس کی حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا کیونکہ اسٹون برادرز کے منصوبے میں اس کی موت سرفہرست تھی، ہر چند کہ یہ ذمے داری شاہ زیب کے سپرد کی گئی تھی، لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسٹون برادرز خود بھی شوراک پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں اور اگر وہ خود ہی اسے ہلاک کرنے میں مصروف ہو جائیں تو پھر شوراک کی زندگی مشکل ہو جائے گی، چنانچہ شاہ زیب نے شوراک کو کچھ ہدایات دیں ان ہدایات کی وجہ شاہ زیب نے شوراک کو نہیں بتائی تھی، اس کی کنپٹیاں چیخ رہی تھیں اور وہ دونوں ہی کارروائی کے آغاز کا انتظار کر رہے تھے کہ دفعتاً کام شروع ہو گیا۔ چھولداریوں کے ایک مخصوص حصے میں بم کا دھماکہ ہوا اور چھولداریوں نے آگ پکڑ لی، اس کے ساتھ ہی شاہ زیب اور شوراک تڑپ کر کھڑے ہو گئے، پھر جو طوفان برپا ہوا وہ انتہائی سنسنی خیز تھا، گولیاں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں، کسی بھی وقت کوئی بھی ہلاک ہو سکتا تھا۔

شابورا کے پہرے دار چونک کر پلٹے اور انہوں نے اسٹون برادرز کے ساتھیوں کے نشانے لیے لیکن پہلے سے تیار شدہ لوگ انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گئے، شاہ زیب نے شوراک کے ساتھ مطلوبہ سمت چھلانگ لگا دی تھی اور راستے میں آنے والے ہر شخص کو گولیوں سے بھوننا شروع کر دیا، ان میں شاید اسٹون برادرز کے آدمی بھی شامل تھے۔

پہلی ہی دوڑ میں وہ لوگ بائیں سمت کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں گولیوں کی آوازوں پر گھوڑے بدک رہے تھے، شاہ زیب نے گھوڑوں کے رسوں پر ہاتھ ڈال دیے اور ابھی شاہ زیب اور شوراک گھوڑوں پر سوار ہوئے ہی تھے کہ مسٹر گرج اور ان کی بیٹی بھی ان کے قریب پہنچ گئے، پھر انہوں نے بھی

گھوڑوں پر سوار ہونے میں دیر نہ لگائی اور اس کے بعد مسٹر گرج نے ان تینوں کی طرف دیکھ کر کہا۔
''چلو....'' اس کے ساتھ ہی مسٹر گرج نے پلٹ کر گھوڑوں پر فائرنگ کر دی۔ گھوڑے رسیاں تڑا کر بھاگے اور پیچھے آنے والوں کے راستے میں حائل ہو گئے، مسٹر گرج غالباً یہی چاہتے تھے کہ فوراً ہی ان کی سمت پر توجہ نہ دی جائے، اس کے بعد انہوں نے ایک سمت اختیار کی اور پھر رات کی تاریکی میں گھڑسواری کا شاندار مظاہرہ کیا جانے لگا۔ مسٹر گرج کی اس جواں مردی پر شاہ زیب کو حیرت ہو رہی تھی، پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ سفید بالوں والا بوڑھا اس مستعدی کا مظاہرہ کر رہا ہے، گھوڑوں کی ننگی پشت پر سفر کرنا معمولی بات نہیں تھی، سونارا بھی کمال کی گھڑسواری کر رہی تھی، بظاہر وہ بیمار نظر آتی تھی لیکن اس وقت اس کا یہ مظاہرہ قابل داد تھا۔
عقب میں گولیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں، نجانے ان کے درمیان کیا فیصلہ ہو، استون برادرز زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے اور شابورا بھی کم نہیں تھا، بہر حال گھوڑے دوڑ رہے تھے اور پھر عقب کی تمام آوازیں معدوم ہو گئیں۔ پتا نہیں مسٹر گرج نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس سمت رخ کیا تھا یا یہ صرف ایک اتفاق ہی تھا کہ ان لوگوں کو سیدھے، سپاٹ اور ہموار راستے مل گئے تھے۔
چھوٹی موٹی رکاوٹیں گھوڑے خود عبور کر رہے تھے اور ابھی تک ان کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ استون برادرز اور شابورا کے گروہوں کے درمیان کیا فیصلہ ہوا۔ بہر طور ان لوگوں کا وہاں سے نکل آنا ہی بہتر تھا اور اب تو مسٹر گرج اور ان کی بیٹی سونارا بھی شابورا کے چنگل سے آزاد ہو چکے تھے۔ ویسے غور کرنے پر اس برفانی ریچھ کا کردار بھی عجیب نظر آ رہا تھا۔ صورت حال اب اس کے قابو میں تھی، اور یہ وہ تھا جس کے پاس اس قبیلے تک کے راستوں کے نقشے موجود تھے۔ ویسے راستے تو اس نے شاہ زیب کو بھی سمجھا دیے تھے اور شاہ زیب انہیں ذہن میں بٹھانے کی بھرپور کوشش کرتا رہا تھا۔
پھر صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو ایک گھنا جنگل نظر آنے لگا، افریقہ میں اور تھا ہی کیا، صحرا جنگل پہاڑ دلدلیں اور خوفناک مناظر۔ یہ لوگ کافی دور نکل آئے تھے اب اس کا خدشہ نہیں رہا تھا کہ وہ لوگ کسی طرح شاہ زیب یا مسٹر گرج تک پہنچ جائیں گے، گھوڑوں کی رفتار سست ہو گئی رات بھر دوڑتے رہے تھے اور یہ بھی کمال کی چیز تھی، ان کے انداز میں اب تھکن نمایاں ہو گئی تھی۔ جنگل کے سرے پر پہنچ کر مسٹر گرج کہنے لگے،
''مسٹر شاہ زیب، میرا خیال ہے ہمیں جنگل میں داخل ہو کر آرام کی کوئی جگہ تلاش کر لینی چاہیئے، یہاں ہم دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ بھی رہیں گے۔''
''جیسا آپ پسند کریں، اب تو صورت حال کا کنٹرول آپ کے پاس ہے۔''
''نہیں میرے دوست، مجھے قدم قدم پر تمہاری معاونت کی ضرورت ہے۔''
شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، پھر یہ لوگ گھوڑوں سے اتر گئے اور ان کی لگامیں پکڑے ہوئے جنگل میں داخل ہو گئے۔
جنگل اپنی روایتوں کے ساتھ ہر طرح کی ہولناکیوں سے پر تھا۔ درخت بہت گھنے تھے اور ان کے نیچے تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، کیونکہ یہ جنگل کا سرا تھا، اس لیے ابتدائی حصوں میں کچھ روشنی نظر آ رہی تھی لیکن باقی اندر داخل ہو کر ہی اندازہ ہو سکتا تھا کہ اندر کی صورت حال کیا ہے، لیکن یہ احساس

ضرور ہو رہا تھا کہ اندر گہری تاریکی چھائی ہو گی، تھوڑا سا اندر داخل ہونے کے بعد بالآخر ایک ایسی صاف ستھری جگہ مل گئی جہاں قیام کیا جا سکتا تھا
حشرات الارض کو دور رکھنے کے لیے خشک لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن کر دی اور یہ خطرہ مول لیے بغیر چارۂ کار نہیں تھا چنانچہ آگ کے حصار کے درمیان اُن لوگوں نے اپنا ڈیرہ ڈال لیا، گھوڑوں کو البتہ آگ کے حصار سے کچھ فاصلے پر درختوں سے باندھ دیا گیا تھا، گھوڑوں کے لیے کافی خوراک موجود تھی لیکن ان کے اپنے کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں تھا، یہ بات سبھی جانتے تھے چنانچہ آرام کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ شاہ زیب زمین پر دراز ہو گیا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں لیکن پیٹ میں دوڑنے والے چوہوں نے سونے کی اجازت نہیں دی اور نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ سونارا شاہ زیب کے بالکل نزدیک تھی اس کے بعد شوراک اور پھر مسٹر گرج، شاہ زیب دیر تک اسی طرح بے سدھ پڑا رہا اور جب نیند نہ آئی تو کروٹ بدل کر تھوڑی سی آنکھیں کھولیں تب اس نے شوراک کو دیکھا جو مسٹر گرج کے سینے سے لگی ہوئی تھی، مسٹر گرج محبت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے، وہ شاید کچھ کہتے بھی جا رہے تھے جو شاہ زیب فاصلہ ہونے کے باعث نہیں سن سکا تھا۔
یہ منظر شاہ زیب کے لیے باعث تعجب نہیں تھا کیونکہ مسٹر گرج اسے شوراک کی کہانی سنا چکے تھے۔ شاہ زیب نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور اس بار نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی تھی اور بھوک کے باوجود سو گیا، ظاہر ہے جب تک نیند نہیں آئی تھی نہیں آئی تھی لیکن جب آ گئی تو پھر تمام گھوڑے فروخت ہو گئے اور اس کے بعد مسٹر گرج نے ہی شاہ زیب کو جگایا تھا، شام ہو چکی تھی اور مسٹر گرج بھرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔
''مسٹر شاہ زیب غضب ہو گیا۔''
شاہ زیب ان کے الفاظ سن کر بری طرح اچھل پڑا، اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھا۔
''گھوڑے گھوڑے....'' مسٹر گرج کے منہ سے نکلا آگ بجھ چکی تھی اور اب اس جگہ ہلکا ہلکا دھواں باقی رہ گیا تھا شاہ زیب نے گھوڑے کے لفظ پر اپنے گھوڑے کی طرف دیکھا، لیکن اسے گھوڑے نظر نہیں آئے تھے، تب اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کیا ہوا گھوڑوں کو؟''
''کسی زہریلے جانور کا شکار ہو گئے، تین گھوڑے مردہ ہیں اور ایک رسہ تڑا کر فرار ہو گیا ہے''
شاہ زیب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے، زہریلا جانور کیا ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا، لیکن جب مسٹر گرج نے جا کر مردہ گھوڑوں کو دیکھا تو جان ہی نکل گئی، ان کے بدن سے زرد پانی بہہ رہا تھا اور جسم میں جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے۔ بمشکل تمام ذہن پر قابو پا سکا تھا، اول تو بھوک نے حالت خراب کر دی تھی اور پھر گھوڑوں کی ہلاکت لیکن اس کے باوجود زندہ رہنے کے لیے آگے بڑھنا تھا، اب صورت حال کچھ بھی ہو کیا کیا جا سکتا ہے، البتہ واپس آنے کے بعد شاہ زیب نے مسٹر گرج سے پوچھا۔
''کیا اس جنگل میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنی منزل کی جانب ہی بڑھ رہے ہیں یا راستہ بھٹک گئے ہیں؟''
''ہمیں اسی جنگل سے گزرنا تھا، ہمارا راستہ بالکل درست ہے۔ میں نے اچھی طرح غور کرنے کے

بعد اسی طرف رخ کیا تھا۔" مسٹر گرج شاہ زیب سے باتیں کرتے رہے، پھر انہوں نے طے کیا کہ آج رات اور یہیں قیام کریں گے تاکہ جنگل میں آگے بڑھنے کے لیے چاق و چوبند ہو جائیں، لیکن خوراک کا بندوبست کرنا ضروری تھا اور اس کام کے لیے چاروں ہی آگے بڑھ گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پرندے ہی ہاتھ لگ سکے جنہیں بمشکل شکار کیا اور بھون کر کھا لیا گیا، بہرحال کسی حد تک بھوک مٹ گئی تھی۔ پھر رات کی خشک لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن کی گئی اور وہ رات بھی وہیں گزار دی گئی تاکہ دوسرے دن صبح سورج کی روشنی میں آگے بڑھیں۔

......☆☆☆......

پھر جب مشرقی افق پر صبح کاذب کا دھندلکا صبح صادق میں تبدیل ہونے لگا تو ان لوگوں نے آگے کا سفر شروع کر دیا، یہ لوگ گھنی جھاڑیوں اور سر جوڑے درختوں کے نیچے سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے، جنگل کی زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی تھی، پھر تھوڑی دور چلنے کے بعد ان لوگوں نے محسوس کیا کہ درختوں پر اچھل کود ہو رہی ہے، یہ لوگ آگے بڑھتے رہے اور اس اچھل کود پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، جنگل میں جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور بندروں کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں، تھوڑے فاصلے پر چلنے کے بعد مسٹر گرج نے کہا۔

"اگر مجھ سے اندازے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تو یہ جنگل زیادہ طویل ثابت نہیں ہوگا، البتہ یہاں درندے موجود ہیں، اس کے اختتام پر ہمیں اشتولا قبائل سے پالا پڑے گا، یہ قبائلی بھی خطرناک ہیں، لوٹ مار کر لیتے ہیں، ان سے بچ کر ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ ان سے ہمارا مقابلہ ہو۔ جنگل کے دائیں سمت کا سفر اختیار کرو اور راستہ کاٹتے رہو، اشتولا قبائل ہمیں سیدھ میں ہی ملیں گے۔ بس اس کے بعد دریائے شیتاک تک پہنچ جائیں گے اور یہی ہماری منزل ہے۔"

یہ لوگ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے اور ان سب کی چوکنا نگاہیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں کہ دفعتاً شوراک نے اپنی رائفل اٹھا کر دونوں ہاتھ سیدھے کر دیئے، سب چونک کر رک گئے اور ان کی نگاہیں شوراک کی نگاہوں کے محور کا تعاقب کرنے لگیں، پھر دفعتاً ہی سامنے کی جھاڑیاں ہلیں اور پھر ایک شیر کی صورت دکھائی دی وہ جھاڑیوں میں دبکا ہوا تھا۔ مسٹر گرج نے چند لمحات اس کا جائزہ لیا اور اس کے بعد بولے۔

"وہ آرام کر رہا ہے اسے چھیڑے بغیر یہاں سے گزر جائیں تو بہتر ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو صورتحال کافی پریشان کن ہو جائے گی۔"

یہ لوگ دبے پاؤں وہاں سے آگے بڑھنے لگے، ہیبت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی اور سب لوگ اپنے دل کی دھڑکنیں اپنے کانوں میں محسوس کر رہے تھے، ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھایا جا رہا تھا، شور مچانے والے بندر رفو چکر ہو گئے تھے، شیر نے واقعی کوئی تعرض نہیں کیا اور یہ لوگ اس جگہ سے کافی دور نکل آئے۔ بہرطور یہ فاصلہ بمشکل طے ہو رہا تھا اور پھر اس وقت سفر کرتے ہوئے نجانے کتنی دیر گزر گئی تھی جب یہ لوگ ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں جنگل پیچھے سے بھی زیادہ گھنا تھا۔ درخت ایک دوسرے میں پیوست ہو رہے تھے اور ان کی شاخیں آپس میں اتنی جڑی ہوئی تھیں کہ دن کی روشنی قطعی نیچے نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ ہر لمحہ ایک نئے خوف کا حامل تھا اور ہوا کی سرسراہٹ بھی اپنی اصل کیفیت سے کئی گنا زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ فضا میں تبدیلی رونما ہونے لگی اور یہ لوگ جنگل کے اس انتہائی دشوار گزار حصے سے بخیر و عافیت نکل آئے تھے۔ ہوا میں نمی کا احساس فوراً ہی ہو گیا تھا، جس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی تھی کہ کوئی دریا جنگل کے بالکل قریب ہے۔ بائیں سمت کھلا میدان پھیلا ہوا تھا جس کے انتہائی سرے پر پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آ رہا تھا، مسٹر گرج نے کہا۔

''بالکل خاموشی اختیار کرو یہ علاقہ ہمارے لیے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، اس بات کے امکانات ہیں کہ یہاں آس پاس اشتولا قبیلے کے لوگ موجود ہوں ہم ان سے بچ کر ہی نکل جائیں تو ہمارے حق میں بہتر رہے گا۔''

پھر سب داہنی سمت ہوتے چلے گئے، جنگل اب پیچھے رہ گیا تھا اور سنگلاخ چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، یہ لوگ ان چٹانوں کی آڑ لے کر سفر کر رہے تھے، ایک جگہ رک کر مسٹر گرج نے ایک سمت اشارہ کیا اور شاہ زیب ادھر دیکھنے لگا، بہت فاصلے پر کسی قدر گہرائی میں جھونپڑیوں کا ایک شہر نظر آ رہا تھا۔ یہ یقیناً اشتولا قبیلے کے لوگ تھے لیکن انہوں نے مسٹر گرج اور شاہ زیب وغیرہ کو نہیں دیکھا تھا ورنہ مصیبت ہی آ جاتی۔ یہ لوگ سفر کرتے رہے اور اس کے بعد ان کے سامنے دریا آ گیا، دریا کی رفتار کافی تیز معلوم ہوتی تھی، یہ لوگ اس کے کنارے کنارے آگے بڑھتے رہے اور پھر ایک جگہ کئی کشتیاں رسی سے بندھی ہوئی نظر آئیں، مسٹر گرج نے بتایا کہ یہ اشتولا قبیلے والوں کی کشتیاں ہیں جن میں بیٹھ کر وہ خوراک کی تلاش میں نکل جاتے ہیں اور مچھلیاں پکڑ کر لاتے ہیں، ان سب کو انہی میں سے ایک کشتی پر سفر کرنا ہو گا۔ شاہ زیب نے حیرت زدہ نگاہوں سے مسٹر گرج کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن مسٹر گرج، دریا کا بہاؤ تو اسی سمت ہے جدھر ان کے جھونپڑے نظر آ رہے ہیں، کیا ہمیں دریا میں دیکھا نہیں جائے گا؟''

''یہ خطرہ مول لینا پڑے گا کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہمیں انہی کشتیوں کے ذریعے اپنا سفر طے کرنا ہے۔''

شاہ زیب نے آہستہ سے گردن ہلائی، چند لمحات کے بعد انہوں نے ایک بڑی کشتی کی رسیاں کھولیں اور پھر بڑی احتیاط سے اس میں سوار ہو گئے، دوسری کچھ کشتیوں سے بھی چپو اٹھا لیے گئے تھے تاکہ سفر کی رفتار تیز کی جا سکے۔ کشتی دریا کے دھارے برق رفتاری سے آگے بڑھنے لگی اور مسٹر گرج نے ان تینوں کو مستعد کر دیا تاکہ اگر اشتولا قبیلے کے قریب سے گزرتے ہوئے دوسری طرف سے کوئی جدوجہد کی جائے تو دشمنوں سے اپنا بچاؤ کیا جا سکے۔ کشتی اچھی خاصی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی، پھر دفعتہً ہی کنارے پر انسانوں کے ٹڈی دل نظر آئے، غالباً انہیں دیکھ لیا گیا تھا۔ وہ ہاتھوں میں نیزے لیے اُن کے قریب آنے کا انتظار کر رہے تھے، ان کی تعداد دیکھ کر حواس گم ہونے لگے، اگر یہ سب کشتی میں سوار لوگوں پر نیزے پھینک ماریں تو ان کا کیا حشر ہو گا جبکہ اگر شاہ زیب وغیرہ مل کر بھی ان پر گولیاں برسائیں تب بھی اتنے سارے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، موت ایک بار پھر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور کشتی آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے
شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہو گی......؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

ایس ایس پی انویسٹی گیشن

پیارے قارئین! ہماری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ ہم اپنے وطن، اپنے شہر، اپنے علاقوں سے قوم کی خدمت کرنے والے ان اشخاص کو آپ کو متعارف کرائیں۔ جو آپ کے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی درویش صفتی کے باعث دکھائی نہیں دیتے۔ ان ہی اشخاص میں سے ایک ہمارے تحفظات کے امین محکمے......جی ہاں! POLICE سے تعلق رکھنے والے SSP انویسٹی گیشن ملک الطاف سرور بھی ہیں۔ آپ کراچی کے اہم علاقے ملیر میں بطور SSP انویسٹی گیشن تعینات ہیں اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں دل و جان سے کارفرما ہیں۔ گذشتہ دنوں ہونے والی ایک خوبصورت ملاقات میں ملک الطاف سرور سے جو مختصر گفتگو ہوئی وہ قارئین کے روبرو ہے۔

س: اس مقام تک کس طرح پہنچے؟

ج: میں محنت اور لگن سے آج اس مقام پر پہنچا ہوں اس میں میری ماں کی دعائیں اور لوگوں سے نیکی کرنا شامل ہے۔

س: اب تک کہاں کہاں اپنے فرائض انجام دے چکے ہیں؟

ج: میں سندھ کی مختلف جیلوں میں تعینات رہا۔ جس میں لاڑکانہ، حیدرآباد ہیڈ کوارٹر، جیکب آباد، سکھر جیلوں میں تعینات رہا اور وہ میں نے اپنے نگرانی میں جیل میں قید قیدیوں کے ساتھ اچھا وقت گزارا۔

س: کراچی کے موجودہ حالات کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور انویسٹی گیشن پولیس نے امن کی بحالی نے

اپنا کردار کس طرح ادا کیا؟

ج: کراچی آپریشن میں بھتہ خوری اور ٹارگٹ کلنگ میں 80 فیصد کمی ہوئی ہے انوسٹی گیشن پولیس کے پاس وسائل کم ہونے کی باوجود نتائج بہتر دے رہی ہے۔ جبکہ ملیرانوسٹی گیشن پولیس نے سانحہ چکرا گوٹھ۔ 12 مئی سمیت کئی نامی گرامی ٹارگٹ کلرز کو پکڑااور سانحہ صفورا گوٹھ کے ملزمان کی نشاندہی پر بہت بڑا نیٹ ورک پکڑا گیا اور پولیس کو بڑی کامیابی ملی۔ سانحہ صفورا میں DIG سلطان خواجہ اور DIG ایسٹ منیر اے شیخ کی سربراہی میں سانحہ صفورا گوٹھ کا کیس پولیس نے انتہائی مختصروقت میں حل کر کے ایک تاریخ قائم کردی ہے۔

س: کیا ہر مجرم دہشت گرد ہی ہوتا ہے؟ آپ ایک مجرم کی شناخت کس طرح کرتے ہیں؟

ج: دہشت گرد بے گناہ لوگوں کو خون میں نہلانے والے رحم کے قابل نہیں میں نے اپنے ماتحت عملے کوسختی سے ہدایت کی ہے کہ وہ جوملزمان گرفتار کریں اس کے شواہد مکمل ہوں اور وہ عدالت سے سزا دلوائیں تاکہ لوگوں کوانصاف مل سکے۔

س: زیادہ تر قیدیوں کا جرم کیا ہوتا ہے؟

ج: سندھ کی جیلوں میں دس سے پندرہ فیصد تک قیدی ذاتی رنجشوں اور چھوٹے مقدمات میں بند ہوتے ہیں۔

س: آپ ذاتی طور پر ٹارگٹ آپریشن میں پسند کرتے ہیں یا اپنے شعبے انویسٹی گیشن ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں؟

ج: مجھے ذاتی طور پر ٹارگٹ آپریشن پسند ہیں۔ جرم کے ثابت ہوتے ہی اسے جڑ سے اکھاڑ دینا چاہیے۔ برائی کا پنپنا جرائم کی حوصلہ افزائی ہے۔ پولیس کے اچھے افسران انوسٹی گیشن کے بجائے آپریشن میں جانا پسند کرتے ہیں۔ جرم کو ناسور بننے سے پہلے ہی نیست ونابود کر دینا چاہیے۔

س: کیا کبھی سیاست میں آنے کا دل چاہا؟

ج: میں سیاست سے دور رہا کیونکہ میرے والد جب

مجھے ذاتی طور پر ٹارگٹ آپریشن پسند ہیں۔ جرم کے ثابت ہوتے ہی اسے جڑ سے اکھاڑ دینا چاہیے۔ برائی کا پنپنا جرائم کی حوصلہ افزائی ہے۔ پولیس کے اچھے افسران انوسٹی گیشن کے بجائے آپریشن میں جانا پسند کرتے ہیں۔ جرم کو ناسور بننے سے پہلے ہی نیست و نابود کر دینا چاہیے۔

سے سیاست میں تھے تو انہوں نے ہمیں اور گھر کو کوئی ٹائم نہیں دیا جس کی وجہ سے میں سیاست سے دور رہا اور میں نے یہ طے کرلیا کہ میں اب ہمیشہ کی طرح پانچ سے نو تک جاب کروں گا۔

س: کبھی کسی مجرم سے خطرہ محسوس ہوا؟

ج: میں نے آج تک کسی خطرناک سے خطرناک مجرم سے خطرہ محسوس نہیں کیا۔

س: ہر وقت جان ہتھیلی پہ رکھتے ہیں کبھی تو خوف آیا ہوگا؟

ج: مجھے زندگی میں ایک ہی خوف رہا کہ کوئی شخص بے گناہ میرے ہاتھ سے جیل نہ چلا جائے۔ باقی مجھے کسی دہشت گرد سے کوئی خوف نہیں۔

س: جیل میں قیدیوں کی فلاح کے لیے کیا اقدامات کیے؟

ج: چھوٹے موٹے جرائم میں قید قیدیوں کو NGO کے ذریعے تعلیم بھی دلوائی اور ہنر بھی سکھوایا بعض جیلوں میں تو قیدی چھوٹے جرائم میں آتے ہیں اور جرائم پیشہ بن کر نکلتے ہیں لیکن میں اپنے ماتحت عملے سمیت قیدیوں پر سخت نظر رکھتا ہوں۔

س: کیا قیدی جیل میں اپنی ذہنی آسودگی کے لیے ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہیں؟

ج: بالکل...... اکثر قیدی باقاعدگی سے ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہیں اور آپ کا ڈائجسٹ سچی کہانیاں تو دنیا بھر کی طرح ہماری جیلوں کا بھی مقبول ترین ڈائجسٹ ہے۔

س: آپ کو ہمارے پرچے کی کیا چیز متاثر کرتی ہے؟

ج: آپ کے پرچے میں شائع ہونے والی اکثر کہانیاں عوام کو جرائم سے باخبر کرتی ہیں۔ اس لیے میں سچی کہانیاں کو ایک عوام کا نبض شناس اور عوام کا ہمدرد پرچہ کہوں گا۔

س: ہمارے قارئین کے لیے کوئی پیغام......؟

ج: قارئین سے مخاطب ہو کر صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا۔ جب تک قانون اور عوام میں دوستی نہیں ہوگی جرائم میں کمی نہیں آسکتی۔ میری تمام پاکستانیوں سے سچی کہانیاں کے توسط سے ایک گزارش ہے کہ خدارا!! اپنے حقوق پہچانو اور قانون اور قانون کے محافظوں پر بھروسہ کرنا شروع کر دیں۔ عوام کے تعاون کے بغیر نہ قانون کامیاب ہوسکتا ہے اور نہ ہی ملک ترقی کی راہوں پر گامزن ہوسکتا ہے۔

"پاکستان پائندہ باد"

☆☆......☆☆

توشۂ خاص، خوانِ ہفت رنگ حکایتیں

مختصر مختصر، خوش بیاں، فرحت ساماں، زہر کار، عبرت اثر حکایتیں

کھپرو سے پہلی حکایت

سید محمد عمر علی شاہ بخاری

اُس نوجوان کی حکایت، جسے حاسدوں نے کہیں کا نہ چھوڑا۔

ہمارے خاندان کا اصل تعلق اندرونِ سندھ تعلقہ ''کھپرو ضلع، سانگھڑ شہر سے ہے۔ میرے والد مرحوم کی بڑی زبردست اچھی چلتی ہوئی پرچون کی دکان تھی۔ میری والدہ اور میرے منع کرنے کے باوجود ابو ادھار دیتے تھے۔ پھر ہماری اچھی چلتی ہوئی دکان کو پتا نہیں کیا ہوا کہ ختم ہونا شروع ہوگئی۔ میرے مشورے پر والد مرحوم نے کراچی کے ایک اچھے عامل سے حساب لگوایا۔ تو اس نے بڑا چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

''آپ کی دکان پر بندش کروادی گئی ہے۔ لٰہذا میرا دیا ہوا عمل کرو۔''

میرے والد مرحوم نے عامل کا دیا ہوا وہ عمل تو چ شروع کر دیا لیکن ہماری دکان ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔ اور یوں ہمارے عروج سے زوال کی داستان نے جنم لیا۔

گھر میں لڑائی جھگڑے ناچاقی نے ڈیرے ڈال

دیئے۔ آئے روز کی چخ چخ سے تنگ آکر میری والدہ جو ماشاء اللہ سے حیات ہیں۔ میرے تیسرے نمبر کے بھائی شہزاد اور چار بہنوں کو لے کر کراچی چلی گئیں اور یوں میں اور میرے والد مرحوم بیچارے اکیلے رہ گئے۔ جبکہ میرا دوسرے نمبر والا بھائی نوابشاہ کے ایک مدرسے سے عالم کا کورس کر رہا تھا۔ جواب ماشاء اللہ سے آٹھ سال کی محنت سے ایک عالم دین استاد بن گیا ہے۔ اور ایک بہن کی میرے والد مرحوم نے رشتہ داروں میں شادی کردی تھی۔ ہمارا کھپرو ضلع، سانگھڑ والا گھر صرف تیس لاکھ میں بک گیا اور یوں اپنوں کی سازشوں اور غیروں کے کرائے گئے کالے جادو نے ہمارا ہنستا بستا گھر اجاڑ ڈالا۔ والد صاحب کے دو بھائی تھے۔ دس دس لاکھ روپے سب کے حصّے میں آئے۔

اور یوں میرے والد مرحوم وہ دس لاکھ کی رقم لے کر کراچی آگئے جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں کہ میری ایک بہن کی شادی اپنوں میں کردی گئی تھی۔ وہ شادی ان ہی پیسوں سے کی گئی تھی اور بقیا پیسوں سے ہم نے ساٹھ (60) گز کا ایک مکان خرید لیا اور یوں وہ رقم یعنی دس لاکھ روپے پورے خرچ ہوگئے۔

جب میرے ماں باپ سارا سامان لے کر کھپرو سے کراچی چلے گئے تھے تو میں اُن کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ بلکہ میں وہیں ایک قریبی مسجد میں رک گیا۔ جب کھانے کے لالے پڑے تو مجبوراً مجھے ایک تلخ فیصلہ کرنا پڑا اور میں نے ایک گوٹھ بنام ''قاضی ولی محمد المعروف ''کھپرو'' میں جاکر پناہ لے لی تاکہ کچھ آگے یعنی ماضی، حال کو دیکھتے ہوئے مستقبل کی پلاننگ کی جاسکے۔ وہ گوٹھ والے ہمارے سابقہ شہر کھپرو سے ہی میرے شناسا دوست تھے۔ وہ میرے لیے اور میں انکے لیئے اجنبی مسافر مہمان نہ تھا۔ وہیں کا رہائشی میرا ایک سچا اچھا اور مشکل وقت میں ساتھ دینے والا دوست ثابت ہوا۔ میرے اور بھی کئی نئے دوست بنے جن میں وڈیرہ عبدالرشید راجڑ صاحب اور ''ماجھن عرف ماجھی'' میاں لعل محمد راجڑ صاحب'' ''محمد الیاس راجڑ'' المعروف ''واسن'' نے بھی میرا بڑا ساتھ دیا۔ اور یوں دو تین مہینے پَر لگا کر اُڑ گئے۔

پھر شعبان المعظم کے مبارک مہینے میں گوٹھ والوں کے پیرو مرشد کی درگاہ واقع اندورنِ سندھ حیدرآباد، ٹنڈو محمد خان سے آگے دریائے سندھ کے بالکل قریب واقع گوٹھ بنام ''مُلا کا تیار شریف'' جہاں سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بڑے اولیائے کرام کی خانقا بھی ہیں پر میلہ یعنی عرس منعقد ہوا۔ اور یوں میں ان گوٹھ والوں کے ساتھ ہی وہیں جا پہنچا یعنی مُلا کا تیار شریف۔ پھر وہاں بھی تقریباً تین چار مہینے میں نے اسی درگاہ پر در بدری کی کے دن گزارے اور پھر میں شدید بیمار ہوگیا۔ میں چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔ بخار الٹی دست اور نہ جانے کیا کیا ہوا۔ پیٹ میں نہایت شدید درد اٹھا اور پھر میرے ارد گرد لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے۔

ان میں سے ایک نے کہا کہ سائیں کو یعنی اس درگاہ کے گدی نشین کو کہو کہ اس لڑکے کو حیدرآباد اسپتال لے چلتے ہیں۔ لیکن سائیں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اسے درگاہ کی خاکِ شفاء اور شفاء کا پانی پلاؤ ٹھیک ہوجائے گا۔''

رب کو میری زندگی منظور تھی۔ اور یوں میں خاک شفاء، شفاء والے پانی کے ساتھ نگل کر درگاہ کی مسجد میں سوگیا۔

یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کے میرے پیٹ میں شدید درد تسلسل ہو رہا تھا۔ اسی تکلیف کی حالت میں میں سوگیا درگاہ کی مسجد میں۔ رات کو تقریباً تین بجے کا وقت ہوگا۔ بلکہ یقیناً اس وقت میں نے گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا۔ میرا وہ اذیت ناک درد ختم ہوگیا۔ اور یوں میں نے سکھ کا سانس لیا۔

پھر دوسرے دن دوبارہ درد شروع ہوگیا۔ اس وقت میرے پاس وہیں کا مقامی رہائشی میرا ایک اچھا دوست ''فقیر قائم الدین ہالیپوتہ عطاری'' قادری موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے والد کا نمبر دیا کہ وہ میرے والد کو فوری طور پر کال کر کے میری حالت سے باخبر کرے۔''

اس بیچارے نے اپنے ذاتی موبائیل سے نمبر ملا کر میرے والد مرحوم کو بتانا شروع کیا کہ آپ کا بیٹا مر

رہا ہے۔ آپ جلد سے جلد گوٹھ مُلا کا تیار پہنچو‘‘
پھر اس نے انھیں کراچی سے مُلا کا تیار پہنچنے کا تفصیل سے ایڈریس اور گاڑیوں کا روٹ سمجھایا اور یہ مرحلہ بھی خوش اسلوبی سے طے ہوگیا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ والد مرحوم اسی دن گوٹھ آئے تھے یا دوسرے دن بہر حال میرے والد مرحوم اس گوٹھ پہنچے اور جب مجھے دیکھا تو اُن کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی رو پڑے۔
میرے دوست نے میرے والد مرحوم کو تو بہت کہا کہ آپ ایک رات ٹھہر جائیں اور ہمیں ہماری روایت کے مطابق مہمان نوازی کا موقع دیں۔‘‘
لیکن میرے والد مرحوم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا اور ان سے کہا کہ ہم ابھی واپس کراچی روانہ ہوں گے‘‘
پھر ہم نے چائے کے ہوٹل پر جا کر بسکٹ کھائے اور چائے پی کر کوسٹر میں جا بیٹھے۔ وہ کوسٹر پہلے ٹنڈو محمد خان جاتی تھی اور پھر حیدر آباد۔ حیدر آباد پہنچ کر ہم بدین اسٹاپ سے ڈائریکٹ کراچی جانے والی بس میں سوار ہوگئے۔ اور یوں میرا نہ چاہتے ہوئے بھی کراچی کا سفر شروع ہوگیا۔ کیونکہ میں کراچی رہنے کے حق میں نہیں تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ جو میں یہاں فی الحال بیان نہیں کروں گا۔
کراچی میں ہم صدر میں اترے۔ وہ سردیوں کی شروعات کے دن تھے، بہر حال ہم بس میں بیٹھ کر منظور کالونی کیلئے روانہ ہوئے۔ اور یوں آخر کار میں اپنے گھر پہنچ گیا۔
والد مرحوم کے ساتھ اپنے ذاتی گھر میں آتے ہی شدت غم اور بیمار ہونے کی وجہ سے میں اپنی والدہ محترمہ کے قدموں میں گر گیا اور خوب رویا تھا۔
پھر میں نے انہیں سکون سے بیٹھ کر اپنی ساری داستانِ حسرت سنائی۔ شروع شروع میں یہاں کراچی میں میرا دل بالکل بھی نہیں لگا لیکن آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں، میں یہاں سیٹ ہوتا چلا گیا۔ لیکن، گھر وکو میں کیسے بھول سکتا تھا۔ جبکہ میری پیدائش وہیں کی ہے۔ اور یوں میرے روز وشب کراچی کی ایک پسماندہ علاقے منظور کالونی میں بسر ہونے لگے۔
یہاں آ کر میں ٹھیک تو ہوگیا۔ لیکن مجھ سے چھوٹے بہن'' بھائی جو صرف نام کے ہیں۔ کام کے نہیں مجھ سے نہ جانے؟ دل میں نفرت رکھنے لگے لیکن میرے ذہن میں یہ تھا کہ میرے والد مرحوم مجھے کراچی میں روزگار کرنے کے مقصد سے لائے تھے۔ اور میں کام پر لگا بھی۔ پسند کی چیز خریدی لیکن حاسدوں نے اپنا کام دکھانا شروع کردیا۔ اور یوں میں ڈپریشن کا شکار ہوگیا۔
میں پیٹ کی سیدھی طرف کی آنت پھولنے کے موذی جان لیوا امراض میں مبتلا ہوگیا۔ اور اب'' نیند کی گولیاں'' کھا کر رات کو مصنوعی نیند لیتا ہوں۔ اور میرا آپریشن بھی دو مہینے پہلے ہو چکا ہے۔ لیکن...... سیدھی طرف کے ایک فوطے'' میں بقول'' جناح اسپتال کے ڈاکٹر کی الٹرساؤنڈ رپورٹ کے مطابق پس، ریشہ بھر چکا ہے۔ اور اب میں اس سیدھی ختم کرنے کے لیے گولیاں کھا رہا ہوں۔ بے روزگار بھی ہوں کیونکہ ڈاکٹر نے زیادہ وزن اٹھانے سے سختی سے منع کردیا تھا۔ قرضدار مقروض بھی ہوں لوگوں کا۔ اور یتیم بھی بے بس لاچار بے یارو مددگار مجبور بھی ہوں۔ اور جب سے افسوس ناک اور خاص بات یہ ہے کہ تیس اکتیس سال عمر کا ہونے کے باوجود کنوارا ہوں۔ ظاہری بات ہے۔ جب تک تندرستی، صحتیابی، شفاء نہیں مل جاتی۔ اور روزگار لگ کر کمانے نہیں لگ جاتا تو کون پاگل ہے جو مجھ جیسے غریب کو اپنی بیٹی دے گا۔ کوئی نہیں۔ بلکہ اب تو امید ہی چھوٹتی چلی جا رہی ہے۔
اور اب بقیا زندگی کے دن یونہی بیکاری میں ضائع ہورہے ہیں۔
بیچاری میری والدہ محترمہ اب بھی میری شادی کے ارمان لئے بیٹھی ہیں۔ رب کائنات سے دعا ہے کہ وہ میری والدہ محترمہ کے دلی ارمان اور میرے بھی جائز ارمانوں کو پایہ تکمیل تک پہنچائے'' آمین''

......☆☆☆......

لاہور سے دوسری حکایت

پچھتاووں کی اگن میں سلگتی دوشیزہ کی سنگین حکایت

آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑے وجود کو میں بے یقین نگاہوں سے تکے گئی۔ سرخ متورم آنکھیں، بکھرے بال بلاشبہ وہ قابلِ رحم حالت میں تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کی جائے۔ آہنی سلاخوں پر میری مضبوط گرفت تھی۔ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے بالآخر میں نے من میں مچلتے سوال کو اس کے خالی دامن میں ڈال دیا۔

''زائرہ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے فہید (شوہر) کا قتلِ عمد کیا ہے؟''

جواب میں بخوبی جانتی تھی پر مجھے تو زائرہ کے منہ سے سننا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی نہیں تھے۔ زائرہ میری پڑوسن تو تھی ہی ساتھ میں وہ میری اچھی دوست بھی رہ چکی تھی۔

''ہاں میں نے اُسے مار ڈالا واسعیہ' اپنے ان ہی ہاتھوں سے اُسے ختم کر ڈالا۔ کبھی ان ہاتھوں پر اُس کے نام کی حنا لگائی تھی، آج ان ہی ہاتھوں کو اس کے لہو سے رنگ لیا۔'' نگاہیں اپنے ہاتھوں پر مرکوز کیے اُس نے سادگی سے ایک بار پھر اعترافِ جرم کیا۔

''مگر زائرہ کیوں؟ کیا وجہ تھی آخر، جہاں تک میں جانتی ہوں تو تم دونوں کے درمیان تو بہت محبت تھی۔ پھر یکلخت یہ حادثہ کیونکر پیش آیا؟'' میں نے اُلجھن آمیز انداز میں مزید استفسار کیا۔ ایک زمانہ مجھے جانتا تھا۔ میں ایک معروف رائٹر تھی۔ 'واسیعہ نور' اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بخوبی جانچ رہی تھی۔ چہرے پر ندامت کے سائے لہرا رہے تھے تو کبھی خوف کے...... مگر خوف پر ندامت غالب تھی۔

''محبت!! اس محبت ہی نے تو مجھے اِس مقام پر پہنچایا ہے۔ یہ محبت ہی میری بربادی کا سبب بنی۔'' زائرہ نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ لفظوں میں اُداسی' بےچارگی' پشیمانی سب ہی کچھ پنہاں تھا۔

''جاذبِ حسین' حمزہ (بیٹا) کو ٹیوشن پڑھانے آیا کرتا تھا۔ واسیعہ وہ بالکل میرے کنوارے خوابوں کے جیسا تھا۔ انتہائی خوبصورت لب ولہجہ' سحر طاری کر دینے والی شخصیت تھی۔ جب وہ بولتا تھا تو اس کی دلنشین آواز پر میری بےتاب دھڑکنیں رقص کیا کرتی تھیں۔ میرا من مچل اٹھتا تھا۔ حسین مرد سے حسین سیرت والا مرد قابلِ ترجیح ہے۔ یہ بات میں فراموش کر گئی۔ فہید مجھ پر بہت اعتبار کرتے تھے۔ شک تو بہت دور کی بات ہے وہ تو میرے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ حمزہ کی آڑ میں، میں بھی جاذب حسین سے مضمون محبت کا درس لینے لگی۔ دھڑکنوں میں چھپے پیاسے خواب انگڑائی لے کر بیدار

ہو گئے اور تعبیر کی جستجو کرنے لگے۔ اب جاذب حسین سے جدا ہونا مجھے قطعی منظور نہیں تھا۔ یوں میں نے اپنے محبوب سے بات کرنے کی ٹھانی۔

وہاں بھی یہی صورتِ حال نکلی۔ میں عقل کی اندھی اس کو ہوس کی محبت سمجھ بیٹھی اور اپنی پامالی کا خود سبب بنی۔ میری ممتا بھی اس کھیل میں ہار گئی۔ میرا معصوم بچہ مجھ سے بچھڑ گیا۔''

زائرہ کا ہر لفظ اشکوں کی پھوار میں بھیگا ہوا تھا۔ کرب کروٹیں لے رہا تھا اس کے لہجے میں۔

''اور جب فہمید پر میری حقیقت آشکار ہوئی تو بجائے ندامت کے دریا میں ڈوب مرنے کے میں نے اسے مار دیا اور پھر جاذب حسین مجھے محبت کے نام پر لوٹ کر گمنام ہو گیا۔ جیسے اس کائنات میں وہ آیا ہی نہ ہو۔ عورت اگر محبوب سے بے وفائی کرتی ہے تو وہ عورت ہی رہتی ہے لیکن جب وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کرتی ہے تو وہ ایک گالی بن جاتی ہے۔ آج میں ایک گالی بن گئی۔ اپنا وجود مجھے غلاظت کا ڈھیر لگا کرتا ہے۔ مرنا چاہتی ہوں پر موت نہیں آتی۔''

دردناک آواز میں بولتی زائرہ مجھے بھی رلا گئی تھی۔

''جذبات کی رو میں بہہ کر میں تا عمر کے لیے پاتال میں گر گئی۔ میرا ضمیر میری روح پر آگ کے کوڑے برساتا ہے۔ میری روح جھلس جاتی ہے۔ ہر سانس سلگتی ہے۔ پر موت نہیں آتی۔ واسیعہ حمزہ کو مجھ سے ملانے لے آؤ۔ بس ایک بار مجھ پر یہ احسان کر دو۔''

میرے ہاتھوں پر ہاتھ رکھے وہ گڑگڑا رہی تھی۔ بلک رہی تھی۔ اب میں اُسے کیسے بتاتی کہ حمزہ شہر خموشاں میں جا سویا تھا۔ اُس نے زائرہ کو اپنی معصوم نگاہوں سے اپنے باپ کو قتل کرتے دیکھا تھا۔ پانچ سال کا بچہ قتل ہوتے دیکھے گا تو کہاں بچے گا؟ قتل بھی ماں کے ہاتھوں...... وہ بھی باپ کا۔''

''تم میری کہانی ضرور لکھنا واسیعہ! شاید کوئی عبرت حاصل کر سکے۔ شاید کوئی بھٹکنے سے بچ جائے، میرا انجام جان کر شاید کوئی محبت کے فریب میں نہ آئے، جو ذلت میرے دامن میں آن سمائی ہے خدا نہ کرے وہ کسی اور کا مقدر بنے۔''

میں دل کی گہرائیوں سے 'آمین' کہتے ہوئے بھاگنے کے انداز میں جیل سے نکل آئی۔ زائرہ کی بلکتی صدائیں جیل کی در و دیوار سے ٹکرانے لگی تھیں۔

زائرہ کی آنکھوں سے بہتے پشیمانی کے اشک اب کس کام کے تھے؟ یہی سوچتے ہوئے میں نے گھر تک کا راستہ طے کیا۔

☆☆......☆☆

آج کے حالات کی چشم کشا تصویر

میں پچھلے 22 سال سے بیرون ملک میں رہائش پذیر ہوں وہاں جانے سے پہلے انٹر کے بعد میں نے پولیس فورس جوائن کرلی تھی بعد میں حالات خراب لگے اور باہر کا چانس بنا تو میں باہر چلا گیا۔ یہ بھی ان ہی دنوں کی بات ہے۔ 89,90 کا سن تھا۔ نئی نئی جاب تھی جوش بھی کافی تھا اور پولیس آج کی طرح بدنام بھی نہ تھی۔ اب تو جب بھی اپنے ملک آنا ہوتا ہے پولیس والوں کے کارنامے سن سن کر افسوس ہوتا ہے۔

اب اصل واقعے کی طرف آتا ہوں میری ڈیوٹی جس تھانے میں تھی وہاں کا SHO اچھا اور محب وطن آدمی تھا۔ اس روز میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ رات چھوٹی تھی ہمیں فون پر اطلاع ملی کہ کچھ دیر بعد فلاں سڑک سے ایک مہران کار گزرے گی جس میں فیملی ہوگی اور ان کے پاس ممنوع اشیاء ہوں گی فوری گرفتار کرلیں۔

فوری طور پر تھانے کے افسران کو اطلاع کی گئی SHO۔ سمیت تمام لوگ 20 منٹ میں حاضر اور تھے دو موبائل وین لے کر سڑک کی دونوں جانب کھڑے تھے کچھ۔ دیر بعد اطلاع دینے والے کی کال آئی کہ کار مشرق سے مغرب جانے والی سڑک پر آئے گی تو SHO نے 80 میٹر کے فاصلے پر دونوں وین کو ایک ہی جانب کھڑا کردیا اور احتیاطاً دوسری جانب بھی کچھ اہلکار تعینات کردیے گئے تاکہ یہ نہ ہو کہ مجرم کو علم ہوجائے اور وہ راستہ بدل لے۔ اب SHO کی ہدایت کے مطابق ہم ہر چھوٹی کار کو چیک کررہے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ کار کے متعلق اطلاع صحیح نہ ہو۔ جب کہ اطلاع مصدقہ تھی کیونکہ خفیہ ادارے کی جانب سے آئی تھی۔ آج کل جگہ جگہ اسنیپ چیکنگ کی جارہی ہے نہ جانے کتنی مصدقہ اطلاعات پر کی جاتی ہے اور کتنی صرف اپنی جیب گرم کرنے کے لیے۔ خیر اس رات ہمیں کھڑے کھڑے پون گھنٹا گزر گیا اور ہمیں کامیابی نہیں ملی اس وقت کراچی میں آج کی طرح لوگوں کا ہجوم نہ تھا اور رات کے دس بجے سڑک پر کافی سناٹا تھا۔ ایک تو اس علاقے میں دکانیں کم تھیں کافی اہلکار بور ہونے لگے مگر SHO کی وجہ سے ڈیوٹی دینے پر مجبور تھے۔ ایک آدھ نے سگریٹ سلگائی۔ اچانک ایک نیلے رنگ کی مہران کار نظر آئی۔ جس کی فرنٹ سیٹ پر ایک آدمی، ایک عورت بیٹھے تھے۔ گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا مگر ڈرائیور نہ دیکھنے کی ایکٹنگ کرتا زن سے نکلا SHO نے آگے کھڑی دین کو اطلاع کی دین نے سڑک کے بیچ کھڑے ہوکر

کار کا راستہ روکا پیچھے سے دوسری وین بھی پہنچ گئی۔ ان لوگوں کو گن دکھا کر اترنے کا اشارہ کیا۔ آدمی اترا آگے سیٹ پر عورت بیٹھی تھی جبکہ پچھلی سیٹ پر ایک لڑکی اور دو بچے بیٹھے تھے آدمی کہنے لگا۔

''بولیے صاحب!''

''تم کو جب گاڑی روکنے کا اشارہ کیا تو تم نے گاڑی کیوں نہیں روکی۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

''میں نے دیکھا نہیں، جلدی میں تھا۔'' آدمی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کہاں جا رہے ہوں۔'' دوبارہ ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

''شادی میں، چچا زاد کی شادی ہے۔'' آدمی کے چہرے پر اطمینان تھا جب کہ لڑکی کے چہرے پر ہلکا سا خوف تھا ہم نے فیملی کا سن کر دو لیڈی اہلکار کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ ''تلاشی دو۔'' اے ایس آئی نے تیز آواز میں کہا لیڈی اہلکار نے پہلے ایک عورت کو اتار کر اس کی تلاش لی۔ جب کہ مردکی تلاشی اے ایس آئی نے لی عورت کے پرس میں میک اپ کا کچھ سامان، ایک دو کارڈ اور ایک قلم تھا عورت کے جوڑے سے ایک چھوٹا پستول ملا اب سب کو یقین ہو گیا یہ وہی گاڑی ہے جس کی اطلاع تھی اس عورت کو دو مرد اہلکار کی نگرانی میں کھڑا کیا اور لیڈی اہلکار نے لڑکی کو اتارا اس کی تلاشی لی اس کے کپڑے کی اندرونی جیب سے پستول ملا البتہ آدمی کے پاس سے کوئی قابل اعتراض چیز نہ ملی۔ بیک سیٹ کے پیچھے ایک گفٹ باکس تھا۔ اس کو کھولا گیا تو دو خوبصورت ٹیبل لیمپ نکلے بظاہر یوں لگتا تھا جیسے واقعی وہ صحیح کہہ رہے ہوں۔ شادی میں ہی جا رہے ہوں عورت بار بار کہے جا رہی تھی کہ ہم نے اپنی حفاظت کے لیے پستول رکھا ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے۔'' ابھی ہم اطلاع پر مشکوک ہو رہے ہے کہ اے ایس آئی نے لیمپ زمین پر گرا دیا اسٹیل کا لیمپ زور دار آواز سے سڑک پر گرا، بلب ٹوٹا اور اوپر کا شیڈ والا حصہ ٹیڑھا ہوا مگر درمیان کی راڈ سے چرس کی پڑیاں نکلیں تو ہم دھک سے رہ گئے۔ دونوں لیمپ کی درمیانی راڈ میں چرس کی پڑیاں موجود تھیں

''گاڑی اچھی طرح تلاشی لو۔'' اے ایس آئی

گرجا ان پانچوں افراد کو ایک طرف کیا دروازے، بونٹ، ڈگی سب کھول دی گئی ڈیش بورڈ سیٹ کے نیچے تلاشی لی کچھ نہ ملا چھت کی چادر جو ہٹائی چرس کے لاتعداد پیکٹ ملے، اس کے علاوہ پچھلی سیٹ کے نیچے سے اسلحہ بھی برآمد ہوا ان پانچوں کو فوری گرفتار کیا گیا اور باقی سامان بھی قبضے میں لیا گیا۔ ان کو خاموشی سے تھانے منتقل کیا گیا۔ اس وقت میڈیا پروپگنڈا کرنے والا نہیں تھا اس لیے بات اتنی نہیں پھیلی، بعد از تفتیش معلوم ہوا میاں بیوی تو حقیقی تھے، اس آدمی کی جبکہ بچے پڑوسی کے اور یہ دونوں بے اولاد تھے۔ محلے کے بچوں کو اپنے ساتھ شادی میں لے جاتے اور شادی ہال کو لوٹا کرتے تھے۔ فیملی کے ساتھ تیار ہو کر اندر داخل ہوتے اور دونوں عورتیں اندر موجود عورتوں کے زیور اور پیسے تھیا لیتیں اس وقت موبائل کا زمانہ نہ تھا کہ فوراً مردوں کو اطلاع کی جاتی اور کوئی کارروائی ہوتی۔ گزشتہ تین برسوں سے ان کا یہ کاروبار تھا۔ اس کے علاوہ کالج میں ڈرگز کی لعنت پہنچانے اور غریب اور مجبور عورتوں کو اس کی لت لگانے کا مکروہ کام بھی انجام دیتے تھے۔ ان کے خلاف سخت کارروائی کی گئی۔ بچوں کو والدین کے حوالے کیا گیا ان تینوں کو جیل ہو گئی اس کے کچھ مہینوں کے بعد ہی میرا ویزا آ گیا جو میں نے کئی مہینے قبل اپلائی کیا تھا یوں میں اپنے بہتر مستقبل کے لیے جاب چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ مگر اب بھی کبھی پاکستان آنا ہوتا ہے تو اسنیپ چیکنگ دیکھ کر وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے۔

......☆☆☆......

وہ بلی کا بچہ......

صائمہ بشیر

جانور کی وفاداری سے جڑی ایک خاص حکایت

یہ واقعہ جو میرے ساتھ پیش آیا اِس کو تقریباً 30 سال بیت چکے ہیں لیکن آج بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

جب میری شادی ہوئی تو میرے میاں کی پوسٹنگ سیکشن 30 مجسٹریٹ کی حیثیت سے میانوالی ہوچکی تھی اور ظاہر ہے مجھے اپنے میاں کے ساتھ میانوالی جانا تھا۔ میانوالی کے بارے میں سنا تھا کہ بہت ہی دقیانوسی علاقہ ہے جہاں عورتیں گھروں سے بہت کم نکلتی ہیں۔ جہاں پر کوئی تفریح گاہ نہیں ہے۔ بہرحال میں نے اس کو زیادہ نہیں سوچا کیونکہ جہاں پر میاں صاحب نے رہنا تھا میں نے بھی وہیں جانا تھا۔

سو شادی کے ابتدائی مصروفیت کے دن گزار کر ہم لوگ میانوالی آ گئے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ جو سرکاری گھر ہمیں الاٹ ہوا ہے وہ ابھی زیرِ تعمیر ہے۔ جس کو ایک ماہ مزید لگ سکتا ہے اس کی وجہ سے ہم نے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں اپنی رہائش رکھی۔

ریسٹ ہاؤس میں ہمارے کمرے کے سامنے برآمدہ اور برآمدے کے سامنے چھوٹا سا لان تھا جہاں شام کے وقت میں اور میرے میاں بیٹھ کر چائے پیتے گپ شپ لگاتے۔ اِس طرح شام کا وقت کھلی آب و ہوا میں اچھا گزر جاتا۔

☆......☆......☆

ایک دن میں اکیلی لان میں بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی کہ میں نے بلی کے بچے کی میاؤں میاؤں سنی۔ اُٹھ کر چاروں طرف دیکھا تو ایک پودے کے قریب مجھے قریب المرگ بلی کا بچہ نظر آیا۔ میں نے اپنے ملازم کو آواز دے کر بلایا اور اُسے کہا کہ اِس بچے کو چمچے کے ساتھ دودھ پلاؤ۔ ملازم نے چمچ کے ساتھ اُسے تھوڑا تھوڑا کر کے دودھ پلایا، جیسے ہی تھوڑا سا دودھ اُس کے پیٹ میں گیا اُس نے آنکھیں کھول لیں اور کچھ دیر کے بعد اُس کی حالت کافی بہتر ہوگئی۔ اسی طرح میرا ملازم روزانہ اُس کو دودھ دے دیتا اور وہ آرام کے ساتھ پی لیتا۔ چند ہی دنوں میں بچہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا۔

ہم لوگ ڈیڑھ ماہ ریسٹ ہاؤس میں رہے اور وہ بلی کا بچہ ہمارے ساتھ مانوس ہوتا چلا گیا۔ میں جس وقت کمرے سے باہر نکلتی وہ بچہ میرے ساتھ ساتھ چلتا رہتا، جہاں بیٹھتی میرے پیروں کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ جب ہمارا گھر مکمل ہوگیا تو ہم اپنے سرکاری گھر میں شفٹ ہوگئے۔ ساتھ میں وہ بلی کا بچہ بھی ہمارے ساتھ ہی آ گیا۔

سرکاری گھر شہر کے اور روڈ نہر کے ساتھ ساتھ بنے

تھے۔ کوئی آٹھ دس گھر تھے جو سب مجسٹریٹس کی رہائش گاہ تھے۔ سارا علاقہ ریتیلا تھا شام ٹھنڈی ہو جاتی۔
گھر کی باؤنڈری وال زیادہ اونچی نہیں تھی اور اس علاقے میں سنا تھا کہ کافی سانپ بھی ہوتے ہیں۔ ایک شام میں اپنے گھر کے صحن میں کرسی پر بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ ساتھ ہی بلی کا بچہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں یہاں شفٹ ہوئے آٹھ ماہ ہو چکے تھے۔ اور بلی کا بچہ کافی بڑا ہو چکا تھا۔ میں رسالہ پڑھنے میں مگن تھی کہ اچانک بلی کے بچے نے چھلانگ لگائی اور میری کرسی کے پیچھے چلا گیا۔ میں ڈر کے اٹھ کھڑی ہوئی کرسی کے پیچھے دیکھا تو

بلی کے بچے کے منہ میں ایک فٹ لمبا سانپ تھا۔ یہ دیکھ کر میں اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ وہاں میں نے اپنے ملازم کو بلایا اور ساری بات بتائی۔ وہ جلدی جلدی باہر گیا اور آ کر بتایا کہ وہاں جو سانپ مرا پڑا ہے وہ بہت زہریلا سانپ تھا۔ میں نے اُس سے بلی کے بچے کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہاں بلی کا بچہ نہیں ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ جا کر دیکھو کہ وہ کہاں ہے۔ کافی دیر کے بعد وہ واپس آیا تو مجھے بتایا کہ بلی کا بچہ مر چکا ہے۔ سانپ اُس نے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔ جس کے بعد میں بھی باہر آ گئی میں نے دیکھا کہ

ہمارے چنبیلی کے پودے کے پیچھے بلی کا بچہ مرا پڑا ہے۔ یہ دیکھ کر دکھ کے مارے میں رونے لگ گئی۔ مجھے اس کا بہت ہی افسوس ہوا۔ میرا ملازم کہنے لگا کہ باجی اگر یہ سانپ آپ کو کاٹ لیتا تو موت یقینی تھی۔
’’بہرحال میں نے سنا تھا کہ بلی اپنے مالک کی وفادار نہیں ہوتی لیکن گھر کی وفادار ہوتی ہے۔ آج اس بلی کے بچے نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے مالک کا بھی وفادار تھا۔
بے شک اللہ نے موت کا ایک دن مقرر رکھا ہے اور وہ ہر حال میں آنا ہے۔ لیکن پھر بھی جب میں یہ سوچتی ہوں کہ کس طرح یہ بلی کا بچہ ہمیں ریسٹ ہاؤس میں ملا، پھر ہمارے پاس رہنے لگا اور آخر کار مجھے بچاتے ہوئے مر گیا۔
آج 30 سال گزر جانے کے بعد بھی جب میں یہ واقعہ سوچتی ہوں تو میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور سانپ کے تصور سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بلی کا بچہ صرف مجھے سانپ سے بچانے کے لیے آیا تھا۔ اب بھی میرے پاس ایک بلی ہے جسے میں بہت پیار سے رکھتی ہوں کیونکہ اللہ کی یہ مخلوق بھی آپ کے کسی نہ کسی کام آ سکتی ہے۔

☆☆......☆☆

شہر قائد سے پانچویں حکایت

کسی بھی چیز کو انسان اپنی فطرت کے مطابق محسوس کرتا ہے، ایک بہت منفرد حکایت

میں، ارم، یاسمین اور زہرا ہم چاروں سہیلیاں آج پھر شام کے وقت لیڈیز پارک میں جمع تھے۔ ارم تھرماس میں چائے بنا کر لائی تھی، میں نے بقرعید کے گوشت سے شامی کباب بنائے تھے، یاسمین کیک لائی تھی اور زہرا کچھ لا نہیں سکی تھی کیونکہ اس کے آنے کا بھی ارادہ نہیں تھا لیکن ہم نے فون کر کے اس کو زبردستی بلا لیا تھا کہ آجاؤ بس تم آجاؤ!! گیدرنگ بہتر ہو جائے گی۔'' سو وہ آگئی۔ ہم سے اپنی اپنی باتیں Share کر رہے تھے۔

ارم اپنے بچوں کی پڑھائی کی، Test اور Exames میں مصروفیت کی باتیں کرتی رہی۔ یاسمین نے بقرعید کے بعد شادیوں کا بھرپور تذکرہ کیا۔ زہرا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا ہم نے اُسے زیادہ نہیں چھیڑا۔ میں نے اپنی آج کی بات Share کی کہ...... سردیوں کی آمد اور سردی سے بچنے کے انتظامات''

آج Sunday تھا میں نے سوچا کہ بیرونی داخلے والے دروازے سے سرد ہوا بہت تیز آتی ہے۔ امی کا کمرہ سامنے ہے ان کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے چلو اس سے بچنے کا کچھ انتظام کرتے ہیں امی سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ پردہ لگا لیکن! پردہ اور بیرونی دروازہ جس سے گھر کے اندر آتے ہیں...... یعنی Main Gate کے بعد والا دروازہ...... میں نے سوچا اگر اس پر پردہ لٹکا دیا جائے تو ہر وقت آتے اور جاتے پردہ ہٹانا اور برابر کرنا زرا مشکل کام ہے۔ پھر کبھی کبھی یہ دروازہ بھی تیز ہوا سے Stopper کے باوجود دھڑام سے بند ہو جاتا ہے۔ پھر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ کیوں نہ اس دروازہ کے جالی والے گیٹ پر کوئی کپڑا لگا دیں۔ اب جناب یہ خیال آتے ہی کپڑا ڈھونڈنے لگے اب اچانک گھر میں اتنا بڑا کوئی کپڑا؟؟ پرانے کپڑوں سے خوش رنگ دوپٹوں کو بھی نکالا...... لیکن ذہن نے قبول نہ کیا آخر کار کپڑوں کی تہہ میں سے کبھی خریدا ہوا ایک خوبصورت Table fiber cloth مل گیا، جس پر پیاک تصویر بنی تھی۔ ہم نے اُس کو Net پر اچھی طرح لگا دیا جو دیکھنے میں بھی خوشنما لگنے لگا اور ہوا بھی رُک گئی۔

امی آئیں...... Net سے چھن کر اندر آتی روشنی کو دیکھ کر انہوں نے کہا...... ارے واہ!! پردے پر بلب بنا ہوا ہے اچھا لگ رہا ہے......

میں نے کہا! نہیں امی اس پر پیراشوٹ بنا ہے۔''

ابو آئے انہوں نے کہا'' یہ غبارہ ہے۔'' امی نے کہا یہ تو وہی بات ہوئی کہ......

''ایک درخت پر چڑیا بیٹھی چوں! چوں!! کر رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ چند لوگ درخت کے نیچے چار پائی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سامنے چائے والے کا ہوٹل تھا۔ عجب گہما گہمی تھی...... ادھر سے ایک سبزی والے کا گزار ہوا، وہ ٹھیلے پر سبزیاں بیچ رہا تھا اُس نے چڑیا کی آواز سنی تو کہا چڑیا کہہ رہی ہے ''لہسن، پیاز، ادرک، !!لہسن، پیاز ادرک!!''

تھوڑی دیر بعد ایک چرخا کاتنے والے کا گزر ہوا تو اس نے کہا چڑیا کہہ رہی ہے......

چرخا پٹنی چمرخ!!!

چرخا پٹنی چمرخ!!!

پھر ایک روئی دھنے والا گزرا تو چڑیا کی آواز سن کر...... اُس نے کہا چڑیا بول رہی ہے......

''دھنا دھن دھنک!!

دھنا دھن دھنک!!''

لوگ درخت کے نیچے بیٹھے سب کی باتیں سن رہے تھے...... کہ محلے کے مولوی صاحب بھی درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے رُک گئے۔ چڑیا کی آواز سنی اور کہا...... سبحان اللہ!! چڑیا کہہ رہی ہے......

الم نشرح لک صدرک......

''سب لوگ گزرتے لوگوں کی باتیں سن رہے تھے بالآخر انہوں نے کہا کہ...... ہر شخص اپنے طور کسی آواز کو سنتا ہے اور اپنی ہی سمجھ کے مطابق اُس کو سمجھتا ہے۔''

اور واقعی!! یہ حقیقت ہے کہ ایک ہی واقعہ یا ایک ہی بات کو ہر شخص اپنے Perception میں محسوس کر کے سمجھتا ہے۔

جب میں نے یہ بات اپنی سہیلیوں سے Share کی تو انہوں نے بھی تائید کی کہ واقعی ایسا ہی ہے۔ شام کے بعد رات زیادہ ہو رہی تھی۔ زہرا بے چین نظر آ رہی تھی۔ لہٰذا ہم سہیلیوں نے بھی واپسی کا فیصلہ کیا اور اگلے Sunday کو جمع ہونے کا اردادہ کر کے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

آپ کے خیال میں زہرا کیوں خاموش تھی کیا واقعی اس کی طبیعت خراب تھی؟؟

......☆☆☆

کوئٹہ سے چھٹی حکایت

فنی پرواز

بکری سے شیر بننے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے

کوئٹہ کے سول اسپتال میں دوائیوں کے اسٹور کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی نسخہ لے کر دوائیاں لینے آیا تھا لیکن دوائیاں اسٹور میں تھیں جس کی کھڑکی تک پہنچنا ضروری تھا اور یوں لگتا تھا کہ آج وہاں تک پہنچنا آسان نہیں کیوں کہ لوگ ترتیب سے نہیں بلکہ بے ترتیبی سے جمع ہو کر اسٹور کی کھڑکی تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی پوری طاقت آزما رہا تھا۔ ہر کسی کی کوشش یہی تھی کہ جلد از جلد اور تمام لوگوں سے پہلے کھڑکی تک پہنچے۔ اس مقصد کے لیے ہر کوئی اپنے ہاتھ، پاؤں، کان اور منہ بیک وقت استعمال کر رہا تھا اور اپنے آس پاس کھڑے ہونے والے لوگوں سے بلکہ اپنے سے آگے کھڑے ہوئے لوگوں سے بھی آگے نکل جانا چاہتا تھا لیکن ہر کوئی اپنی طاقت، تجربات اور کوششوں کے مطابق ہی آگے بڑھ رہا تھا یا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ طاقت ور خاموشی، ہمت اور اطمینان سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے جبکہ کمزور پیچھے ہٹ رہے تھے یا لوگوں کے چھوٹے سے حلقے میں پھنس کر رہ گئے تھے اور پے در پے دھکے کھا رہے تھے جس کی بنا پر اگر ایک طرف اپنی کمزوری پر پیچ و تاب کھا رہے تھے تو دوسری طرف اپنے سے زیادہ طاقت ور لوگوں پر غصہ کھا رہے تھے اور بڑبڑا بڑبڑا کر اپنے اپنے غصے کا اظہار بھی کر رہے تھے۔

''کیا مصیبت ہے، صبح سے آیا ہوں اور مسلسل آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر ابھی تک یہ بدبخت کھڑکی آنے کا نام تک نہیں لیتی؟''

''کیا انسان اسی طرح ہوتے ہیں؟ یہ تو حیوان ہیں بلکہ درندے ہیں، درندے......''

''کوئی انتظام ہی نہیں، لوگوں میں کوئی ترتیب نہیں، آج یہ کم بخت سپاہیوں کو نجانے کیا ہو گیا ہے جو بالکل غائب ہیں؟''

اپریل کا آغاز تھا۔ کوئٹہ میں اپریل کے اختتام تک تھوڑی بہت سردی باقی رہتی ہے۔ دو تین پہلے بارش برسنے کی وجہ سے زمین ابھی تک پوری طرح خشک نہیں ہوئی تھی اور اس صبح تو ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی جس سے سردی میں کچھ اضافہ ہوا تھا لیکن مسلسل دھکم پیل کے باعث سارے لوگ پسینے سے شرابور ہو چکے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے کوٹوں، واسکٹوں اور قمیصوں اور دوسرے کپڑوں کو بھی ڈھیلا کر لیتے تھے اور کبھی کس لیتے تھے۔

میری طبیعت بھی کچھ ناساز تھی۔ میں بھی ڈاکٹر عظیم سے ایک نسخہ لے کر دوائیں لینے آیا تھا لیکن جب یہ منظر دیکھا تو پاؤں آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوئے، سو اس ارادے سے کھڑا رہا کہ ہجوم کچھ گھٹ جائے تو پھر دیکھا جائے گا۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے اتنی دیر لگ گئی تھی کہ اب چاہیے تو یہ تھا کہ میں تھک ہار کر اپنی راہ لیتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر بات صرف دوائیوں تک محدود ہوتی تو میں

یقیناً بہت ہی پہلے بے زار ہو کر جا چکا ہوتا مگر شاید مجھے یہ منظر بہت ہی اچھا لگ رہا تھا اس لیے میں ابھی تک کھڑے ہو کر نہایت دلچسپی سے اس کا نظارہ کر رہا تھا۔

یوں تو ان لوگوں میں سے ہر کوئی اس دلچسپ منظر کا ایک جزو لاینفک تھا۔ میری توجہ باری باری ہر ایک کی جانب مبذول ہو رہی تھی لیکن منظر کا سب سے دلچسپ کردار وہ گورا چٹا نوجوان تھا جو سات آٹھ دفعہ کھڑکی کے قریب سے دھکے دے کر پیچھے ہٹا دیا گیا تھا۔ ان ہی دھکوں کی وجہ سے دو تین دفعہ تو اتنا لڑکھڑا چکا تھا کہ گر کر کچل جانے سے بال بال بچا تھا اور مسلسل ناکامیوں کے غموں میں نڈھال ہو کر اب اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔

''لعنت ہو ایسی دوائیوں پر۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ میں دوائیاں لیے بغیر ہی چلا جاؤں۔ اتنے دھکے کھانے' لڑکھڑانے اور گرنے اور سنبھلنے سے تو آدمی کی جان ہی نکل جاتی ہے۔''

اب وہ دھکے کھانے' لڑکھڑانے اور گرنے سے سنبھلنے کے چکروں سے اتنا دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ غالباً بار بار باہر کی طرف جھانک کر دیکھتا تھا۔ میرے خیال میں اب وہ بھاگنے کے لیے راستہ تلاش کر رہا تھا۔

یہ منظر اسی مرحلے تک پہنچا تھا کہ یکا یک ایک لڑکی اپنے ہاتھ میں ایک نسخہ لیے ہوئے ہجوم کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ ویسے تو اس نے برقع پہن رکھا تھا مگر برقعے کا اگلا حصہ اٹھا کر سر پر ڈالا ہوا تھا جس سے اس کا چہرہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ عام سی شکل و صورت تھی اس کی البتہ جوان ضرور تھی۔ ہجوم کے پاس رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ لوگوں کی طرف بڑھا کر کہا۔

''کوئی مہربانی کر کے میری یہ دوائیاں تو لے کر دے دے۔''

اس کی بات یا ہاتھ بڑھانے سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی توجہ کس طرف تھی لیکن میں نے اچھی طرح سے دیکھا کہ وہ نسخہ پکڑنے کے لیے بڑھنے والا ہاتھ اسی نوجوان کا تھا جو اب تک کم و بیش سات آٹھ دفعہ پیچھے ہٹا دیا گیا تھا اور دو تین دفعہ نیچے گر کر کچل جانے سے بال بال بچا تھا۔

لڑکی کا نسخہ لینے کے بعد نوجوان نے پہلے پہل تو نظریں اٹھا کر چاروں طرف گھور گھور کر دیکھا جیسے ابھی ابھی سو کر اٹھا ہو اور اپنے اردگرد لوگوں کو پہلی بار دیکھ رہا ہو اور اس کے بعد یہ منظر اپنے نقطۂ عروج اور حسین ترین مرحلے تک جا پہنچا۔ وہ نوجوان شیرِ نر کی طرح اکڑ گیا اور اپنے دائیں بائیں اور سامنے کھڑے ہونے والوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا اور اپنے لیے راستہ بناتا ہوا آنِ واحد میں کھڑکی کے سامنے جا پہنچا اور دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے دونوں کناروں کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا پھر دوائیاں لے کر اسی مردانگی کے ساتھ لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا اور اپنے لیے راستہ بناتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اپنی دوائیاں تھیں اور دوسرے ہاتھ میں لڑکی کی دوائیاں۔

وہاں موجود تمام لوگ تھوڑی دیر کے لیے اپنی ساری پریشانی' اپنے سب کام کو بھلا کر حیرت سے اس نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے اور میں اس لڑکی کو جس نے آنِ واحد میں ایک بکری کو شیر بنا دیا تھا۔

......☆☆☆......

بڑا آدمی

روشانے عبدالقیوم

بھلا دہشت گرد کسی معصوم کو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنتے دیکھ سکتے ہیں مگر......

''دنیا میں سب سے زیادہ محبت کس سے کرتے ہو؟ اُن میں سے بڑی مونچھوں والے نے اس سے پوچھا۔

اپنی ماں سے۔''اس نے سوچے بغیر فٹ سے جواب دیا۔''

''اور پھر؟'' سوال کرنے والا دوسرا تھا۔

پھر اپنے گھر والوں سے اور ان کے بعد تمام انسانیت سے۔ میری ماں ایک حدیث کا مفہوم کہتی ہیں، جو کوئی خالص اللہ کے لیے اُس کے بندوں سے محبت رکھے، اللہ اُسے اپنے خاص بندوں میں شامل کر لیتے ہیں۔''

اُس کی بات پر تینوں آدمیوں کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔

کافی اچھی باتیں کرتے ہو۔'' ایک نے اُس کی تعریف کی وہ کچھ نہ بولا۔

داؤد گل داد بارہ سال کا بچہ جو بے حد ذہین اور خوبصورت تھا۔ یہ آدمی پچھلے چار مہینے سے اسکول کی چھٹی ہونے پر اُسے گیٹ سے باہر ملنے لگے تھے۔

داؤد شمالی علاقہ جات کے ایک پسماندہ گاؤں سے والدین کے ساتھ شہر پڑھنے آیا تھا، ماں باپ اُسے پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔

''داؤد، ہم پچھلے کئی مہینوں سے مل رہے ہیں، اب وقت آپہنچا ہے کہ ہم، تم سے وہ کام کروائیں جس کے لیے اتنے بچوں میں سے تمہیں چُنا۔'' بڑے مونچھوں والے نے پیار سے نرمی بھرے لہجے میں کہتے اُس کے سنہری بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''وہ کام کل ہی کرنا ہوگا۔'' وہ مزید بولا۔

کیا کام؟ داؤد نے نیلی آنکھیں اُس کے مونچھوں پر گاڑ دیں۔

کل ہم تمہیں ایک جیکٹ پہنائیں گے، جس کا بٹن ہمارے ہاتھ کے ریموٹ میں ہوگا، جیسے ہی وہ بٹن دبے گا تم سمیت مارکیٹ میں موجود لوگ جنت میں چلے جاؤ گے۔ وہ سرگوشی والے لہجے میں منہ اُس کے کان کے قریب لا کر بولا تھا۔

''مگر میری ماں اور ہماری مِس تو کہتی ہیں، جس طرح زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اسی طرح جنت اور دوزخ میں بھیجنے کا اختیار بھی صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تو کیا وہ بٹن دبانے سے تمام لوگ مرجائیں گے؟ کیونکہ موت کے بعد ہی انسان جنت اور دوزخ میں جا سکتا ہے۔''

وہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولا۔
''کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے کہہ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور بیگ کندھے پر ڈالا۔
''کہاں چلے؟'' ایک نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر دوبارہ اپنے پاس بٹھایا۔
کوئی چالاکی نہیں چلے گی، جو ہم نے کہا ہے تمہیں وہی کرنا ہے۔ اگر کسی سے کچھ بھی کہا تو تمہاری ماں اور باقی گھر والوں کو جان سے ماردیں گے۔ سمجھے تم؟'' وہ طیش میں آکر غرایا۔
''میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔'' وہ اس کے غصے سے خائف ہوا تھا مگر اُس پر اپنا خوف عیاں نہیں ہونے دیا۔
''ٹھیک ہے، اب تم جاؤ۔ تمہاری ہی ماں تمہارا انتظار کررہی ہوگی۔ اُن میں سے ایک بولا اور سارے اپنی جگہ سے اُٹھے۔
داؤد بھی اپنی جگہ سے اُٹھا تھا۔

......☆☆☆......

''تمہاری پڑھائی کیسے جارہی ہے؟'' وہ داؤد کے منہ میں نوالہ دیتے محبت سے بولیں۔
''بہت اچھی۔'' وہ غائب دماغی سے سر ہلاتے مسکرایا تھا۔
''شاباش میرے بیٹے! تم نے دل لگا کر پڑھنا ہے۔ جانتے ہو نا تمہارے بابا کو مزدوری کتنی کم ملتی ہے۔ اوپر سے تین جوان بہنوں کی ذمہ داری...... ان سب کی شادیاں تم نے کروانی ہیں۔ ایک ہی بھائی ہو تم ان کے، یہ ساری بیاہ کر اپنے گھر چلی جائیں گی تو تم ہی ہمارے بڑھاپے کا واحد سہارا بنو گے۔ تمہارے سوا ہمارا اس دنیا میں اور ہے ہی کون، بیٹیاں تو پرائی چیز ہوتی ہیں۔ ہماری اصل پونجی تو تم ہو۔'' وہ شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آبدیدہ ہوئیں تھی۔
اس نے اپنی بڑی بہنوں کو دیکھا۔ ایک سلائی مشین پر جھکی محلے والوں کی قمیض سی رہی تھی۔ دوسری بہن کچن میں کھڑی روٹیاں بنارہی تھی، تیسری بہن اُس کے موزے اور اسکول یونیفارم دھورہی تھی۔
''میری باجیاں کتنی اچھی ہے۔ میرا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ اتنا سارا کام کر کے بھی کبھی ماتھے پر ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں اُبھرتی، اور آج تک میں نے ان کو کیا دیا ہے؟ کچھ بھی نہیں...... ماں ٹھیک کہتی ہیں۔ ان کی شادیاں میں کرواؤں گا دھوم دھام سے۔ ان کے مرجھائے چہروں پر گلاب کی مانند ہنسی پھوٹنے کا سبب بھی میں بنوں گا۔ وہ دیر تک ایسی باتیں سوچتا رہا۔

......☆☆☆......

اُسے جیکٹ پہنا کر وہ لوگ جن کی تعداد چار تھی،

مارکیٹ سے دور ایک درخت کے پیچھے کھڑے تھے۔ ان کی عقابی نظریں داؤد پر جمی تھیں۔ انہوں نے اسے پہلے ہی ہدایات دے دی تھی کہ جیسے ہی وہ اشارہ کریں گے تو داؤد کو مارکیٹ کی گہما گہمی تک پہنچنا ہوگا۔ وہ مڑ کر اپنے راستے چلے گئے۔ پانچ منٹ کے بعد ان کے ہاتھ ریموٹ کا بٹن دبا دیں گا۔

واقعی کچھ ہی دیر میں مونچھوں والے نے اُسے آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔ وہ آگے بڑھا۔

''ماں!!!'' بڑی سی چادر میں خود کو چھپائے پورے ہفتے کا سودا سلف لیے وہ یقیناً اُس کی ماں ہی تھی۔

خوف سے اُس نے جھرجھری لی۔

وہ مڑا اور چاروں کو چلتے دیکھا جن کی داؤد کی سمت پشت تھی اور وہ بے خبر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ پانچ منٹ میں سے تین منٹ گزر گئے ٹھیک دو منٹ بعد یہ لوگ بٹن دبا دیں گے.....!

اُس نے خوف سے سفید پڑتے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ یہی فیصلے کا لمحہ تھا۔ داؤد نے جیکٹ اُتار کر پوری قوت سے اُن چاروں کی سمت پھینکی تھی۔ کبھی کبھار بے خبری میں بھی انسان بے موت مارا جاتا ہے۔ کسی اور کی موت کسی دوسرے شخص کو جھپٹ لیتی ہے۔ وہ چاروں باتیں کرتے، قہقہے لگاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ بڑی مونچھوں والے نے بٹن دبایا۔

جیکٹ جو اُن کے سروں پر معلق تھی ایک زوردار دھماکے سے پھٹ پڑی۔ دھواں.....آگ.....چیخیں.....بھاگنے کی آوازیں ایک قیامت کا منظر تھا۔

کئی لوگوں پر دن میں کئی دفعہ قیامت آ کر گزر جاتی ہے۔ اور ہم بے خبر انسان اب بھی قیامت کے منتظر ہیں۔

یہ ہولناک منظر جو داؤد کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہاں چلتے چار لمبے چوڑے بندوں کا اب نام ونشان تک نہ تھا۔ لوگ خوف سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

میری ماں، میری جنت ہے..... مجھے کسی اور جنت کی تلاش نہیں۔ تمہاری موت ہی میری دھرتی کی نجات تھی۔

تم جیسے لوگوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس کر اُس کا شکار بن گئے۔ نفرت ہے مجھے تم سے.....اور تمہارے جیسے سب گندے لوگوں سے.....جن کا کام آگ لگا کر موت کا کھیل کھیلنا اور اُس کا نظارہ کرنا ہے۔' وہ پوری قوت سے چیختا۔ آگ کے شعلوں اور دھوئیں سے مخاطب تھا۔ لوگ رُک رُک کر اپنا خوف بھلائے اُس بچے کو چلاتا دیکھنے لگے تھے۔

☆☆☆

ایک چھوٹے سے بارہ سالہ بچے نے غیور پاکستانی اور قوم کے ہیرو جیسے لقب پا لیے تھے۔ نیوز چینل کی بھرمار تھی جو بار بار یہی بریکنگ نیوز نشر کر رہی تھی۔

بڑے بڑے لیڈر اور سیاستدان داؤد گل کے کارنامے پر حیرت اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ پورے محلے میں ایک ہاہا کار مچی تھی۔ ساری خواتین نیوز چینل دیکھ کر اُن کے گھر کی طرف دوڑتے چلیں آ رہے تھے۔

چار دہشت گردوں کو ایسی ذہانت سے مار دینا ایک چھوٹے بچے کے لیے کتنا کٹھن کام تھا۔ جو بارہ سالہ اُس داؤد گل دادنامی بہادر بچے نے سر انجام دیا تھا۔

اُس کی بہنوں اور اُس کے باپ کے چہروں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہو پا رہی تھی۔ مگر اُس کی ماں سجدے میں گری اپنے رب کی شکرگزار ہونے کے ساتھ ساتھ خوفزدہ بھی تھی۔ اگر داؤد کو کچھ ہو جاتا تو.....اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھیں۔

تمام لوگوں کی آنکھوں پر اس وقتی کارنامے نے پردے ڈال رکھے تھے مگر وہ ماں تھیں اُن کو چھٹی حس خبردار کر رہی تھیں۔

مجھے اپنے بیٹے کو بڑا آدمی نہیں بنانا۔ میں آج ہی یہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ مجھے اپنے بیٹے کو اُن بھیڑیوں کے حوالے نہیں کرنا۔ چار مر گئے باقی تو زندہ ہیں..... مجھے اپنے اکلوتے بیٹے کو شہر میں تعلیم نہیں دلوانی۔ میں اسے لے جا کر گاؤں کے پسماندہ اسکول میں داخل کروا دوں گی.....اسے بڑا آدمی بننا ہوا تو وہیں سے پڑھ کر بھی بن جائے گا۔ اُن کے خوف سے بہتے آنسو کسی طور کم نہیں ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ایک تصویر، ایک کہانی

کُتّے اتنے بھی کُتّے نہیں

قارئین زیرِ نظر تصویر انسانی بے حسی اور حیوانی محبت کی منہ بولتی کہانی ہے۔ تصویر میں دکھائی دینے والا بچہ اس وقت سعودی عرب کیا ایک ہاسپٹل کی نرسری میں مکمل طور پر صحت مند ہو کر سانسیں لے رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس معصوم کی یہ سانسیں، ایک کتے کی مرہونِ منت ہیں۔ اگر یہ کتا کچرے کے ڈھیر سے اس بچے کو اٹھا کر نا لے آتا تو......

محبت اور نفرت کی دھیمی دھیمی آنچ میں لودیتی ہوئی شعلہ ساماں تحریریں

اُس سنگین روایت کا بیان، جس کے سنگریزے آج بھی جابجا بکھرے پڑے ہیں

جی خدا کے لیے جی مجھے تم اپنے قدموں سے جُدا نہ کرنا۔ ورنہ تو میں مرجاؤں گی جی۔'' ریشماں مراد کے قدموں میں جھکی اُس کے پیروں کو آنسوؤں سے دھوتے ہوئے گڑگڑا رہی تھی اور مراد حیران و پریشان سا کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح وہ روتی بلکتی ریشماں کو چپ کرائے۔

''جی ...... خدا کے لیے۔ کچھ تو بولو۔ اگر تم نے مجھے خود سے علیحدہ کیا تو میں کنویں میں چھلانگ لگا دُوں گی جی ...... میں تم بن نہیں رہ سکتی ......'' اب ریشماں کی چیخیں تیز ہوگئی تھیں۔ مراد کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ریشماں کی چیخیں اُس کا دل ادھیڑ رہی تھیں۔ مگر وہ بہت مجبور تھا۔ بلکہ اُسے مجبور کردیا گیا تھا۔

کہ وہ اپنی پیاری بیوی ریشماں کو چھوڑ دے۔

اُس کو تین حروف کہہ کر اٹوٹ رشتے کو ایک جھٹکے سے توڑ ڈالے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود سے علیحدہ کردے۔ اُس کی خدمتوں سے منحرف ہوجائے۔

اُس کی محبتوں کو پامال کردے۔ اُس کے ساتھ گزارے ہوئے خوبصورت لمحات بھول جائے۔

''جی ...... کچھ تو بولو۔'' ریشماں نے اُس کے پیروں پر ہاتھ رکھے رکھے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

ریشماں کی آنکھوں کے سرخ دوڑے نے مراد کے دل میں ہلچل مچادی۔

اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ گال ہلدی کی طرح زرد تھے۔ سیاہ گھنیرے بال بکھر گئے تھے۔ آنکھیں متورّم تھیں۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں مراد کے جی میں آیا وہ ان خوبصورت بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے ریشماں کے کان میں کوئی خوبصورت سا جملہ کہہ کر اُس کے گالوں کی زردیوں کو گلابیوں میں بدل دے۔ مگر پھر اچانک اُسے پنچایت کا فیصلہ یاد آگیا۔

''تم ریشماں کو طلاق دے دو، جس طرح اُس کے بھائی فضل نے تمہاری بہن شادو کو طلاق کے ٹیکے نوازا ہے، تم فضل کی بہن کی پیشانی پر بھی وہی داغ لگادو، کیونکہ وٹے سٹے میں یہی ہوتا ہے۔ اگر تم یہ نہیں کروگے تو پنچایت کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ تم دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیحدہ کردے۔''

’’جی......جی تم میری موت اور زندگی کا فیصلہ سُنا دو۔ میں لمحے لمحے کی موت مر رہی ہوں ایک ہی مرتبہ میرا گلا گھونٹ دو جی۔‘‘ ریشماں نے مراد کے گھٹنے سے سر رگڑتے ہوئے کہا۔

’’سُنو ریشماں......‘‘ مراد کے لب کپکپائے۔ اُس نے جھک کر ریشماں کو دونوں بازوؤں سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کیا۔

’’جی......‘‘ وہ سسکی۔ ’’تم تو مجھے ریشم کہتے تھے اتنی جلدی۔‘‘ وہ جملہ بھی مکمل نہ کر پائی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رو دی۔

’’تم یہ دیکھو فضل نے کیا کیا ہے؟ ہمارے خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ برسوں سے وٹے سٹے کی رسم چلی آ رہی ہے۔ مگر آج تک طلاق نہیں ہوئی اور تمہارے بھائی نے شادو کو طلاق دے دی ہے آخر کیوں؟‘‘ مراد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔

’’اُس کے جرم کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہو؟‘‘ وہ منمنائی۔

’’تمہارے بھائی نے کون سے جرم کی سزا شادو کو دی۔‘‘

’’تم خود پوچھ لو اُس سے، مجھے کیا خبر؟‘‘ ریشماں نے معصومیت سے کہا۔

’’پنچایت نے پوچھا تھا اُس سے مگر وہ کچھ بولا ہی نہیں۔‘‘ مراد مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

’’جی ......پھر میرا کیا قصور......‘‘ ریشماں کے گالوں پر آنسو تواتر سے بہہ نکلے۔

’’تم بھگتو......‘‘ مراد ایک دم سنگدل بن گیا۔

’’جی تم پڑھے لکھے ہو......‘‘ ریشماں نے یاد دلایا کہ تعلیم تو آگہی دیتی ہے، شعور دیتی ہے۔

’’تعلیم حاصل کر کے انسان اپنی رسموں رواجوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ میں نے یہیں رہنا ہے۔ اپنے رواجوں کو میں کیسے بھول جاؤں......جی ہم کہیں اور چلے جاتے ہیں پھر جی......‘‘ ریشماں نے راہ دکھائی۔

’’نہیں میں تمہیں کہیں نہیں لے جا سکتا‘‘

میں تمہاری بیوی ہوں جی..... کوئی تم مجھے بھگا کر تو نہیں لے جا رہے نا؟ ریشماں نے اُسے جھنجوڑ ڈالا۔

''کچھ بھی ہو...''

''جی..... پھر ریشماں کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دو۔ میرے جسم کو تم نے چُھوا ہے۔ اِس کے بعد کوئی مرد نہیں چُھو سکے گا۔ اِس دل پر تمہارا نام لکھا ہے اُسے میں نہیں کھرچ سکتی۔ گھونٹ دو میرا گلا..... مگر طلاق کا شعلہ میری طرف نہ پھینکنا۔ میں راکھ ہو جاؤں گی۔ میری آرزو یہی رہی ہے کہ تم مجھے قبر میں اتار دو۔ جی تم گھونٹ دو میرا گلا ریشماں اُس کے سینے پر مکّے مارتے ہوئے بولی۔ اور پھر روتے روتے مراد کے بازوؤں میں جھول گئی۔

مراد بالکل بھی نہ گھبرایا۔ اُسے پتا تھا کہ جو عورت اپنے مرد کو پُوجا کی حد تک چاہتی ہو وہ کبھی شوہر سے جُدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ جُدائی سے زیادہ وہ موت کو ترجیح دیتی ہے۔

مراد نے اُسے پلنگ پر لٹایا۔ اور پھر اُس کے قدموں پر جھک گیا۔

ریشم..... میری جان۔ میری روح۔

میں تجھے چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ یہ میں کبھی نہیں کر سکتا۔ تجھ سے جُدائی میں کبھی بھی گوارہ نہیں کر سکتا۔ عمر بھر کی جُدائی کبھی نہیں۔ ہاں کچھ عرصہ تجھ سے دُور رہوں گا۔ یہ ابدی جدائی نہیں ہوگی۔

اِس جُدائی کا عرصہ صرف چند برس ہوگا۔ تب تک فضل کی لگائی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو چکی ہوگی۔ پھر میں سب کے سامنے تمہیں لے جاؤں گا۔ بس جان صرف چند سال کے لیے۔

اُس کے لب کپکپاتے رہے اور آنکھوں سے بہتا پانی ریشم کے ریشم جیسے پاؤں دھوتا رہا۔ پھر وہ اٹھا اٹیچی میں چند جوڑے ڈالے۔ پھر پلنگ کے پاس آیا جس پر اُس کی بیوی..... اُس کی شریک سفر لیٹی تھی۔

چند لمحے اُسے تکتا رہا اور جھک کر پیشانی پر اپنے کپکپاتے ہونٹ رکھ دیے۔

پھر..... تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا..... اور وہ اِس اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

وہ صبح ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

وہ صبح..... جب پنچایت کے سامنے اُسے فیصلہ سنانا تھا..... اور فیصلہ ہر حال میں یہی ہونا تھا کہ ریشماں کو طلاق..... ریشماں سے ہمیشہ ہمیشہ کی جدائی۔ اور یہ کسی صورت اُسے گوارہ نہ تھا۔

......☆☆☆......

مراد کھوکر کا تعلق مظفر گڑھ سے تھا۔

ان کے خاندان میں برسوں سے رواج چلا آ رہا تھا کہ بچپن ہی میں منگنیاں کر دی جاتیں اور ادلے بدلے میں شادیاں ہوتیں جو کہ عموماً کامیاب رہتیں۔

مراد سات سال کا تھا جب ریشماں اُس کے ماموں سکندر کے ہاں پیدا ہوئی۔ تو ہاجرہ بیگم نے بھائی سے ریشماں کو مانگ لیا۔ اور ساتھ ہی پانچ سالہ فضل کے ساتھ مراد کی بہن شادو کو منسوب کر دیا گیا۔

مراد کو وہ گلابی گلابی ریشماں بہت پسند آئی۔ وہ اسکول سے آتے ہی ماما سکندر کے ہاں پہنچ جاتا اور گھنٹوں ریشماں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔

......☆☆☆......

وقت گزرتا رہا۔ اور گزرتے وقت نے محبت کے ننھے سے پودے کو تناور درخت میں تبدیل کر دیا۔ مراد لاہور میں پڑھتا رہا۔ جب وہ مظفر گڑھ آتا تو ریشماں اُسے منتظر ملتی۔ مراد بھی تو دن گن گن کر گزارتا تھا۔ اور ریشماں سے مل کر تو اپنی تمام کلفتوں کو بھول جاتا۔ ریشماں کے ساتھ وقت تو پر لگا کر اُڑ جاتا اور اُس کی چھٹیاں ختم ہو جاتیں اور وہ دل میں آئندہ ملنے کی آس لیے لاہور آ جاتا۔

ریشماں اُسے امام ضامن باندھتی۔ جب وہ

واپس جاتا امام ضامن باندھتی...... اور وہ نثار ہو جاتا اُس کی اتنی محبت پر، جب وہ کہتی۔

''جی جب تم ڈھیر سارا پڑھ کر یہاں آؤ گے تو میں تمہیں واپس نہ جانے دوں گی۔''

''یہ تم مجھے جی کیوں کہتی ہو......'' وہ کہتا ہے۔

''پھر کیا کہوں؟'' وہ نہایت معصومیت سے پوچھتی۔

''بھئی سیدھا نام ہے میرا مراد۔''

''مجھے شرم آتی ہے۔'' وہ سرخ ہو جاتی۔

اور مراد اُسے دیکھتا رہ جاتا۔

اتنی معصوم اور سیدھی سادھی لڑکی تو اُس نے کہیں بھی نہ دیکھی تھی۔ وہ خداوند قدوس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا کہ اُس نے اُس کے مستقبل کا ساتھی اتنا پیارا چنا ہے۔

اللہ میاں جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔

احساسِ تشکر سے مراد کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتیں۔ وہ اپنے رب کا جتنا شکر ادا کرتا کم تھا۔

مراد نے ایم، بی، بی ایس کیا تو فوراً دونوں طرف شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہاجرہ بیگم نے اُس کی ہاؤس جاب کا بھی انتظار نہ کیا۔

کیونکہ انہوں نے شادو کو تو دو سال قبل ہی بیاہ کر اپنا آنگن سُونا کر لیا تھا۔ اب وہ ریشماں کو لا کر اپنے سونے آنگن میں ریشماں کی جھانجروں کی آواز سننا چاہتی تھیں۔ اُس کی ہنسی...... اور اُس کے وجود سے اپنا گھر آباد کرنا چاہتی تھیں۔

مراد کی شادی ہو گئی...... وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ریشماں کو تو اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا محسوس ہوتا۔ مراد ہنی مون منانے اُسے مری، سوات لے گیا۔ اور یہ حسد کا پہلا بیج تھا جو کہ شادو کے دل میں بیجا گیا۔ کیونکہ فضل تو بالکل جاہل گنوار تھا...... جو کہ اپنی سُرمے سے بھری آنکھوں سے نت نئے محبت کے پوز اُس کی طرف پھینکتا رہتا اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یا پھر والدین کی نظر بچا کر آنکھ مار دیتا۔

شروع شروع میں اُسے یہ سب اچھا لگتا۔

مگر ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے کھاتے بھی تو دل اوب جاتا ہے۔ اسی طرح شادو کا دل بھی ایک ہی طرح کی محبت کا انداز پا کر مردہ ہو کر رہ گیا تھا آہستہ آہستہ وہ فضل سے دُور ہونے لگی۔ اُس کی محبت کا جواب بڑی سرد مہری سے دیتی۔ اور اُس کی وجہ بھی اور تھی۔

گاؤں میں بینک کی نئی شاخ کھلی تھی۔

جس کا منیجر بہت خوبصورت تھا...... نام اُس کا شاہرام تھا۔ اپنا بہت خیال رکھتا تھا وہ۔ نفاست سے بال سنوارتا، ٹیپ ٹاپ میں رہتا۔ صبح جب وہ اپنی موٹر سائیکل پر بینک آتا تو سر سبز کھیتوں میں کام کرتی ہوئی کتنی ہی عورتیں کام چھوڑ کر اُسے تکنے لگتیں، مگر اس کا دل اٹکا بھی شاداں پر۔

اُس روز شاداں بینک آئی کچھ رقم جمع کرانی تھی۔ فضل شہر گیا ہوا تھا۔ سکندر بابا نے اُسے پیسے دیئے تھے کیونکہ اُن کی طبیعت خراب تھی۔

بس ایک بار کا بینک آنا ہی غضب ہو گیا۔ بہت جلدی نظروں نے دل تک کا فاصلہ طے کر لیا پھر تو چوری چھپے ملاقاتیں بڑھنے لگیں...... اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ شاہرام نے شادو کی آنکھوں میں کتنے ہی سنہری خواب بن دیے۔ اُن خوابوں کی تعبیر کے لیے شادو بے قرار تھی۔ شہرام اُسے تحفے تحائف بھی دیا کرتا۔

فضل مرد تھا، وہ شادو کا بدلا بدلا رویہ دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔

اور پھر بہت جلد اُسے شادو کے اکھڑے اکھڑے رہنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ مگر اُس نے شادو سے کچھ نہ کہا۔

اُسے علم تھا کہ عشق بہت منہ زور گھوڑا ہوتا ہے جتنا اُسے روکا جائے یہ اتنی ہی تیز دوڑ لگاتا ہے۔

یونہی پورا ڈیڑھ برس بیت گیا۔ اور پھر ایک روز شاداں پھٹ پڑی۔

''فضل مجھے طلاق دے دو۔''

''کیوں؟'' فضل نے نہایت اطمینان سے پوچھا جیسے کہ یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

میں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ وہ بولی۔

''اب ساڑھے چار سال بعد تمہیں پتا چلا ہے۔'' فضل نے کہا۔

ہاں۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' فضل نے کڑے تیوروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ فضل میں گھٹ کر رہ گئی ہوں۔ یہاں میرا بچپن بھی اسی گاؤں میں گزرا اور جوانی بھی۔ مگر میں تبدیلی چاہتی ہوں۔ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں شہر۔ وہاں رہنا چاہتی ہوں۔ بچپن اور جوانی ایک جگہ نہیں گزارے جاسکتے۔''

تو وہ چونکی...... اور عجیب نظروں سے فضل کو دیکھنے لگی۔

''کیا ساتھی بھی تبدیل کرنا چاہتی ہو؟'' فضل نے اُس کے دل کی بات کہہ دی۔

''ہاں......'' شادو ایک طویل سانس لے کر بولی۔

''تمہیں پتا ہے کہ ہماری شادی وٹے سٹے میں ہوئی ہے......'' فضل نے یاد دلایا۔

''ہاں۔'' شادو نے کہا۔

''تمہارے بھائی کا گھر اُجڑ جائے گا۔''

''مجھے پروا نہیں اس دنیا میں ہر کوئی اپنے لیے زندہ رہتا ہے اور میں بھی اپنے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ تم اپنی بہن کی وجہ سے ایسا کر رہے ہو۔'' شادو گرجی۔

''نہیں......نہیں شادو یہ بات نہیں ہے۔ تم بابا اور پھوپھی میں دشمنی کی پہلی اینٹ رکھ رہی ہو......تم نہیں جانتیں کہ تمہارے اس اقدام سے دو بھائی بہن ایک دوسرے کی صورتوں سے نفرت کرنے لگیں گے۔''

''کرتے رہیں...... میں بس شہر میں رہوں گی......'' وہ اڑ گئی۔

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی کیونکہ جب عورت مرد کے پاس نہ رہنا چاہے تو مرد کو اُسے مجبور نہیں کرنا چاہیے......تم بعد میں ضرور پچھتاؤ گی۔ پچھتاوے کے دُکھ بہت بڑے ہوتے ہیں۔ گیا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا تم کتنی ہی آوازیں دو۔''

میں گزرے وقت کو کبھی آواز نہ دُوں گی۔ اِس وقت نے مجھے دیا ہی کیا ہے جو میں اِسے یاد رکھوں۔'' شادو نے منہ بنا کر اُس کی بات کاٹی۔

''یہ تم نہیں تمہارا عشق بول رہا ہے۔'' فضل دانت پیس کر بولا۔'' جاؤ چلی جاؤ میں نے تمہیں طلاق دی۔......طلاق دی......طلاق دی۔'' فضل چیخا اور کمرے سے نکل گیا۔

شادو حیران و ششدر رہ گئی اُسے امید نہیں تھی کہ فضل اتنی جلدی تین بول بول دے گا......اور وہ منٹوں میں ہی سہاگن سے طلاقن ہو جائے گی۔

اور پھر نہ جانے کیوں وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔

اپنے رونے کی اُسے وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

اور جب سہ پہر کو وہ اپنے میکے پہنچی تو ہاجرہ بیگم نے حیرت سے اُسے دیکھا وہ کبھی تو اتنی لُٹی ہوئی نہ آئی تھی۔ اور پھر اُس نے دھماکہ کر ہی دیا۔

''اماں فضل نے مجھے طلاق دے دی۔'' وہ ماں سے لپٹ گئی۔

سارا الزام فضل پر آیا۔

مراد بھی گھر آیا ہوا تھا۔ وہ سروس لاہور میں کرتا تھا مگر ہر پندرہ روز بعد ایک دو روز کے لیے آجایا کرتا تھا۔

ریشماں کے بغیر وہ رہ نہ سکتا تھا۔

حالانکہ وہ چاہتا تھا کہ ریشماں اُس کے ساتھ رہے مگر وہ اپنی پھوپھی کو اکیلا نہ چھوڑ سکتی تھی۔

اور مراد شوخی سے پوچھتا۔

''شادی تمہاری میرے ساتھ ہوئی ہے یا

اماں سے۔''
تو وہ شرما کر کہتی۔ ''اگر پھوپھی اماں نہ ہوتیں تو تم کہاں سے آتے۔ مجھ پر پہلا حق اُن کا ہے پھر تمہارا۔''
تو مراد اُس پر نثار ہو جاتا۔ اب بہن جو طلاق کا ٹیکہ ماتھے پر سجا کر آئی تھی تو مراد کا دل اُدھڑ کر رہ گیا۔
ریشماں کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ کر رہ گیا۔
اُس کی چھٹی حس اُسے باخبر کر رہی تھی۔
آنے والے وقت سے۔ جو کہ اُس کی ازدواجی زندگی میں انگارے بھرنے کے لیے آنے والا تھا۔ اُسے پتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔
شام کو پنچایت بیٹھی اور فیصلہ یہ سنایا کہ مراد بھی فضل کی بہن کو طلاق دے کر حساب برابر کر دے۔
اور جب لُٹا لُٹا سا مراد عشاء کے بعد گھر آیا تو ریشماں تو پہلے ہی رو رہی تھی۔ اُس نے مراد کے قدموں میں سر رکھ دیا کہ وہ اُسے خود سے جدا نہ کرے۔
اور مراد ایسا نکلا کہ اُسے بے ہوش چھوڑ کر گھر سے چلا گیا۔
......☆☆☆......
صبح جب ہاجرہ بیگم اُس کے کمرے میں آئیں تو وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اُس کی تو آنکھوں کے آنسو تک خشک ہو گئے تھے۔
ہاجرہ بیگم کتنی ہی دیر تک دروازے کے بیچ کھڑی اپنی بیٹیوں جیسی بہو کو دیکھے گئیں۔
وہ بھلا کیسے اِس پیاری سی لڑکی کو بھیج دیتیں واپس
کتنی چاہ سے وہ بیاہ کر لائی تھیں اُسے......
اور اب اپنی بیٹی کی کوتاہی کی سزا اُسے دیتیں......
یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔
فضل تو رات ہی سب کچھ انہیں بتا گیا تھا......شادو کے سامنے......اور گڑگڑا کر بولا تھا۔
''پھوپھی جی میری بہن کا گھر نہ اجاڑنا۔ تمہاری بیٹی نے خود اپنے گھر کو آگ لگائی ہے۔''
اور ہاجرہ بیگم جو بہت غصّے میں تھیں جب انہوں نے شادہ کی طرف دیکھا تو اُس نے سر جھکا لیا۔
جس کا مطلب تھا کہ فضل جو کچھ کہہ رہا ہے دُرست ہے۔ تب انہوں نے ایک طویل سانس کھینچا۔
''نہیں فضل تمہاری بہن یہیں رہے گی......میری بیٹی کی کمینگی کی سزا بہو کو نہیں ملے گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ پنچایت کچھ نہیں کرے گی......'' پھر وہ کتنی ہی دیر تک فضل کو یقین دلاتی رہیں کہ اُس کی بہن کو کوئی دُکھ نہیں ہوگا۔ یہاں جیسے وہ پہلے رہا کرتی تھی ویسے ہی رہے گی۔''
فضل کے جانے کے بعد جب وہ بہو کے کمرے کی طرف آئیں تو پہلے تو وہ جھجکیں مگر پھر اندر آگئیں۔ وہ سمجھیں کہ ریشماں سوئی ہوئی ہے۔ مراد شاید یہیں کہیں ہو......اور وہ پُرسکون سی ہو کر اپنے کمرے میں جا لیٹیں۔ نیند اُن کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔
اور کیوں نہ ہوتی۔
بیٹی خود کو اجاڑ کر آگئی تھی۔
وہ سوچ رہی تھیں کہ اب اِسے کون قبول کرے گا۔
مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ بیٹی نے اپنا سائبان ڈھونڈ لیا ہے۔
فضل نے انہیں شاہرام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف اتنا کہا تھا کہ یہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے جھوٹ پر جھوٹ بولے تھے مگر کہیں بھی یہ نہ کہہ سکا کہ پھوپھی آپ کی بیٹی شہر کے خواب دیکھ رہی ہے......وہ بھی شاہرام کے ساتھ......اُس کے ساتھ ایک نیا گھر بسانے کے۔
مگر نجانے فضل نے یہ سب کیوں نہ بتایا......شاید وہ پنچایت کے سامنے اپنے خاندان کی بدنامی نہیں چاہتا تھا۔ سب ہی ہنستے۔
کوئی یہ نہ دیکھتا کہ اُن کی ہنسی حساس دلوں میں کتنے زخم کر ڈالے گی۔ لوگوں کو تو بس ہنسنے سے کام ہوتا ہے......کسی کے دل کی حالت کیا جانیں۔

ہاجرہ بیگم دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی بہو کو دیکھے جارہی تھیں۔ پھر ریشماں بیٹھے بیٹھے ایک دم اٹھی اور اُن کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''پھوپی اماں میں اِس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ خدا کے لیے پھوپی اماں مجھے خود سے، مراد سے جدا نہ کریں ورنہ میں مرجاؤں گی۔'' وہ گڑگڑا رہی تھی۔

''تم یہیں رہوگی...... میرے پاس۔'' انہوں نے جھک کر ریشماں کو اٹھایا اور سینے سے لپٹا لیا۔

''تم کہیں نہیں جاؤ گی...... بہوئیں واپس بھیجنے کے لیے تو نہیں لائی جاتیں نا؟'' ہاجرہ بیگم ریشماں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے گئیں...... اور ریشماں نے پرسکون ہوکر ایک طویل سانس لی۔

اب اُسے کوئی ڈر نہ تھا۔ پھر اُسے مراد کا خیال آیا۔

''پھوپھی اماں وہ......''

''یہیں کہیں ہوگا۔'' انہوں نے نہایت اطمینان سے کہا۔ تم پُرسکون رہو۔ پریشان مت ہونا اچھا'' ہاجرہ بیگم نے اُس کے گال چومے اور چلی گئیں۔

صبح سے دوپہر ہوئی اور پھر شام کے کندھوں پر بھی رات جھکنے لگی۔ مگر مراد نہ آیا۔

ریشماں نے اُس کی اٹیچی دیکھی وہ غائب تھی۔

اور گزرتا ہوا ایک ایک پل اُسے بتا گیا کہ اُس کا شوہر چلا گیا ہے۔ اُس کی زندگی کا ساتھی اُسے چھوڑ گیا ہے۔ وہ منتظر ہی رہی اور وہ ایسا گیا کہ لوٹ کر نہ آیا۔

......☆☆☆......

وقت گزرتا رہا......

اپنے سامنے آتی ہر چیز کو روندتا ہوا...... بالکل سیلاب کے پانی کی طرح جو کہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ اُس کی زد میں کتنی لہلہاتی فصلیں آتی ہیں۔ کتنے مکانوں کو وہ ڈھا دیتا ہے...... بس اُسے تو آگے بڑھنے سے مطلب ہوتا ہے۔

شادو...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شاہرام کے ساتھ چلی گئی تھی۔ ہاجرہ بیگم نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ لوٹ کر یہاں نہ آئے۔ آج سے وہ اُن کے لیے مر چکی ہے...... اور پھر وہ واقعی لوٹ کر نہ آئی......

پورے گیارہ برس بیت گئے۔

ریشماں نے کبھی اپنے گھر کی دہلیز پار نہ کی۔ کیا خبر کبھی مراد لوٹ آئے...... وہ سوچتی مگر وہ تو ایسا گیا کہ جیسے اپنی ریشم کو جانتا ہی نہ تھا۔

اِس عرصے میں فضل نے کہاں کہاں نہ اپنی بہن کے سہاگ کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔

فضل تھک ہار کر بیٹھ گیا۔

وہ سوچتا...... ریشماں عورت ہے۔ شادہ بھی تو عورت ہے۔

ریشماں بھی اِسی زمین کی ہے۔ شادو بھی یہیں کی تھی......

پھر دونوں میں اِس قدر فرق کیوں ہے؟

اُف شادو تم نے کتنے لوگوں کو دُکھی کیا......

اللہ کرے تم بھی سکھی نہ رہو...... ہمیشہ تڑپتی رہو...... ریشماں اپنے مراد کا انتظار کرتی رہی......

ہاجرہ بیگم نے کئی مزاروں پر جا کر منتیں مانگیں۔ خدا کے حضور گڑگڑاتی رہیں مگر اُن کی دعائیں مستجاب نہ ہوئیں...... اور اُن کا بیٹا نہ لوٹا۔

تب ہی انہیں پتا چلا کہ ایک نئے بزرگ ساتھ والے گاؤں میں آئے ہیں اور وہ ہر جائز کام کے لیے ایسا تعویز دیتے ہیں کہ کام ہو جاتا ہے۔

ہاجرہ بیگم زبردستی ریشماں کو اُن کے پاس لے گئیں۔ وہ راستے بھر یہی کہتی رہی۔

''پھوپھی اماں اگر مراد آ گیا تو کیا کہے گا...... میں اُسے نہ ملی تو ناراض ہوگا۔''

مگر ہاجرہ بیگم نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ وہ تو دیوانی ہوگئی تھی اپنے ساجن کی جدائی میں۔ اُن بزرگ نے ریشماں کی حالت دیکھی تو انہیں ریشماں جیسی وفا شعار عورت پر بہت ترس آیا...... انہوں نے ایک تعویز لکھ کر دیا اور کہا۔

دیکھو بیٹی تمہارا شوہر سات سمندر پار گیا ہوا ہے۔ وہ بھی تمہاری صورت دیکھنے لیے بے قرار ہے...... مگر وہ نہیں آ رہا ہے حالانکہ اُس کا جی بہت چاہتا ہے۔''

''وہ کیوں نہیں آتا پھر؟'' ریشماں نے اُن کی بات کاٹ کر کہا۔

''اِس لیے کہ اُسے گیارہ برس ہو گئے ہیں بغیر اطلاع دیے تم سے دُور ہوئے اور قانونی طور پر تم اس بات کی مجاز ہو کہ شوہر کی چار سال تک اگر کوئی خیر خبر نہ ہو تو تم شادی کر سکتی ہو......''

بزرگ کی یہ بات سُن کر ریشماں ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔ اِس طرح کھل کر برسوں بعد وہ ہنسی تھی۔ مراد کی جدائی نے تو اُس کے ہونٹوں سے ہنسی بھی چھین لی تھی۔ مگر یہ ہنسی بھی کوکتی گھنگھرو جیسی تھی۔

اِس میں تو کئی نوحے تھے۔ کتنی ہی اذیتوں کی کہانیاں تھیں۔ اِس ہنسی نے کتنے زخموں کے کھرنڈ اتارے تھے۔

''تم یہ تعویز لو......اور چرخا کا تو...... چرخے پر اسے باندھ دینا اور چرخا اُلٹا چلانا......جلد تمہارا شوہر آ جائے گا۔'' جب وہ ہنستے ہنستے چپ ہوئی تو بزرگ نے جلدی سے کہا اور ہاجرہ بیگم کو اشارا کیا کہ لے جاؤ......''

ہاجرہ بیگم جلدی سے اُسے لے آئیں۔

......☆☆☆......

پھر تو ریشماں کو صرف ایک ہی کام رہ گیا......

وہ سارا دن نیم کے درخت تلے بیٹھی چرخا چلاتی رہتی اور اُس کی نگاہیں دروازے پر لگی رہتیں۔

یونہی پورے بائیس روز گزر گئے۔

ریشماں کے بازو چرخا چلا چلا کر شل ہو چکے تھے۔ آنکھیں انتظار کر کر کے تھک گئی تھیں۔ آس نراش میں بدل رہی تھی۔

مگر شاید خدا کے حضور اُس کی دعائیں مستجاب ہو گئی تھیں گیارہ سال کی ریاضت کام آ گئی تھی۔ اُس کی نظریں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔

بے شک آنگن میں داخل ہونے والا مراد ہی تھا۔ پہلے سے کتنا بدل گیا تھا......

گزرتے وقت نے اُس پر بھی اپنے نشان چھوڑے تھے۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ آنکھوں میں ویرانیوں نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔

چہرے پر سنجیدگی کی چھاپ تھی۔ ریشماں کے ہاتھ چرخا چلاتے چلاتے رُک گئے۔ آنکھوں میں قندیلیں روشن ہو گئیں...... مگر یہ قندیلیں ایک دم ہی بجھ گئیں۔ تمام خوشیاں خاکستر ہو گئیں۔ آرزوؤں کے پھول جھر جھر جلنے لگے۔ دل میں الاؤ سلگنے لگا......

اور ریشماں کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

وہ تیزی سے عقاب کی مانند آگے بڑھی اور مراد کو گریبان سے پکڑ لیا۔

یہ اُس نے بچھڑے شوہر کا سواگت کیا تھا۔

''مراد میں نے تمہاری یاد میں ایک ایک لمحہ گزارا ہے۔ تمہارے لیے اتنے آنسو بہائے کہ آنکھیں خشک ہو گئیں۔

اُن آنسوؤں کا خراج تم نے اِس طرح دیا کہ تم نے شادی کر لی......اور اپنے بیٹے کے ساتھ مزید زخم لگانے آ گئے۔ میرا سینہ تو پہلے ہی زخموں سے بھرا پڑا ہے اب اِس میں اور زخموں کی گنجائش نہیں ہے۔'' وہ مچلی جا رہی تھی۔

''ریشم میری بات تو سنو......'' مراد نے اپنا گریبان چھڑانا چاہا۔

''میں کچھ نہیں سُنوں گی...... چلے جاؤ مراد...... چلے جاؤ......تم نے میرا مان توڑا ہے۔ میرے ساتھ تم نے دھوکہ کیا ہے...... میں تمہیں معاف نہیں کر سکتی۔ تم چلے جاؤ۔'' ریشماں نے مراد کا گریبان چھوڑا اور اپنے کمرے میں بھاگ گی۔ مراد بھی پیچھے لپکا مگر تب تک اُس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

شور سُن کر ہاجرہ بیگم اور محلے کے دوسرے لوگ بھی آ گئے۔

ہاجرہ بیگم جہاں بیٹے کو دیکھ کر خوش ہوئیں وہیں اُس کے ساتھ چار پانچ سال کے بچے کو دیکھ کر انہیں دُکھ بھی ہوا۔ وہ سوچنے لگیں کہ یہ عورت ہی ہے جو ایک مرد کے نام اپنی پوری زندگی تمام کر دیتی ہے۔ اور مرد...... مرد ہر قدم پر نیا ساتھی تلاش کرنا چاہتا ہے۔

''اماں...... اماں آپ ریشماں کو سمجھائیں۔ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ یہ تو میرے دوست اختر کا بیٹا ہے۔ اِسے اُس نے اچھی تربیت کی غرض سے پاکستان بھیجا ہے...... اپنے والدین کے پاس حالانکہ میں نے سوچا بھی کہ پہلے اِسے راولپنڈی چھوڑ آؤں مگر میرا دل اتنا بے قرار تھا کہ جی چاہا فوراً ریشماں کے پاس پہنچوں۔ اگر وہ بے قرار رہی ہے تو میں بھی کم نہیں تڑپا۔ اماں اُسے سمجھاؤ......'' لحیم شحیم سا مراد کھو کر ماں سے لپٹا بے طرح روئے جا رہا تھا۔

''مجھے امید تھی کہ میرا خون اتنا بے وفا نہیں ہو سکتا۔'' ہاجرہ بیگم نے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔ پھر انہوں نے کتنا ہی دروازہ کھٹکھٹایا مگر ریشماں نے کنڈی نہ کھولی...... اندر سے کوئی بھی آواز نہیں آ رہی تھی۔

آخر...... مراد اور فضل نے دروازہ توڑ دیا۔

مراد تڑپ کر اندر داخل ہوا......

مگر اب تو وہاں کچھ بھی نہ تھا...... ریشماں پلنگ پر آڑی ترچھی پڑی تھی بے حس و حرکت...... زندگی کی کوئی بھی رمق اُس میں نہ تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جنہیں مراد کھوکھر نے لرزتے ہاتھوں سے بند کر دیا۔ آج اُن آنکھوں کا انتظار ختم ہو گیا تھا۔ اُسے جب تک یہ امید تھی کہ مراد اُس کا ہے وہ منتظر رہی تھی۔

''یہ میری آرزو ہے کہ تم مجھے قبر میں اُتار دو۔''

مراد کے ذہن میں اُس رات کا جملہ گونج گیا جب وہ گڑگڑا کر اُس سے التجائیں کر رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔

''تمہاری یہ آرزو پوری ہو گئی ہے ریشم! کاش تم دل میں میری طرف سے شک لے کر اس دنیا سے نہ جاتیں۔ میری جان تم مجھے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم کر گئی ہو۔ میں نے تو تمہارے بعد کسی اور عورت کو بھی خود پر حرام جانا ہے۔ میں نے بہت چاہا لوٹ آؤں مگر میں اپنے ہاں کے رسم و رواج سے واقف تھا۔ مجھے شک تھا کہ انہوں نے زبردستی تمہاری شادی کر دی ہو گی۔ آخر تم پس ماندہ علاقے کی لڑکی ہو کوئی شہر کی رئیس زادی تو نہ تھیں جو انکار کرتیں۔ مگر مجھے کیا معلوم کہ تم ہر روز آشاؤں کے دیپ جلاتی رہی ہو اور وہ نا اُمیدی کے جھونکوں سے بجھتے رہے ہیں۔'' مراد اُس کے چہرے پر جھکا بولے جا رہا تھا اور آنسو لڑیوں کی مانند ریشماں کے مردہ چہرے پر گر رہے تھے۔

آج ریشماں کو مرے کافی برس گزر چکے ہیں مراد بوڑھا ہو چکا ہے...... اُس نے مظفر گڑھ ہی میں اپنا کلینک کھولا ہوا ہے۔ روز صبح شام وہ ریشماں کی قبر پر جاتا ہے۔ شام کو دیا جلاتا ہے...... اور شاید اس طرح اپنی بے وفائی کا ثبوت دینا چاہتا ہے اُسے...... وہ جو کہ مر کر خود کو ہر غم سے، انتظار سے آزاد ہو گئی اور اُسے انتظار کی صلیب پر لٹکا گئی۔ بس اسے اس وقت کا انتظار ہے جب وہ اگلے جہاں اپنی ریشم سے ملے گا۔

یہ جدائی وہ عارضی سمجھتا ہے...... ابدی ملن کا وہ منتظر ہے۔ نجانے کب اُس ملن کا وقت آئے گا......

بعض مرتبہ مراد کا جی چاہتا ہے وہ چیخ چیخ کر کہے......

''خدارا ان وٹے سٹے کی شادیوں کو ختم کر دو۔ یہ کئی گھر اجاڑتی ہیں۔ کتنے دلوں کو زخمی کر کے ناسور میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ کتنی وفا شعار بیویاں انتظار کی صلیب پر لٹکتی رہتی ہیں۔ نہ مر سکتی ہیں نہ جی سکتی ہیں...... خدارا! اس سودے بازی کو ختم کر دو۔ مگر یہ چیخیں اُس کے اندر ہی گھٹ جاتی ہیں۔ کبھی بھی اِن الفاظ کو زبان نہیں ملتی، وہ منتظر ہے کہ کوئی اور پہل کرے مگر کون کرے گا؟ ان کھوکھلی روایات کو کون توڑے گا؟ کون ہے جو آگے بڑھے۔ وہ منتظر ہے اور منتظر ہی رہے گا۔

......☆☆☆......

ہر دوسرے قدم پر ہونے والے اس فراڈ کو، کوہاٹ سے بے نقاب کیا گیا

یہ واقعہ آج سے پانچ یرس قبل لاہور میں پیش آیا۔ میں اس وقت اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کا کاروبار کر رہا تھا۔ نثار صاحب سے میری شناسائی ایک دوست ڈاکٹر غلام عباس کی معرفت ہوئی تھی۔ نثار صاحب PTE کے ریٹائرڈ انجینئر تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد پنشن گریجویٹی مل گئی اس رقم سے انہوں نے پشاور کے ایک نئے ہاؤسنگ پراجیکٹ میں انوسٹمنٹ کی تھی۔ اس پراجیکٹ میں انہیں کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ چالیس لاکھ کے خرید کردہ پلاٹس بڑی مشکل سے دس لاکھ میں فروخت ہوئے تھے یوں انہیں تیس لاکھ کا نقصان ہوا تھا۔ باقی ماندہ دس لاکھ روپے مختلف کاروبار میں لگائے تھے جن میں انہیں مزید
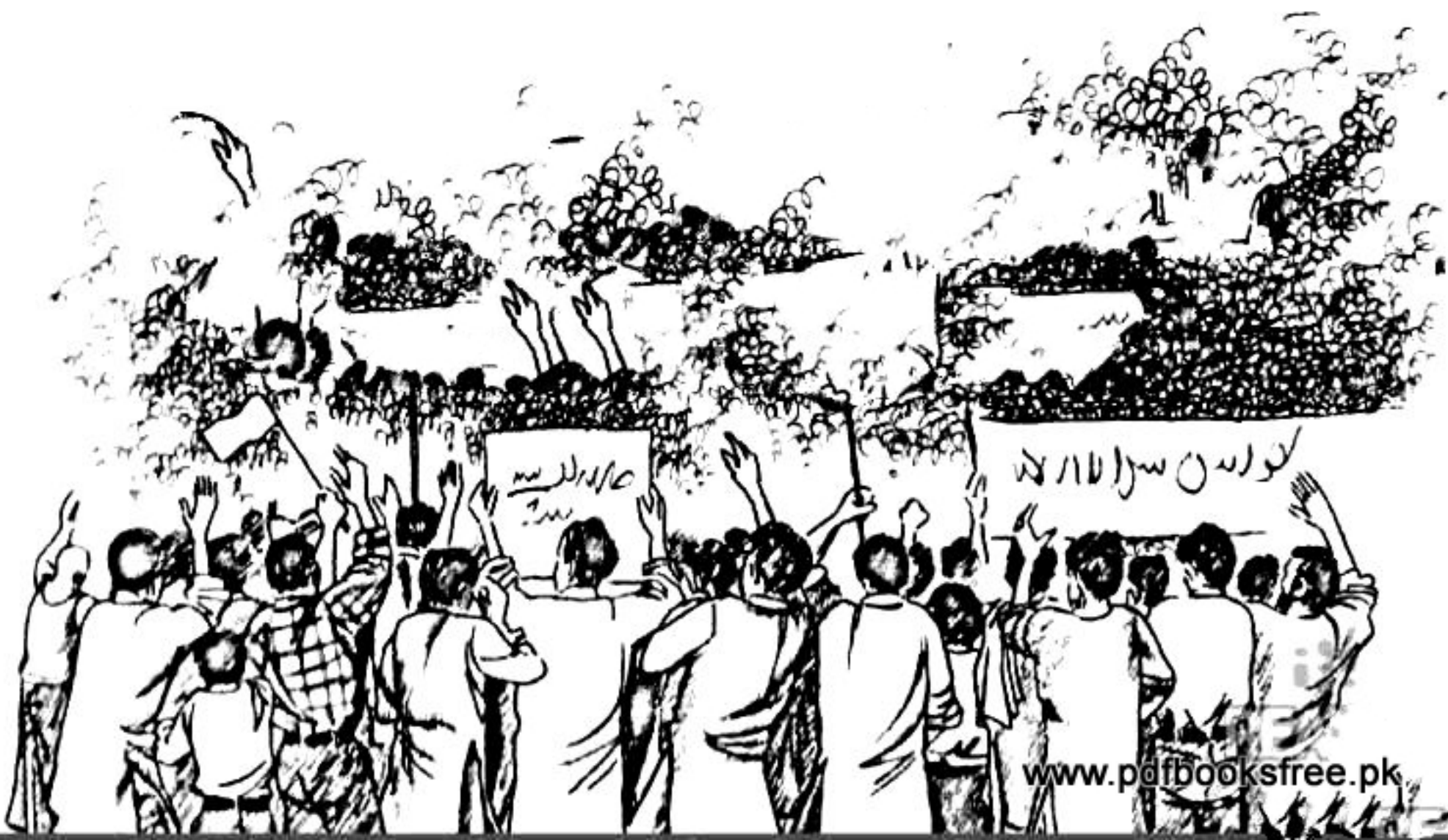
نقصان ہوا۔ وہ بہت پریشان تھے ۔ گھریلو ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے بہت بھاگ دوڑ کررہے تھے تاکہ کاروبار کا نقصان کاروبار میں پورا کریں۔

میں کسی کام کے سلسلے میں پشاور میں تھا کہ شام سات بجے نثار صاحب کا فون آیا۔ پوچھ رہے تھے کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کیا مصروفیت ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پشاور میں ہوں اور آج رات ملتان واپسی ہے۔ کہنے لگے کہ آپ ساری مصروفیات ترک کردیں اور صبح دس بجے لاہور پہنچنے کی کوشش کریں۔ ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی سے آپ کی میٹنگ کرائی ہے۔ بہت بڑا کاروباری چانس ہے۔ اسے AVAIL کرنا ہم دونوں کے لیے بہت سودمند ہے۔'' مزید بتارہے تھے کہ ان کا کمپنی سے رابطہ ہوا ہے انہیں لیہ' ڈیرہ اسماعیل خان اور میانوالی کے لیے TELENOR TOWERS کو روزانہ کی بنیاد پر ڈیزل سپلائی کرنا ہے، جس میں کمیشن کے طور پر چالیس ہزار روپے روزانہ ملیں گے۔ چونکہ میں ان کاروباری امور سے نابلد ہوں لہٰذا آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ میرے Boss ہیں اور آپ کی نگرانی میں میٹنگ ہوگی اور امور طے پاجائیں گے۔ باقی تفصیل لاہور آنے پر آگاہ کروں گا۔ نثار صاحب کی بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی، نہ تو ان کی یا میری کوئی کمپنی تھی۔ ہمارے پاس کوئی ہائی پروفائل تھا نہ پیسہ تھا، نہ تجربہ نہ کوئی Good will...... پھر اتنے بڑے پراجیکٹ کے لیے ہم کس بنیاد پر موزوں سمجھے گئے اور پارٹی ہم سے ہی کیوں میٹنگ کرنا چاہ رہی تھی۔

مجھے نثار صاحب سے ہمدردی تھی اور میں چاہتا تھا کہ ان کے حالات سدھر جائیں دوسرا اگر کوئی کاروباری فائدہ ہے تو اس سے ہم دونوں کو مستفید ہونا چاہیے۔ میں نے ملتان کا پروگرام کینسل کیا اور رات بارہ بجے Daewoo کے ذریعے پشاور سے لاہور صبح آٹھ بجے پہنچ گیا۔ میں نے انہیں مطلع کردیا تھا کہ صبح لاہور میں ملاقات ہوگی۔

لاہور پہنچنے پر میں ان سے ملنے ان کے ہوٹل گیا جہاں وہ قیام پذیر تھے۔

بڑے تپاک اور خوش دلی سے ملے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد تفصیل بتانے لگے کہ ایک بڑی کمپنی نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ انہیں مذکورہ چار اضلاع کیلیے پارٹی کی خدمات درکار ہیں جو ٹاورز کو ڈیزل سپلائی کرے گی۔ ہر دو دن بعد سپلائی شدہ تیل کی ادائیگی ہوگی۔ اس وقت ڈیزل ساٹھ روپے فی لیٹر تھا۔ دو روپے فی لیٹر کمیشن ملے گا اور یوں ہم چالیس ہزار روپے روزانہ کمیشن کے حقدار ہوں گے۔ بقول نثار صاحب پارٹی سے ان کی دو دفعہ ملاقات ہوئی ہے۔ کافی مستحکم اور Solid پارٹی ہے۔ اب آپ کی ان سے ملاقات ہونی ہے۔ اگر امور طے پا گئے تو فوری طور پر Agrement ہوگا اور سپلائی ایک دو دن میں شروع ہوگی۔

''انہوں نے اخبار میں شائع شدہ وہ اشتہار دکھایا لیکن میری تسلی نہ ہوئی کہ اتنی بڑی کمپنی اتنا بڑا پراجیکٹ اور صرف تین، چار سو روپے کا Classified اشتہار تھا۔ جس میں صرف فون نمبر تحریر تھا۔ کمپنی کا نام یا دیگر کوائف مفقود تھے۔ لیکن نثار صاحب بہت مطمئن اور پُر اُمید تھے اور قدرت کی طرف سے مدد اور انعام، قرار دے رہے تھے میں نے بھی مزید نہ کریدا اور مناسب سمجھا کہ اب آئے ہیں تو ملاقات کرنی چاہیے۔ آگے کیا صورت حال ہوگی دیکھا جائے گا۔''

......☆☆☆......

پارٹی سے گیارہ بجے شالیمار باغ کے مین گیٹ پر وقت مقرر تھا جہاں سے وہ اپنی گاڑی میں Pick کرکے دفتر یا رہائش گاہ لے جاتے۔ میرے ذہن میں پہلے بھی شکوک سر اٹھا رہے تھے مزید شک پیدا ہوا اتنی بڑی پارٹی میٹنگ کررہی ہے تو لازم تھا کہ وہ ہمیں اپنے دفتر یا کمپنی کا ایڈریس دیتے جہاں ہم خود پہنچتے۔ ان کی حیثیت اور کاروباری رابطہ سے آگاہی ہوتی، بہرحال جب تک پارٹی سے نہ ملتے کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔

ٹھیک گیارہ بجے صبح بذریعہ ٹیکسی مقررہ جگہ پہنچے

جہاں Latest Model کی ہنڈا کار باوردی شوفر ہمارے انتظار میں تھی۔ ڈرائیور نے با ادب سلام کیا اور گاڑی کے دروازے کھول کر نہایت عزت واحترام سے ہمیں بٹھایا۔ کوئی دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ایک خوبصورت دیدہ زیب محل نما بنگلے پر پہنچے جہاں باوردی سیکورٹی گارڈ مامور تھے۔ انہوں نے سیلوٹ کیا، دروازہ کھولا اور سر جھکا کر ہمیں اندر جانے کی اجازت دی وسیع۔ اور خوبصورت گارڈن کے ساتھ چلتے ہوئے بہت بڑے ڈرائنگ روم کے آگے رک گئے پورچ میں دو تین گاڑیاں اور بھی پارک تھیں۔

وہاں گارڈ موجود تھے جن کی رہبری میں ہمیں ملاقاتی کمرہ میں پہنچا دیا گیا۔ یہ تکلیف سے آراستہ وسیع کمرہ تھا۔ ایرانی قالین کے فرش پر مہاگنی فرنیچر، دبیز ریشمی پردے اور نایاب تصاویر سے مزین تھا ہمیں عزت کے ساتھ بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو صاحبان تشریف لائے۔ ان کے لباس تراش خراش متاثر کن تھی۔ تعارف کے بعد پتا چلا کہ ایک تو کمپنی کے ڈائریکٹر تھے اور دوسرے مینیجر تھے۔

نثار صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے بتایا کہ آپ عمران صاحب ہیں جن کے بارے میں بتایا تھا۔" دونوں بڑے تپاک اور خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ مصافحہ کیا سلام دعا ہوئی خیریت دریافت کی، فوراً ہی منرل واٹر کی یخ بوتلیں چاندی کے ظروف میں چائے معہ امپورٹیڈ بسکٹ، اسنیکس وغیرہ لائے گئے۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سارا اہتمام یہ استقبال یہ تو جھی، یہ کمال مہربانی کس بنیاد پر تھے، نہ تو ہماری کوئی کمپنی تھی، نہ ہمارے پاس کئی تجربہ تھا۔ نہ کسی نے ان سے ہمارا تعارف یا سفارش کی تھی، نہ ہماری کوئی شناخت یا بڑا نام تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ بہر حال میں اس انتظار میں تھا کہ آخر اس تو جھی کا نتیجہ کیا نکلتا ہے!

چائے وغیرہ کے بعد ڈائریکٹر صاحب بتانے لگے کہ TELENOR کمپنی سے ان کا لمبا چوڑا CONTRACT ہوا ہے اور ان کے جملہ امور کے نمائندے اور ذمہ داران ہیں چونکہ یہ مذکورہ اضلاع لاہور سے دور ہیں اور کام بھی چھوٹا ہے لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ آپ کو یہ SUBLET کیا جائے میں نے ان سے گذارش کی کہ اس کے لیے تو کم از کم بیس لاکھ روپے کی انوسٹمنٹ ہوگی وہ بھی روزانہ اور CONTRACT بھی ایک سال کا ہے۔ عمران فکر نہ کریں، آپ لوگوں سے مل کر از حد خوشی ہوئی۔ ہمیں اطمینان ہے کہ آپ مناسب ہیں۔ کمپنی آپ کو بیس لاکھ ایڈوانس دے گی جبکہ ہر دو روز بعد سپلائی کردہ تیل کی ادائیگی ہوگی یوں آپ کو کوئی مالی دشواری نہ ہوگی بس کام تسلی کا ہونا چاہیے۔

نثار صاحب خاموش تھے اور بار بار تشکرانہ نگاہوں سے اوپر دیکھ رہے تھے۔ میں نے ڈائریکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نہ صرف یہ کام ہمیں عنایت کر رہے ہیں بلکہ ایڈوانس بھی دے رہے ہیں

لیکن ہمیں ایڈوانس کے لیے کیا گارنٹی دینا ہوگی۔''
''عمران صاحب کیسی بات کر رہے ہیں۔ کمپنی کے لیے پیسہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کمپنی کو نیک نام اور اچھے GOOD WILL کی حامل پارٹی چاہیے ،کسی گارنٹی وغیرہ کی ضرورت نہیں۔''
نثار صاحب اٹھ کر ان کے آگے سر کھجانے لگے میرے لیے یہ سب ناقبلِ یقین تھا کہ آخر ان کے لیے ہم اتنے نیک نام کیسے ہیں۔
ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گارڈ نے آ کر اطلاع دی کہ کوئی صاحب فیصل آباد سے آئے ہیں اور ملنے کے خواہش مند ہیں۔'' ڈائریکٹر صاحب نے برہمی سے انہیں ڈانٹا کہ تمہیں معلوم نہیں ہم کتنے مصروف ہیں۔ کتنی بڑی پارٹی سے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ انہیں اندر آنے کی اجازت کس نے دی؟ گارڈ معذرت خوانہ انداز میں کہنے لگا کہ۔
''انہیں ہم نے ٹالنا چاہا لیکن وہ ملاقات کے لیے اصرار کر رہے تھے کہ ان کا ملنا اشد ضروری ہے۔''
منیجر نے بادل نخواستہ انہیں اندر آنے کی اجازت دی۔ مہمان گارڈ کی معصیت میں اندر تشریف لائے، کلف زدہ سفید کاٹن میں ملبوس، بلیک ویسٹ کوٹ پہنے ،کاندھے پر ریشی صافہ، ہلکی کٹر شدہ داڑھی، کپڑوں سے بھینی بھینی خوشبو ماحول کو معطر کر رہی تھی ان کے ہاتھوں میں امپورٹیڈ بریف کیس تھا۔ نپے تلے قدموں کے ساتھ وارد ہوئے۔
ڈائریکٹر صاحب اور ہم سب سے ہاتھ ملایا خیریت دریافت کی۔ ڈائریکٹر صاحب نے ان کی آمد کا پوچھا مہمان (صوفی صاحب کہیں گے) فرمانے لگے۔
''فیصل آباد سے آیا ہوں۔ وہاں ایک چھوٹی سی فیکٹری کا مالک ہوں۔ مجھے افضل صاحب سے ملنا ہے۔'' ڈائریکٹر صاحب نے دریافت فرمایا آپ افضل صاحب کو کیسے جانتے ہیں اور ان کی آخری ملاقات کب ہوئی۔ صوفی صاحب گویا ہوئے کہ ایک سال قبل ایک دوست کی معرفت ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مجھے کوئی مالی مسئلہ درپیش تھا۔

انہوں نے میری دادرسی فرمائی اور دو لاکھ روپیہ مجھے بطور قرض حسنہ دیا تھا۔ پر ان کا میرے اوپر بہت بڑا احسان تھا۔ اب میں الحمدللہ مالی طور پر مستحکم ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرنے اور ان کی امانت لوٹانے آیا ہوں۔'' ہم سب ان کی طرف تحسین کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ڈائریکٹر صاحب نے غمگین اور نمناک آنکھوں سے بتایا
''افضل صاحب میرے بڑے بھائی تھے اور چھ ماہ قبل ان کا انتقال ہوگیا ہے۔'' یہ افسوس ناک خبر سن کر صوفی صاحب دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ آنسو تھے جو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے ماحول بہت افسردہ ہوگیا تھا۔ انہیں تسلی دی گئی۔ انہوں نے تعزیت کے لیے ہاتھ بلند کیے ہم سب نے افضل صاحب مرحوم کے لیے فاتحہ درود پڑھا۔ ڈائریکٹر صاحب سے افسوس کا اظہار کیا۔ نثار صاحب ہم سب سے زیادہ افسردہ تھے۔ صوفی صاحب کی تواضع کی گئی ہماری میٹنگ کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ درود فاتحہ کے بعد صوفی صاحب نے بریف کیس کھولا اور ایک ایک لاکھ کی دو گڈیاں نکالیں اور ادب سے ڈائریکٹر صاحب کو پیش کیں۔
اب ان کی امانت کے حقدار آپ ہیں جسے بعد شوق قبول فرمایا جائے کچھ پس و پیش کے بعد ڈائریکٹر صاحب نے بادل نخواستہ پیسے لے کر لاپروائی سے میز کے نیچے رکھ دیے نثار صاحب کی آنکھیں اب تک نمناک تھیں۔ تھوڑی دیر بعد صوفی صاحب نے اجازت چاہی کہ انہیں فیصل آباد واپس جانا ہے جہاں باہر سے آئی پارٹی سے ٹیکسٹائل کے بارے میں میٹنگ کرنی ہے۔'' وہ جانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ منیجر صاحب نے اصرار کیا کہ کچھ دیر رک جائیں اور یہ بتائیں کہ آپ نے اتنی جلدی اپنی کاروباری حیثیت کو کیسے مستحکم کیا کہ ماشااللہ فیصل آباد میں فیکٹری کے مالک ہیں۔ جسے آپ کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے چھوٹی فیکٹری قرار دے رہے ہیں۔''
''افضل صاحب سے تعلقات کا نتیجہ!! ان کے نام سے لاہور میں تین عدد مختلف فیکٹریاں ہیں۔ کچھ

ہمیں بھی کاروباری TIP دیں۔''
صوفی صاحب بتانے میں ہچکچا رہے تھے کافی اصرار کے بعد ہماری خواہش اور مجبور کرنے پر انہوں نے اپنی جیب سے 25 عدد چھوٹے چھوٹے عقیق جیسے کالے پتھر نکالے اور 5،5 ہر آدمی کے آگے رکھے۔ چونکہ ہم تعداد میں پانچ افراد تھے ان کی تعداد 25 تھی۔

''کہنے لگے کوئی بتائے کہ کل کتنے پتھر ہیں؟ نثار صاحب نے فوراً ہاتھ کھڑا کیا کہ 25 عدد ہیں۔'' صوفی صاحب نے ہم سب کے سامنے پتھروں پر ہاتھ پھیرا تو پتا چلا وہ تعداد میں 20 تھے یعنی 5 پتھر غائب ہوگئے تھے۔ ہم سب بہت حیران ہوئے کہ آخر 5 پتھر کہاں گئے۔ دوبارہ ہاتھ پھیرا تو اب پہلے کی طرح 25 تھے۔ یوں صوفی صاحب کہنے لگے کہ یہ چھوٹا سا کھیل ہے۔ اگر کوئی صاحب حیثیت ایسی شرط لگائے تو ہم لاکھوں کروڑوں جیت سکتے ہیں۔ ڈائریکٹر وغیرہ سب دم بخود تھے اور بہت حیرانگی اور تحسین نگاہوں سے صوفی صاحب کو تکے جارہے تھے۔ اب ہماری میٹنگ وقتی طور پر ملتوی ہوگئی تھی اور ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ میں شک وشبہ میں ڈوبا تھا کہ یہ بھلا کیا چکر ہے! کہاں تیل کی سپلائی! کہاں 20 لاکھ ایڈوانس! کہاں صوفی صاحب کی آمد اور ان کی کاروائی میں سمجھ چکا تھا کہ یہ لمبا چکر ہے اور کوئی چال ہے، جس میں ہم پھنس چکے ہیں لیکن بات وہی کہ دیکھیں اس کا END کیا ہوتا ہے! یہ سب دیکھنا تھا۔ منیجر صاحب نے مزید چائے کا آرڈر دیا اور صوفی صاحب کو بتایا کہ آپ نے بہت اچھا IDEA اور کھیل پیش کیا ہے۔ اب ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ ہماری کمپنی کے چیئرمین سیٹھ رام جگدیش، سندھ سے آئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں تشریف لائیں گے۔ بہت امیر کبیر اور عیاش دل کے مالک ہیں۔ ہم انہیں اس کھیل میں شامل کریں گے اور جیتی رقم کو ہم پانچوں آپس میں برابر تقسیم کریں گے۔

''نثار صاحب نے میز کے نیچے سے اپنا پاؤں میرے پاؤں پر مارا کہ ہم کتنے خوش نصیب ہیں اور قسمت کی دیوی ہم پر کتنی مہربان ہے۔''
ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گارڈ نے لرزتے کانپتے اور ہانپتے ہوئے آکر بتایا کہ سیٹھ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔''
ہم بڑے اشتیاق سے دروازے کو تک رہے تھے جہاں سے سیٹھ صاحب نے وارد ہونا تھا۔ اور پھر سیٹھ صاحب رام جگدیش کی آمد ہوئی۔ گہرا سانولا رنگ، گٹھا ہوا بدن، اعلیٰ قسم کی سفید کاٹن کی قمیض اور لنگوٹی، ماتھے پر تلک کا نشان، کندھے پر اونی چادر، بائیں ہاتھ میں ہیروں سے جگمگاتی رولیکس کی گھڑی، دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں، گلے میں سچے موتیوں سے جڑی مالا، پیروں میں اعلیٰ کے امپورٹڈ چپل، شخصیت میں پختگی کے آثار ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ دونوں ہاتھ باندھ کر سب کو پرنام کیا۔ ایک ایک کی خیریت دریافت کی۔ نثار صاحب ان کے پاؤں چھونے کے لیے کھڑے ہوئے۔ میری آنکھیں دیکھنے پر رک گئے۔ سیٹھ صاحب کو بتایا گیا کہ یہ نثار صاحب ہیں اور یہ ان کے باس عمران صاحب جو کمپنی چیئرمین ہیں۔ (کون سی کمپنی اور کہاں کی کمپنی) جن سے ٹاورز کو تیل سپلائی کرنے کیلیے منتخب کیا گیا ہے۔ آج ہی ان سے AGREEMENT ہوگا اور مذکورہ کام کے لیے 20 لاکھ ایڈوانس دیں گے۔

''سیٹھ صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا جیسے انہوں نے نہیں بلکہ میں نے انہیں کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے اور نثار صاحب کو بہت بہت مبارک دی اور خوشی کا اظہار کیا۔ سیٹھ صاحب پھر ڈائریکٹر سے مخاطب ہوئے آج کیا پروگرام ہے؟
''انہیں بتایا گیا کہ مین ملتان روڈ پر پچاس کنال زمین خریدی گئی ہے۔ دو کروڑ کا سودا ہوا ہے۔ جس کے لیے دس لاکھ ایڈوانس دینے ہیں اور باقی رقم اراضی کی ٹرانسفر پر ادا کی جائے گی۔
''سیٹھ صاحب تھوڑا خفا ہوئے کہ اتنی چھوٹی ڈیل کی کیا ضرورت تھی! منیجر صاحب نے دبے اور

شرماتے ہوئے کہا کہ یہ اراضی دراصل چھوٹی بیگم کی خواہش اور فرمائش پر خریدی گئی ہے۔ جہاں وہ اس پر ماڈرن تھیٹر بنوائیں گی۔ جہاں انڈیا اور پاکستان کے فنکار دونوں ممالک کو قریب لانے کے لیے اپنی فنی خدمات پیش کریں گے۔'' (ظاہر ہے کہ چھوٹی بیگم سیٹھ صاحب کی دوسری بیوی تھیں)

لالہ جی کی باچھیں کھل اٹھیں۔ چلو ٹھیک ہے اچھا کیا! سیٹھ صاحب نے پوچھا کہ اس زمین کے لیے اب کیا کرنا ہوگا۔ منیجر صاحب بول اٹھے کہ فی الحال تو دس لاکھ بیانہ کرنا ہے اور باقی رقم بعد میں ادا کریں گے۔'' سیٹھ صاحب نے فوراً اپنا چمکتا ہوا دیدہ زیب قیمتی بریف کیس نثار صاحب اور میری نظروں کے سامنے کھولا جسکے اندر موجود اشیاء کو ہم با آسانی دیکھ سکتے تھے۔''

سیٹھ صاحب نے پہلے تو سونے کا جڑا ہوا سگریٹ کیس نکالا اور اس میں خوشبوؤں سیمعطر سگریٹ منتخب کی پھر ڈائمنڈ کا لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگائی۔ بریف کیس میں =/5000 روپے کے نوٹوں کی لاتعداد گڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دو گڈیاں نکالیں اور بحوالہ منیجر کیں زمین کے لیے دس لاکھ روپے ایڈوانس دیے جائیں۔ سیٹھ صاحب نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔

''عمران صاحب اجازت دیں مجھے گورنر صاحب سے ملنے جانا ہے! دو دن بعد وزیر اعظم ہندوستان سے ملاقات طے ہے جس کے لیے ضروری اقدامات اور تیاریاں کرنی ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔''

دونوں ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور رام رام کہتے ہوئے جانے لگے۔ ڈائریکٹر صاحب نے ادب سے گذارش کی کہ سیٹھ صاحب آپ ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ کچھ وقت تو آرام اور تفریح کے لیے بھی دیا کریں۔ ہم غریبوں کے لیے دی گئی آپ کی چند گھڑیاں ہمارے لیے بہت اعزاز اور سرمایہ حیات ہیں۔ کچھ دیر توقف فرمائیں۔ صوفی صاحب آپ کے لیے ایک چھوٹا سا کھیل اور تفریح لائے ہیں۔'' سیٹھ صاحب نے اپنی نظر التفات صوفی صاحب پر ڈالی۔ وہ خوشی سے لوٹ پوٹ گئے۔ سیٹھ صاحب کی رضا مندی اور اجازت سے انہوں نے پوٹلی سے وہ پتھر نکالے ہم چھ افراد تھے ہر ایک کے آگے پانچ پانچ پتھر تھے یعنی تعداد میں 30 تھے کہنے لگے

'' سیٹھ صاحب فرمائیے کل کتنے پتھر ہیں سیٹھ صاحب نے فوراً جواب دیا 30 ہیں صوفی صاحب نے حسب سابق ہاتھ پھیرا تو 25 نکلے۔ سیٹھ صاحب بہت حیران ہوئے دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر داد دی کہ بہت اچھا کھیل ہے۔'' صوفی صاحب کہنے لگے کیا خیال ہے اگر کچھ رقم لگا دی جائے تو کھیل میں مزید دلچسپی ہوگی۔ سیٹھ صاحب فوراً رضامند ہوگئے یوں وہ دو، تینباریوں میں چالیس لاکھ ہار گئے اور فوراً بریف کیس سے چالیس لاکھ روپے نکال کر بحوالہ صوفی کو دیے ظاہر ہے کہ بقول ڈائریکٹر صاحب یہ جیتی ہوئی رقم ہم پانچوں میں برابر تقسیم ہونا تھی یعنی فی کس آٹھ لاک روپے...... نثار صاحب خوشی ومسرت سے نہال ہو رہے تھے سیٹھ صاحب رقم دے کر کمرے سے باہر نکل رہے تھے کہ کچھ سوچ کر واپس آئے اور مجھ سے مخاطب ہوئے عمران صاحب! آپ سمجھ دار اور با اصول شخص لگتے ہیں۔ آپ ہی یہ فیصلہ کریں میں نے چالیس لاکھ تو فوراً ادا کر دیے اگر آپ لوگ ہار جاتے تو ہاری رقم کیسے واپس کرتے؟ آپ لوگوں نے تو پیسہ SHOW ہی نہیں کیا۔ یہ تو کھیل کے خلاف ہے اور کوئی اصول کی بات نہیں! ڈائریکٹر صاحب اور باقی سب گہری سوچ میں پڑ گئے۔ چالیس لاکھ روپے آتے ہوئے واپس ہو رہے تھے۔ میں اب ان کی سکیم تقریباً سمجھ چکا تھا اور ڈراپ سین کے لیے تیار تھا۔ سیٹھ صاحب پھر مخاطب ہوئے۔

''خیر فکر نہ کریں۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ابھی ایک بجا ہے۔ میں آپ لوگوں کو کل صبح گیارہ بجے تک کا ٹائم دیتا ہوں۔ آپ صرف چالیس لاکھ SHOW کریں۔ میری ہاری رقم سب کی ہوئی اور جب تک یہ رقم ڈائریکٹر صاحب کے پاس میری

امانت ہے یہ کہتے ہوئے رام رام کرتے کمرے سے باہر چلے گئے (یعنی ان کا کردار ختم ہوگیا تھا) اور ہم سب گوسوچ میں غلطاں کر گئے۔ ان کے جانے کے بعد منیجر صاحب کہنے لگے کہ سیٹھ صاحب کی بات میں تو کافی وزن ہے اصولاً انکی بات درست ہے ہمیں چاہیے کہ کسی طرح سب مل کر 30 لاکھ کا بندوبست کریں کیونکہ بیانے کے دس لاکھ موجود ہیں جنہیں وقتی طور پر چالیس لاکھ میں شامل کر سکتے ہیں ہم نے یہ رقم صرف کل سیٹھ صاحب کو دکھانی ہے۔ صوفی صاحب کو کہا گیا کہ وہ کتنی رقم کا بندوبست کر سکتے ہیں انہوں نے اپنے بریف کیس سے تین لاکھ نکال کر میز پر رکھ دیے۔

سات لاکھ کے لیے ڈائریکٹر اور منیجر نے حامی بھری یوں (10+3+7=20 لاکھ روپے) بیس لاکھ جمع ہوگئے اور باقی کے بیس لاکھ مجھے اور نثار صاحب کو کرنے تھے۔ عمران صاحب اگر آپ کسی طرح 20 لاکھ کا بندوبست صرف دو گھنٹے کے لیے کریں اور مطلوبہ رقم مطلوبہ وقت مقررہ پر لے آئیں تو 16 لاکھ جیت کے اور بیس لاکھ اصل اسی وقت مل جائیں گے۔''

نثار صاحب مترحم چہرے سے مجھے دیکھنے لگے کہ ہمارے مذاکرات کس رخ پر چلے گئے۔ میں اب ان کے منصوبے کو سمجھ چکا تھا یعنی تیل کی سپلائی CONTRACT ایڈوانس، کاروباری مذاکرات سب ڈھونگ تھا۔ دراصل ہم دونوں کو لالچ میں پھنسا کر رقم بٹورنے اور فراڈ کرنے کے لیے یہ سارا ڈرامہ اور اسکیم تھی۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب ان سے جان کیسے چھڑائی جائے اور نثار صاحب کو کیسے باور کراؤں کہ یہ سب دھوکہ اور فراڈ ہے۔ میں نے دومنٹ کی اجازت لی کہ نثار صاحب اور میں آج ہی رقم کا بندوبست کرتے ہیں اور اسی سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے ٹال مٹول کیا کہ ہمیں ان کے سامنے بات کرنی چاہیے لیکن میں نے انہیں قائل کر لیا۔

باہر آکر میں نے نثار صاحب کو بریف کیا کہ ہمیں کس طرح فائدہ مند کاروبار کا جھانسا دے کر پھنسایا

اگر آپ کو سچی کھانیاں کے حصول میں دشواری ہے

معزز قارئین!

☆اگر آپ کو سچی کہانیاں ڈائجسٹ کے حصول میں کسی بھی کسی قسم کی دشواری پیش آرہی ہے۔

☆اگر کوئی نیوز ایجنسی یا ہاکر آپ کو سچی کہانیاں کی ترسیل میں آنا کانی کر رہا ہے۔

☆اگر آپ کی نشاندہی پر بھی کوئی ردعمل نہیں کیا جارہا......

تو پھر فوری طور پر ہمیں مطلع کریں اور اپنی قریبی نیوز ایجنسی یا بک اسٹال کا نام اور فون نمبر لکھ کر ہمیں ارسال کردیں۔

برائے رابطہ: 0213-5893121

0213-5893122

گیا ہے۔ اگر ہم ان کی خواہش کے مطابق پیسوں کا بندوبست نہیں کرتے تو ہم دونوں کو تب تک قید میں رکھیں گے جب تک ہمارے گھر والے اغوء برائے تاوان کی رقم ادا نہیں کرتے۔

''نثار صاحب بھی اب ان کا کھیل سمجھ چکے تھے وہ اب پریشان تھے کہ خدارا کچھ کریں کسی طرح ہمیں باہر نکلنا چاہیے۔ واپس کمرے میں آکر میں نے انہیں بتایا کہ ہماری بات ہوگئی ہے۔ ہم پیسوں کا بندوبست کل کی بجائے آج ہی کرتے ہیں 20 لاکھ روپے آپ کو آج چار بجے شام میں مل جائیں گے لیکن مہربانی ہوگی یہ رقم معہ دیگر رقوم آج ہی واپس مل جائیں۔ انہوں نے یقین دہانی کرائی اور خوش ہوگئے کہ کتنی آسانی سے ہم ان کے دام میں پھنس گئے۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ ہمیں آپکی گاڑی معہ ڈرائیور ریگل چوک مال روڈ جانے کے لیے چاہیے۔ وہاں الفلاح بنک سے پیسے نکال کر فوراً واپس آئیں گے۔''

وہ فوراً راضی ہوگئے۔ ڈرائیور کو ہدایت کی کہ عمران صاحب کے ساتھ جائیں۔ ''میں نے نثار صاحب کو ساتھ چلنے کا کہا تو ڈائریکٹر صاحب کہنے لگے کہ ان کے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ڈرائیور کو ساتھ لے جائیں، نثار صاحب یہیں رہیں گے۔'' نثار صاحب یہ سن کر بہت فکر مند ہوئے ان کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں تو با آسانی نکل سکتا تھا لیکن نثار صاحب کا کیا ہوتا! میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ایک خیال کے تحت ڈائریکٹر صاحب سے مخاطب ہوا۔

''نثار صاحب کا میرے ساتھ جانا ضروری ہے ہم دونوں کا بنک میں جوائنٹ اکاؤنٹ ہے۔ ان کے بغیر بنک سے کیش نہیں مل سکتا۔ دوسرا چیک بک تو ہمارے پاس نہیں، بنک سے دوسرے تیسرے دن ملتی ہے۔'' بہت سوچ بچار کے بعد پیسوں کے لالچ میں وہ راضی ہوگئے۔

میں نثار صاحب کی محبت میں معہ ڈرائیور بنک کے سامنے ریگل چوک پہنچا۔ بنک کے آگے بس اسٹاپ تھا جہاں کافی رش تھا۔ بسوں ٹیکسیوں کے انتظار میں کھڑے لوگ، بنک سیکورٹی ملازمین نئے ماڈل کی چمکتی گاڑی اور اس کی شان و شوکت سے مرعوب دکھائی دے رہے تھے۔ ڈرائیور ہمیں VIP پروٹوکول دے رہا تھا۔ نثار اور میں بنک میں داخل ہوئے۔ ہمارے پیچھے ڈرائیور بھی داخل ہونا چاہ رہا تھا۔ یکدم میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا کہ تم کیوں ہمارے پیچھے آرہے ہو۔''

وہ ہڑ بڑا گیا کہنے لگا کہ ڈائریکٹر صاحب سیٹھ صاحب کیش!'' میں نے اس کی بات ادھوری کاٹی۔ ''کون ڈائریکٹر، کون سا کیش؟ تم جانتے ہو کہ میں پولیس کو بلا کر تم لوگوں کے کرتوت بتاؤں! تم یہاں سے فوراً کھسکو ورنہ ابھی کھڑے کھڑے تم فراڈیوں کو بے نقاب کردوں گا۔'' میرے اس روپ اور موڈ کو دیکھ کر ڈرائیور نے تیزی سے کھسکتے ہوئے گاڑی میں پناہ لی اور رفو چکر ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم انہیں جھانسا دے کر نکل گئے ہے۔ بنک سے نکل کر ہم نے اپنے ہوٹل پہنچے۔ ہم نے کون سا کیش لینا تھا۔ نثار فوراً میرے قدموں میں گر گیا کہ صاحب میرا کوئی قصور نہیں۔ ''میں نے اسے تسلی دی۔ میں نے اس کی نا سمجھی، نادانی اور نا تجربے کاری کو نظر انداز کیا اور اسے کہا کہ آؤ اب واپس اپنے شہر لوٹتے ہیں۔''

بعد میں پتا چلا کہ لاہور میں ایسے بہت فراڈی ہیں، جنہوں نے لوگوں کو نوکریاں دینے، انٹرویو کے لیے بلانے اور لڑکیوں کے ذریعے نوجوانوں کے لیے جعلی کمپنیاں کھولی ہیں اور پھر انہیں وہ تباہ و برباد کردیتے ہیں۔ لاہور کی پولیس نے اس سلسلے میں کاروائیاں کیں اور اعلانات کیے کہ ایسی جگہوں پر جانے سے پیشتر پولیس کو مطلع کرنا ضروری ہے۔

مذکورہ نام نہاد کمپنی اس طرح دو تین ماہ کے لیے کسی بھی پوش علاقے میں فرنشڈ کوٹھی کرائے پر لیتی ہیں، کافی اپوئنٹمنٹ کرتی ہیں اور دو تین کاروائیاں کر کے وہ ٹھکانہ چھوڑ دیتے ہے۔ متاثرین پولیس کے پاس نہ جا سکتے تھے کہ وہ خود اس غیر قانونی غیر اخلاقی کاموں میں خود حصے دار ہوتے تھے اور اس حرکت میں ملوث گردانے جاتے تھے۔ اس کمپنی کا ماسٹر مائنڈ رانا نامی شخص تھا۔ باقی سارے کارندے بشمول ڈائریکٹر، نیجر، صوفی، سیٹھ رام وغیرہ پانچ پانچ سو روپے کے دھیاڑی دار تھے۔

وہ ساری کاروائی سی سی ٹی وی کمرے کے ذریعے مانیٹر کرتا۔ سپروائز کرتا، اور پھر لوٹی (کیمرے) رقم کا مناسب حصہ اوپر دیتا تھا جس سے اسے قانونی تحفظ ملتا۔ یہ ظالم لوگ تھے جو بے روزگار مجبور حالات کے شکار بے بسوں اور معصوم لوگوں سے فائدہ اٹھاتے ان کی زندگیوں کو برباد کردیتے۔

آخر میں عوام سے خاص کر نوجوانوں سے اپیل ہے کہ وہ کہیں انٹرویو دینے جائیں انہیں کسی جگہ بلانے اور کام کی پیشکش ہو تو ہوشیار رہیں، تصدیق کریں اور پولیس کو باخبر رکھیں۔

......☆☆☆......

تیسرا شعلہ

فصیحہ آصف خان

ملتان سے ایک ایسی دوشیزہ کی داستان جسے اُس کے اپنوں نے طوائف بنا دیا تھا
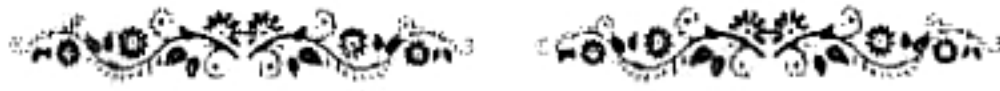
چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے، چھوڑ دو، چیخیں، سسکیاں، آنسو، رحم دلی کی التجائیں، لرزتا وجود، کھینچا تانی میں پھاڑے گئے کپڑے۔

پر...... شہناز کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تھی، اس نے اُسے کھنچتے جاتے ہوئے دیکھا اور دوبارہ چودھری کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''دل خوش کر دیا تو نے تو چودھری اس بار۔'' شہناز کی باچھیں کھلی جا رہی تھی۔ پان کی بدولت نہ صرف ہونٹ سرخ تھے۔ بلکہ پورا چہرہ روشنی سے لال ہو رہا تھا۔

''دام بھی میری مرضی کے ہوں، گے بڑی مشکل سے تیرے تک یہ آئی ہے۔'' چودھری اکڑ کر بولا تھا۔ ''اس کی رقم الگ وصول کروں گا۔''

''اے بس کر! تیری تو رال ہی ٹپکنے سے ختم نہ ہو گی۔ نیلوفر...... اری او نیلوفر'' شہناز نے آواز لگائی تو بیس سالہ نیلوفر ہار، سنگار میں لتھڑی، رنگین ساڑی باندھے مٹکتی چلی آئی۔ چودھری نے حسب معمول غلیظ نگاہوں سے اس کا بھرپور جائزہ لیا۔

نیلوفر کو، کوئی پروا کب تھی۔ بلکہ خوشی انگ انگ سے پھوٹنے لگی تھی، کہ وہ ابھی تک مرکز نگاہ تھی۔ وہ شہناز کے پاس آ کر اس کے حکم کی منتظر تھی۔

''بیس ہزار تھما دے اسے۔'' شہناز کا کہنا تھا کہ چودھری یکدم کھڑا ہو گیا اور کاروباری انداز میں بولا۔

''بے ایمانی نہ کر شہناز! پچیس ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ حال تو دیکھ نواں اَن چھوا، مکھن کی ٹکیہ ہے پوری، قسم سے بلائی ہے بالائی۔ ملائم سے نرم، گلاب کی منہ بند کلی۔''

''دیکھ چودھری! اس کی اکڑ نکالنے میں بڑی محنت کرنی پڑے گی۔ چل بائیس پر بات ختم کر۔ نام کیا بتایا تھا تُو نے اس کا مختاری۔ لے یہ بھی کوئی نام ہے۔ آج سے یہ پری کہلائے گی۔ دیکھنا کیسے کیسے دیو، جن قابو کرے گی۔'' شہناز نے مزے لے کر کہا تو چودھری تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد مان گیا

''یہ ہوئی نہ بات...... چل جا رقم لے آ......''

نیلوفر اُلٹے قدموں گئی اور رقم چودھری کے سامنے رکھ دی۔

''دیکھ اب کے تری مانی۔ اگلی بار میری ماننی ہو گی۔'' اس نے رقم واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے لالچی انداز میں کہا تو شہناز کے ساتھ نیلوفر بھی قہقہہ لگا کر رہ گئی۔

چودھری ہولے ہولے سیڑھیاں اترتا۔ رکشے میں بیٹھ کر یہ جا اور وہ جا ہو گیا۔

......☆☆☆......

روئی روئی آنکھیں، نازک حسن سوگواری لیے ہوئے تھا۔

ہو دلکش سراپا، وہ واقعی سرتاپا حسن تھی۔

مختاری، جو دو دن سے اب پری تھی ایسی پری جس کے پر کاٹ دیے گئے تھے۔ ریشمی لباس اس کے وجود پر بری طرح چبھ رہا تھا۔

سترہ، اٹھارہ سالہ مختاری، جسے اس کے لالچی چاچا نے آٹھ ہزار میں چودھری کو فروخت کر دیا تھا۔ جوئے، نشے کی لت کے سبب۔ اب اس کی بولی بائیس ہزار لگی تھی۔ ماں باپ کے گزر جانے کے بعد بے اولاد چاچا نے اس کی پرورش کر کے اپنا قرضہ وصول کر لیا تھا۔

مختاری سہمی سہمی نگاہوں سے اس رنگین ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں عجیب قسم کی خوشبوئیں رچی تھیں۔ عجیب و غریب نظارے تھے۔ سنگھار سے لتھڑے چہرے، بظاہر حسین نظر آنے والے یہ حسین چہرے، مگر بے حد مکروہ اور خباثت سے بھرے تھے۔ چاچا کے گھر چاچی کی مار، جھڑکیاں کھاتی رہی جب تک چاچی زندہ رہی۔ خون تھوک تھوک کر ایک دن پیوند خاک ہو گئی۔ مختاری کو روکھی سوکھی مل جاتی۔ گھر کے سارے کام کرتی، عمر سے بڑی سوچیں ذہن میں پلنے لگی تھیں۔ چھ جماعتیں پڑھ سکی تھی، مگر حالات نے بہت سارا علم دے دیا تھا۔ اس کی سوچیں بہت گہری تھیں۔ کیا وہ کوئی بکنے کی چیز تھی، دل رو رہا تھا اپنی بے وقعتی پر۔

کھانے کا وقت ہوا تو ایک بوڑھی عورت اس کے سامنے ٹرے رکھ کر چلی گئی۔ بھوک سے جسم میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ زندہ رہنے کے لیے کھانا ضروری تھا۔ کب تک بھوک برداشت کرتی۔

ہاتھ بڑھے اور وہ پیٹ کی آگ بجھانے لگی، کھانا بے حد لذیذ تھا۔ دال، سبزی کھانے والی نے پہلی بار قصبے کی روکھی سوکھی روٹی کے بعد شہر کے لذت بھرے کھانے

چھپے تھے۔ نیز ذائقہ مدا کر اثر کیسے نہ ہوتا جسم میں کھانا گیا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی تازہ دم ہوگئیں۔

''چل ری تیرا بلاوا ہے۔'' ایک لڑکی نے اس کا بازو پکڑا اور کھڑا کر دیا۔ مختاری گھبراہٹ کے عالم میں کچھ بول ہی نہ سکی۔ اور بڑے بڑے قدموں سے اس کے ساتھ چلنے لگی۔ کئی راہداریاں گزرنے کے بعد وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچی۔

تخت پر بیٹھی، پان چباتی، زیورات پہنے، سنگھار کیے، شہباز کسی سلطنت کی ملکہ کی طرح براجمان تھی۔ یا زمین پر کسی حکمران کی طرح۔

ہوں..... مختاری کو اپنے سامنے کھڑا کر کے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لینے لگی۔ مختاری نے گھبرا کر دوپٹہ اچھی طرح پھیلایا۔

تب اک پراسراری مسکراہٹ شہباز کے چہرے پر پھیل گئی۔

''اری..... ادھر شرم نہیں چلے گی۔ شرمائی تو بھوکی مرے گی۔'' شہباز اسے اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا اور کہا تو پاس بیٹھی نیلوفر نے کا قہقہہ بلند ہوا۔

مختاری ناسمجھی کے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تو اس کے پاس کھڑی لڑکی نے اس کا دوپٹہ ایک جھٹکے سے اتارا اور گول مول کر کے دور پھینک دیا۔ مختار صدمے اور حیرت سے بت بنی رہ گئی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی اور نمی اتری تھی۔ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ کئی سوال ذہن کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگی۔ شہباز نے اشارہ کیا تو وہ لڑکی اسے اندر کمرے میں لے گئی۔

☆☆☆

اشک بہا بہا کر اس نے آنکھیں لال کر ڈالی تھیں۔ آج دوسرا دن تھا۔ انجمن اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔ مگر اس کی ناں ہاں میں نہ بدل رہی تھی

''شہباز کو نہیں جانتی تو۔ وہ کھال ادھیڑ دے گی تیری۔'' انجمن نے اطمینان سے اسے سمجھایا۔

''میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔'' وہ تڑپ رہی تھی اتنے میں شہباز اندر آ گئی۔

انجمن کھڑی ہو گئی۔ مختاری کی سسکیاں جاری تھیں

''کیا کہتی ہے یہ۔'' شہباز کڑک دار آواز تھی۔

مختاری اٹھی اور شہباز کے پاؤں پڑ گئی۔ رو ہی سکتی وہ، رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ مگر وہاں شہباز تھی، جس کے سینے میں دل نہیں پتھر تھا۔

''شرافت سے اٹھ اور تیار ہوجا۔ خاکوانی صاحب نے آج رات تیری قیمت لگائی ہے۔ چکائے گی نہیں میرا قرضہ؟''

شہباز نے اسے کھڑا کیا مختاری بے بس پرندے کی طرح اس قید میں تھی۔ چاروں طرف سلاخیں تھیں، رہائی ناممکن تھی۔

''چل شاباش زیادہ اکڑ نہ دکھا۔ یہاں ہر شرافت، عزت، ناموس کو دفن کر کے جینا پڑتا ہے۔ سیٹ ہوجائے گی تو بھی...... ہوتا ہے ایسے پہلے پہلے پھر...... ہا...... ہا...... ہا وہ زور زور سے ہنسنے لگی اور انجمن کو ہدایات دے کر ناقدانہ نظروں سے مختاری کا جائزہ لے کر باہر چلی گئی۔ مختاری کے آنسو منجمد ہوگئے تھے۔ بے بسی عروج پر تھی۔

انجمن نے اسے قیمتی لباس پہنا کر اس کی قیمت بڑھا دی سجایا، سنوارا، وہ کٹھ پتلی بنی اس کے اشاروں پر ناچتی رہی۔

وہ خاکوانی صاحب کی ہوس اور شہباز کی خواہش پوری کرنے کے لیے تیار کردی گئی تھی۔ شباب و شراب میں غرق خاکوانی نے اس کے جسم و روح کو بری طرح گھائل کیا۔ وہ ذبح ہوتی رہی، بوٹی بوٹی الگ ہوئی زخمی زخمی بدن...... مگر وہ زندہ تھی۔

ہر رات وہ اپنی عزت و ناموس کو اپنے کمرے میں دفن کر کے مختاری سے پری بنتی۔ ہوس کے پجاریوں کے لیے، ان کی خواہشوں کی تکمیل کے لیے، شہباز بے پناہ خوش تھی۔ مختاری نے جیسے اس کا کاروبار ہی چمکا دیا تھا، مگر وہ تو اندر تک ماند پڑ گئی تھی۔ اماوس کا چاند بن کر۔

شہباز اس پر خصوصی توجہ دیتی، پر مختاری کی روح مر چکی تھی۔

☆☆☆

یہ کیسی زندگی ہے۔ کیسی گھٹن ہے، بے بسی، بے چارگی، گناہوں سے لذت وصول کرنے والے، فاسق

بن جاتے ہیں۔ علاتے فخر کے ہر بار مختار کے
اندر اِک دراڑ پڑتی۔ اسے لگتا تھا اک دن یہ جسم بے
کھوکھلی عمارت ڈھے جائے گی۔

اسے نفرت ہونے لگی تھی۔ گناہ وثواب کے
چکروں میں پڑی تو...... خود کشی بھی تو گناہ عظیم
ہے۔ یہ...... یہ جو ہر رات بستر سجاتا ہے۔

یہاں روح بھی تو خود کشی کرتی ہے۔

اس کی ہر چیز بک گئی تھی، بس آنسو اپنے تھے،
زخموں پر مرہم رکھتے تھے۔ مختار کچھ ماہ میں ہی نیم
جان ہوگئی تھی۔ خود سے بھی نفرت محسوس ہوتی۔ پتا
نہیں چاچا نے اس سے کس ظلم کا بدلہ لیا تھا؟

شہناز کی وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی۔

مہینے دو مہینے بعد اِک نئی لڑکی آجاتی، سہمی ہوئی،
ڈری، ڈری کوئی گھنگروؤں کی تال پر ناچتی تو کوئی شہناز
کی انگلیوں پر۔

مختاری...... شہناز کے آگے ہاتھ جوڑتی، مار کھاتی،
سسکتی۔ مگر اس کی آواز شہناز کے حکم میں دب جاتی۔

اور یہ کاروبار چل رہا تھا۔ چل رہا ہے، اور جانے کب
تک چلتا رہے گا۔ گناہ کے، ہوس کے، عزتوں کے سودے
، جانے کب تک اس عورت کو فروخت کیا جاتا رہے گا۔

مختار بے بس و بے چارگی کی تصویر تھی۔

اس ذلت کی زندگی سے بہتر موت ہے۔ وہ
موت کی دعائیں کرتی۔ دن کو سجدے کرتی۔ معافیاں
تلافیاں کرتی، روتی، اور رات کو اپنی عزت وناموس کی
قیمت وصول کرتی۔

گھر، عزت، بیوی، شوہر، بچے۔

اس زندگی میں تو یہ ناممکنات میں سے تھے۔

انہونی بھی تو دنیا میں ہی ہوا کرتی ہے۔

زرق برق لباس پہنے وہ نووارد کی منتظر تھی۔ انتظار
کر رہی تھی یا بھیجی گئی تھی۔ ہار سنگھار، اس کے وجود کو
اژدھے کی طرح ڈس رہے تھے۔ اب وہ عادی ہوگئی
تھی۔ پر کٹ جائیں تو پنچھی اُڑان بھول جاتے ہیں
سمجھوتا شاید اسی کا نام ہے۔

مختار اپنی سوچوں میں غرق تھی کہ...... آنے والا
اندر آگیا اور دروازہ بند کر دیا۔

مختار نے اک نظر اسے دیکھا اور چمکیلا دوپٹہ اتار پھینکا
پھر اپنی قمیض اتارنے کو ہاتھ بڑھائے کہ انہونی ہوگئی۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا پھینکا ہوا، مسلا
ہوا زرتار آنچل اٹھا کر مختار کے سر پر ڈال دیا۔

مختار حیرت سے بے ہوش ہونے لگی۔

تقریبا 37 سالہ، اونچا لمبا، وجیہہ آدمی
تھا۔ مختار حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ نگاہیں
جھکائے کھڑا تھا۔ مؤدب سا،

''کون ہو تم؟ کیوں آئے ہو...... اگر آئے ہو
تو......''

''بس......'' اچانک ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر
مختار کو روک دیا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور
لہجہ نمناک۔ ''میں تمہیں چھوؤں گا بھی نہیں۔ بے فکر
رہو۔'' وہ کہتا ہوا آرام سے صوفے پر جا بیٹھا......

''ہاں تمہاری قیمت دے آیا ہوں۔''

''مگر...... یہ سب کیا ہے......'' مختار ابھی تک
ناسمجھی کی کیفیت میں تھی۔

''میں شاہ زمان ہوں۔ ایک شریف باکردار
انسان، تم سنو گی میری کہانی! میں اِک عام سا بندہ
ہوں۔'' اس نے مختار کی حیرتوں میں اضافہ کیا۔

''ہاں......'' وہ اثبات میں سر ہلا کر نیچے قالین پر
بیٹھ گئی۔

آج سے چار سال پہلے کی بات ہے۔

میری منگنی ہوئی تھی بہت اچھی نیک شریف
لڑکی سے سائرہ نام تھا اس کا۔ شادی کچھ ماہ بعد ہونی
تھی، اسی دوران ایک رات ڈاکو سائرہ کے گھر آئے۔
وہ ڈکیتی کے ساتھ ساتھ سائرہ کو بھی بے آبرو کر گئے۔
سائرہ نے دل برداشتہ ہو کر خود کشی کر لی۔

تب سے میرا دل بے چین ہے۔

مجھے معلوم ہے تم معصوم ہو۔ تمہیں پہلی بار دیکھا تو
سمجھ گیا تھا۔ تم زبردستی لائی گئی ہو۔ تمہیں ایک بار شہناز
کے ساتھ بازار میں دیکھا تھا۔ تمہاری آنکھوں کی بے
بسی اور بے چارگی نے اکسایا کہ تمہیں یہاں سے لے
جاؤں۔ تمہارے بارے میں معلومات اکٹھی کیں۔
بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں تم سے

شادی کر کے تمہیں اس دوزخ سے نکالوں گا۔''
شادی ...... مختار حیرتوں میں غرق تھی۔ تو کیا سجدوں کی قبولیت کا دعا کا راستہ مل گیا۔ مختاریاں دیکھے سپنوں میں گم ہونے لگی۔ تب مختار نے سسکیاں بھرتے ہوئے اسے اپنی کہانی سنا ڈالی۔
''میں تو کب سے زندان میں ہوں۔
مجھے نہیں پتا باہر کی تازہ ہوا کیسی ہے۔ وہ ہوا جس میں کبھی میں آزادی سے سانس لیتی تھی۔ اپنی زندگی جیتی تھی۔ اب تو جینے کی آرزو نہیں، نہیں ...... نہیں ...... میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔
میں تو سر سے پاؤں تک غلاظت کی گٹھری ہوں۔ گندگی سے میرا جسم لتھڑا ہوا ہے۔ گناہوں کی چادر میرا لباس ہے۔''
مختاریاں کے سامنے زمین پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دے کر بُری طرح بلک رہی تھی۔ اس کی آس وامید کے سارے پنچھی اڑ چکے تھے۔ اسے اب صرف موت کی تمنا تھی۔ شریفانہ زندگی گزارنا اِک انہونا سپنا ہی تو تھا۔ مختار کے آنسو، شاہ زمان کو پریشان کر رہے تھے۔ وہ اسے چپ کرانا نہیں چاہتا تھا ...... چاہتا تھا کہ اس کے اندر کا سارا غبار آج نکل جائے۔ ابھی تک حیرتوں میں غرق تھی کہ شاہ زمان آہستہ سے باہر چلا گیا۔
بیڈ پر خود کو گرا کر مختاریاں انوکھی دنیا میں محوِ سفر تھی۔

......☆☆☆......

اگلی رات وہ پھر آیا ......
''تم میرے ساتھ جانا چاہتی ہو؟''
وہ اس کی ٹھوڑی اٹھا کر اس کی بھیگی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔
''ہاں ......'' وہ تھمے انداز میں بولی۔ ''مگر شہناز نہیں مانے گی، میں وہ پری ہوں جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں۔'' ذہنم ہونٹوں پر آنسوؤں کا ذائقہ محسوس کر کے بولی۔
''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ آج کے بعد خود کو میری امانت سمجھ کر وقت گزارو۔''
''امانت! صاحب جی ...... یہاں بیوپاری آتے ہیں۔ کیسی امانت اور کیسی خیانت۔'' مختار کے لہجے میں عجیب سوز بھری تڑپ تھی۔
جس نے شاہ زمان کو اندر تک سلگا دیا تھا۔
''میں نے شہناز سے کہہ دیا ہے آج کے بعد تم ہر رات میرے لیے بجوگی، میں نے ایک ماہ کی قیمت ادا کر دی ہے۔ اس دوران میں کوشش کروں گا کہ تمہیں یہاں سے لے جانے قیمت حاصل کر کے تمہیں حاصل کر لوں ہمیشہ کے لیے۔'' صداقت وسچائی شاہ زمان کے لہجے سے عیاں تھی۔ مختاری پر عجیب کیفیت طاری تھی۔
''مجھے یقین نہیں آرہا صاحب جی۔ کیا واقعی میں اس قید خانے سے باہر جا سکتی ہوں۔ آزادی کا سانس لے سکتی ہوں'' وہ سسکی بھر کر بولی۔ تو شاہ زمان یکدم کھڑا ہو گیا۔ اور پوری دیانتداری سے بولا۔
''یہ وعدہ ہے شاہ زمان کا تم سے۔'' اس نے مختاریکو کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔
''اگر میں سائرہ کو نہیں بچا سکا، تو میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔''
مختار کے چہرے پر یکدم وہ مسکراہٹ آگئی جو ایک کنواری لڑکی کی کلی ضامن ہوتی ہے۔ مگر اسے اپنے اندر کی غلاظت سے گھن آرہی تھی۔ وہ پاکیزہ نہ رہی تھی۔ چار ماہ میں وہ کلی سے کھلا ہوا پھول بن چکی تھی۔
یہ تو کوئی شہزادہ تھا جو سنڈریلا کی آنکھوں سے سوئیاں نکالنے آگیا تھا۔
''میں خود کو بیچ کر بھی تمہاری قیمت چکاؤں گا۔''
''آخر مجھ پر اتنی عنایت کیوں۔ جس کا میں تو'' وہ سر جھکا کر جملہ پورا نہ کر سکی ...... آنسو شدت سے بہنے لگے تھے۔
''اس کی وجہ میں بتا چکا ہوں۔ خدا جس کے دل میں چاہے نرمی پیدا کر سکتا ہے۔ ہر کسی کا دل اس کا اہل نہیں ہوتا۔ بس یہ دل کے معاملے ہیں۔''
''یہاں اور بھی لڑکیاں ہیں۔ ہزاروں آتی ہیں۔ اور ستم قیامت تک جاری رہے گا۔''
''مجھے کسی اور سے کچھ نہیں لینا دینا۔ بس ...... بحث بند کرو۔ میں جارہا ہوں۔ تم کسی سے ان باتوں کا ذکر نہیں کرنا۔ میں کل رات پھر آؤں گا۔'' شاہ زمان نے اپنی چادر اٹھائی اور کندھوں پر ڈالی کمرے کے

وسط میں کھڑی مختاریا اپنی قسمت کے اس پھیر پر انگشت بدنداں تھی۔ شاہ زمان باہر چلا گیا۔ اور وہ حیرت واستعجاب سے بت بنی کھڑی تھی۔

یہ کیسے...... کب، کیونکر ممکن ہے۔ کہ وہ شہناز کی قید سے رہائی پاسکتی ہے۔ وہ تو شہناز کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی۔ کیسے ذبح کرے گی وہ اسے۔ وہ تو بکاؤ مال تھی۔ قیمت ادا کردی گئی تھی اس کی۔

آنسو تواتر سے اس کے گالوں کو بھگو رہے تھے۔ دروازے پر کنڈی لگا کر اس نے غسل خانے کا رُخ کیا۔ جیسے غسل کرنے سے اس پر لگی غلاظتیں دھل رہی تھیں۔ اب جائے نماز اشکوں سے تر ہونے لگی تھی۔

اک مجبور بے بس کے آنسو، کسی بے کس کے بے مول موتی۔

گھنٹے بعد اسے کہیں قرار آیا۔ تو نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔

اب کشمکش کے ساتھ کسی قدر سکون تھا۔ وہ گہری نیند کی وادیوں میں اُتر گئی۔

......☆☆☆......

کئی دنوں سے وہ بخار میں مبتلا تھی۔

شاہ زمان تین راتوں سے نہ آیا تھا۔ مختار کے اندر عجب بے بسی تھی۔

کہیں وہ اسے مذاق میں، دھوکا تو نہیں دے گیا؟ ذہنی خلفشار نے اسے اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔

بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

لاڈو، نیلم چمپا اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں۔

''اگر وہ پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ دے تو قرار آئے۔ مگر دل کیا کیا کرتا۔ آنکھیں تھیں کہ در پر لگی تھیں۔

دو دن بعد وہ آ گیا۔ دل وجاں کو قرار سا آ گیا۔ مختاری کی مردہ آنکھوں میں زندگی کی جوت جاگ گئی تھی۔ رات کا حُسن بھی جاگ گیا تھا۔ اس کی زردی مائل رنگت میں گلابیت بھرنے لگی۔ کمزوری کے سبب اٹھ تو گئی۔ شہناز بھی اس کے ہمراہ تھی۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ کمر پر اک ادا سے ہاتھ رکھ کر جتانے لگی۔

''بس کچھ دیر باتیں کر کے چلا جاؤں گا۔ شاہ زمان نے دوٹوک بات کی تو شہناز ٹھیک ہے کہہ کر باہر نکل گئی۔

مختاریا اٹھ کر بیٹھنے لگی تو اس نے روک دیا۔ اور پھر جب اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس کے سارے گُر کام آ گئے۔

''میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔'' وہ غیر حاضری کا سبب بتانے لگا۔

''اور ہم جان سے......'' وہ غم سے چُور ہو کر بولی تو لہجہ ازخود اشک بار ہو گیا۔

''مجھ پہ اعتبار نہیں؟'' شاہ زمان بھیگے نین مسلتے ہوئے بولا۔

''خود پہ اختیار نہیں۔'' مختاری بے اختیار بولی۔

''آہ...... جان لے لوگی میری۔'' شاہ زمان مسکرا کر بولا اور جیب سے ہیرے کی انگوٹھی نکالی اور خاموشی سے اس کا ہاتھ تھام کر انگلی میں پہنا دی۔

''جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ کل آؤں تو تر و تازہ کھلتے گلاب جیسی لگو۔''

''کوشش کروں گی۔'' شاہ زمان کی بات پہ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

''کوشش نہیں وعدہ......'' اس نے چوڑی ہتھیلی سامنے پھیلائی تو مختاری نے ہلا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ مختاری کا ہاتھ شاہ زمان کے ہاتھ کی گرم سے پگھلنے لگا۔

شرم نے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔ کئی مردوں کے ساتھ راتیں گزارنے کے بعد ناموس کے لٹنے کے باوجود اس کی فطری شرم وحیا پوری آب وتاب کے ساتھ عود کر چکی تھی۔ یہ دیکھ کر شاہ زمان کے دل کی دنیا مزید لٹ گئی۔ وہ جلدی سے ہاتھ چھڑا کر باہر چلا گیا۔

......☆☆☆......

مختار کے چہرے کی چمک دمک اور پھرتی نے شہناز کے کان کھڑے کر دیے۔

بھلا شاہ زمان جیسے لوگ کیا مختار کی قیمت ادا کر سکتے ہیں۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ اسے سبز باغ دکھا کر اپنی ہوس پوری کر رہا ہے۔ اور مختاری اس کی ان باتوں میں الجھ کر بے وقوف بن رہی ہے۔''

تو وقت نے فیصلہ کرنا تھا کون بے وقوف بن رہا ہے۔
ٹھٹکتی ہوئی مختاری کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
''کل اس کی آخری رات ہے۔ حساب کتاب ختم۔ اگلا معاملہ سیٹھ رجب امین کے ساتھ طے ہے۔ سنا تم نے۔''
شہناز نے حسب عادت غصے اور حتمی انداز میں بات کی تو مختاری کا پورا جسم کانپ اٹھا۔ یکدم وہ شہناز کے پیر پکڑ کر رونے لگی۔
''نہ...... نہ باجی اب میں کسی کے ساتھ نہ جاؤں گی۔ مجھے بخش دو، خدا کے لیے۔'' مختاری کی آواز میں آنسوؤں کی یورش تھی۔ شہناز مزید کھٹکی۔ معاملہ گھمبیر ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس نے یکا یک اپنے پیر کھینچے۔
''کیوں اب کیا ہوا ہے؟'' اس نے مختاری کی تھوڑی اٹھا کر اس کی بھیگی آنکھوں میں جھانکا
''مجھے تم سے کوئی بحث نہیں کرنی۔ جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔''
شہناز نے سختی سے کہا۔ تو مختاری روتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔
اس رات شاہ زمان قدرے پریشان ہوا۔
''میں کر رہا ہوں روپوں کا انتظام۔ ہو جائے گا ناں......'' وہ اسے تسلیاں دیتا رہا، جو مختاری کی نزدیک بہت اہم تھیں۔
شہناز جیسی گھاگ عورت کا شاہ زمان سے کیا مقابلہ؟
کاش شاہ زمان بھی انہی مردوں کی طرح ہوتا۔ اپنا حق وصول کرتا اور چلا جاتا۔ اسے آس نہ دلاتا۔ نہ روشنی دکھاتا۔ نہ سپنے دکھاتا۔ سمجھوتا تو وہ کر چکی تھی۔ اب جیسے ناامیدی نے جسم و جاں میں پنجے گاڑ دیے تھے۔ شہناز کسی صورت اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔
نیلم، فیروزہ اور لاڈلی اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں۔ مگر مختاری کا انکار اقرار میں نہ بدل رہا تھا۔ مر جاؤں گی مگر اب اپنے جسم کا سودا نہ کروں گی۔
اس عشق کی مشک یار خوشبو پورے ایوانوں اور برجوں میں پھیل چکی تھی۔ اس کے انکار کی تیز آندھی میں شہناز بگولوں کی طرح چکرا رہی تھی۔
اگلے دن شہناز نے مختاری کو بلایا۔
وہ انتہائی ناقدانہ نظروں سے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لے رہی تھی۔
''اپنی قیمت جانتی ہے'' شہناز اس کے گرد چکر کاٹ کر بولی۔
محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔'' مختاری مضبوط لہجے میں بولی۔
''کتنا جانتی ہے تو اُسے'' اس کے انداز میں شعلوں کی لپک تھی۔
''بس ایک ہی نظر میں پہچان گئی۔'' مختاری نظریں جھکا کر بولی۔
''محبت اور اعتبار ہمارے جیسوں کے لیے نہیں بنے پری۔ تو مجھے سختی پر مجبور نہ کر۔'' شہناز نے آخر کار درست انداز اختیار کیا۔
''وہ قیمت ادا کردے گا۔ مجھے ذلت و رسوائی کے بازار سے لے جائے گا۔ میری رگوں میں شریف والدین کا خون ہے۔ آپ نے میرے پر کاٹ کر اس قید خانے میں اپنی مَن مانی کے لیے رکھا۔ میں تھوکتی ہوں اس لعنتی زندگی پر۔ خدا میرے گناہ معاف کرے۔'' مختاری سسک اٹھی۔
ہا......ہا......ہا......شہناز کا مضبوط بلند و بانگ قہقہہ برآمد ہوا، اور وہ تمسخر سے بولی۔
اب تُو اس حسین سنہری پنجرے سے باہر نہیں جاسکتی۔ تیرا جینا مرنا یہیں ہے۔ جیسا کہوں ویسا کرنا پڑے گا۔ ورنہ کھال ادھڑوا کے رکھ دوں گی۔ آجاتے ہیں محبتوں کے نام نہاد سفیر۔ اس کو بھی دیکھ لوں گی۔ ورغلایا ہے اس نے تجھے۔ دیکھ میری بات غور سے سن۔'' ایکا ایکی شہناز نے پینترا بدلا اور پیار سے بولی۔
''تُو سیٹھ کو خوش کردے۔ میں تجھے مالا مال کردوں گی۔ بڑی موٹی اسامی ہے۔ وہ اسے پاس بٹھا کر چاشنی بھرے لہجے میں بولی۔ تو تڑپ کر مختاری نے شہناز کی طرف دیکھا اور بھیگے لہجے میں بولی۔
''تجھے مجھ پر ترس نہیں آتا؟''
نہیں...... ہماری، زندگیوں میں ترس، ہمدردی

کے نام خارج ہیں۔ تو جا اب کل رات تیار رہنا، ورنہ...... انکار کی صورت میں اپنے انجام کے لیے تیار رہنا۔'' شہناز نے حتمی اعلان کر کے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

......☆☆☆......

اس رات شاہ زمان نہ آیا۔ مختاری بخار میں تپ رہی تھی۔ مسلسل سوچوں نے دماغ پر گہرا اثر کیا تھا۔ مختاری کی لیے وہ رات بہت بھاری تھی۔ سوچتے سوچتے دماغ کی صلاحیتیں سلب ہونے لگیں۔ وہ نیم جاں ہو رہی تھی۔ صبح جب آٹھ بجے تک مختاری نہ جاگی، تو نیلم اسے جگانے آئی۔

مختاری کی ہونٹوں کے کناروں سے نکلتی خون کی پتلی لکیر نے نیلم کو بدحواس کر دیا۔ وہ چلاتے ہوئے شہناز کے پاس آئی۔

شہناز بھی مختل حواس لیے اس کے کمرے میں آئی۔ مختاری کی مٹھی میں دبا خط شہناز نے آہستگی سے نکالا اور دھڑکنوں کو سنبھالتی پڑھنے لگی۔

''میرا جینا مرنا اگر یہیں ہے تو میں اس ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گی۔ شاہ زمان میں جیت گئی۔ مجھے معاف کر دینا۔ تمہیں پانے کے بعد میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ اب مجھے تمہارے سوا کوئی نہ چھوئے گا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس گندگی اور غلاظت کے ماحول سے دور جا رہی ہوں۔ تمہاری دی ہوئی انگوٹھی کا ہیرا میں نے نگل لیا ہے۔ خدا میری مغفرت کرے۔'' ''مختاری''

یہ سب پڑھ کر شہناز کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ گھبرا گئی۔ سبھی کے چہروں پر خوف تھا، وہ ہڑبڑا کر بولی۔

''اس کے کفن دفن کا انتظام کر نیلم۔''

وہ لرزتے قدموں اپنے کمرے آ گئی۔ کہ اسے شاہ زمان کے آنے کی اطلاع ملی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے سامنے تھا۔

''میں مختاری کی قیمت لے آیا ہوں۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

شہناز نے خود کو کبھی اس سے پہلے بے بس محسوس نہ کیا تھا، جتنا اس وقت، اس کا بجھا بجھا چہرہ دیکھ کر شاہ زمان ٹھٹکا۔

جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہو۔

اس کا دل وسوسوں میں گھرنے لگا تھا۔

شہناز کو کچھ نہ سوجھا تو اس نے مختاری کا لکھا پرچہ شاہ زمان کو تھما دیا۔ وہ جیسے جیسے پڑھتا گیا۔ رنگت فق ہوئی۔

وہ تیزی سے مختاری کے کمرے کی جانب بھاگا۔ اس کے وسوسوں اور واہموں کی تصدیق ہو چکی تھی۔

اس کے مردہ جسم اور پرسکون چہرے کو دیکھ کر تڑپ تڑپ کر رونے لگا، مختاری نے اس کی محبت کی لاج رکھ لی تھی۔ شاہ زمان بری طرح رو رہا تھا۔

''یہ کیا کر دیا تم نے، میں آ ہی رہا تھا۔ کتنی بزدل نکلی ہو تم۔ مارا گیا ہے تمہیں، قتل کیا گیا ہے۔ تم خود نہیں مری ہو۔ تمہیں مرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ہاں...... پرچہ کٹواؤں گا میں شہناز کے خلاف۔''

''مگر اس سے کیا ہوگا۔ تم واپس تو نہیں آ سکتیں۔'' زمین پر بیٹھا وہ بک بک کر رہا تھا۔ پھر ہزاروں کے کئی نوٹ شہناز پر اچھال دیے۔ جو شہناز پر بارش کر رہے تھے، وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

سب اس کے گرد کھڑے تھے۔ محبت کا ماتم ہو رہا تھا۔ عشق بین کر رہا تھا۔ شاہ زمان کبھی مختار کے بے جان جسم کو دیکھتا تو کبھی شہناز کو۔

نیلم، لاڈلی، چمپا، فیروزہ بھی سسکیاں بھر رہی تھیں۔

ایک آنسو شہناز جیسی کٹھور دل رکھنے والی کی آنکھ سے بھی نکل آیا۔

مختار کی جواں مردی پر۔

اس وقت بھی وہ خود کو بے قصور خیال کر رہی تھی۔

یہ آنسو تو دنیا داری کے لیے تھا۔ شہناز کو کب پروا ہو سکتی تھی۔

کمرے میں موجود سسکیوں سے گھبرا کر اس نے نیلم کو باہر آنے کا اشارہ کیا تھا کہ مختاری کو سفر آخرت کے لیے تیار کیا جا سکے، اور یہ سب کرنا تو لازمی تھا۔

......☆☆☆......

سچی کہانیاں کا وہ سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

اجنبی مسیحا!

صداقت حسین ساجد

شورکوٹ سٹی سے، اُس پُراسرار شخص کی داستان جو اپنی دولت کے درست مصرف سے آشنا تھا

لازمی تھا۔

......☆☆☆......

معروف فوج داری وکیل رانا گلزار نے ناشتے کے دوران میں اخبار کے پہلے صفحے پر نظر دوڑاتے ہوئے افسوس سے 'چچ...... چچ' کی آوازیں نکالیں اور سر اوپر کیے بغیر مزید کوفی لینے کے لیے اپنا خالی کپ ملازمہ کی طرف بڑھایا۔ ملازمہ ناہید نے پاس آ کر اس کے کپ میں کوفی انڈیلی۔ اس دوران میں اس کی نظر اخبار کی ایک شہ سرخی پر پڑ گئی اور اسے گویا اپنا نامکمل مباحثہ ایک بار پھر شروع کرنے کا بہانہ مل گیا۔

''یہ سرخی دیکھی آپ نے...... جناب!''

اس نے ہاتھ آگے کر کے اس نمایاں سرخی پر اپنی خوب صورت مخروطی انگلی رکھی۔ رانا گلزار نے وہ سرخی پڑھی۔

''پراسرار، خدا ترس اور سخی ایک بار پھر حرکت میں آ گیا۔''

ناہید اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ اس نامعلوم شخص نے ایک بار پھر پانچ خیراتی اداروں کو منی آرڈر کے ذریعے دس دس لاکھ روپے دیے ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ رانا گلزار کی طرف دیکھ کر مشفقانہ انداز میں مسکرائی۔

''دیکھا...... جناب! میں ٹھیک کہتی ہوں کہ اس دنیا میں اچھے لوگ بہر حال تعداد میں زیادہ ہیں...... نیکی بدی پر غالب ہے۔''

وہ خاموش ہوئی، تو رانا گلزار نے بدمزگی کی حالت میں تیزی سے وہ خبر پڑھی۔ تاہم اس کی بدمزگی کی وجہ ملازمہ ناہید کی بحث اور دلائل نہیں تھے، جسے وہ اکثر سمجھایا کرتا تھا کہ نیکی اور بدی اس دنیا کے ترازو کے دو پلڑے ہیں اور اکثر اس کے بیچ میں توازن قائم رہتا ہے۔ یوں دنیا کا نظام چلتا ہے۔ دونوں طاقتیں لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں ہی اس دنیا کا اہم حصہ ہیں۔ یوں شاید رانا گلزار اپنے پیشے کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا، کیوں کہ وہ ایسے ملزموں کے وکیل صفائی کی حیثیت سے مقدمات لڑنے میں خصوصی شہرت رکھتا تھا جن کے بارے میں قوی تاثر پایا جاتا تھا کہ وہ واقعی مجرم ہیں اور انھیں ضرور سزا ہو جائے گی، لیکن رانا گلزار انھیں صاف بچا لیتا تھا۔

وہ کوفی کا کپ میز پر رکھتے ہوئے ناہید سے مخاطب ہوا۔
"تمھیں کبھی یہ خیال آیا کہ یہ پراسرار خدا ترس اور سخی انسان جس کی نیکی اور دریادلی کی تم اتنی معترف ہو، حقیقت میں شاید کچھ اور مقاصد رکھتا ہو؟ اس کی فراخ دلانہ خیرات کا مقصد محض غریبوں کی مدد کرنا نہ

ہو؟''

''کچھ اور مقاصد...... !!!'' ناہید نے حیرت سے دہرایا۔ ''یوں رقم خرچ کرنے کے اور مقاصد بھلا کیا ہو سکتے ہیں؟''

''شاید اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو...... شاید کوئی احساس جرم ہو، جو اسے یوں رقم لٹانے پر مجبور کرتا ہو...... یا یہ بھی تو ہو سکتا ہے......'' گلزار نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''کیا یہ ہو سکتا ہے؟''

''شاید یوں وہ اصل میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہو۔''

''آپ منفی انداز میں ہی کیوں سوچتے ہیں؟'' ناہید نے ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہاں منفی انداز میں سوچ لیا؟''

''یہ کوئی نیک انسان بھی تو ہو سکتا ہے، جو واقعی خلوص دل سے غریبوں کی مدد کرنا چاہتا ہو...... یہ ان خبیثوں جیسا نہیں ہے......''

''کن خبیثوں کی بات کر رہی ہو؟''

اس نے ایک اور خبر کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ نے یہ خبر پڑھی...... اس میں ایک خاتون اور اس کے بچوں کے سفاکانہ قتل کے بارے میں بتایا گیا ہے۔''

اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور رانا گلزار کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔

''میری تو خواہش ہے کہ پولیس اگر اس نوجوان خاتون اور اس کے معصوم بچوں کے قاتل کو گرفتار کر لے، تو اسے وہ بھرے بازار میں کھڑا کر کے گولی مار دیں اور پھر اس کی لاش کو یوں نذرِ آتش کریں کہ جس طرح سے ہندو لوگ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ پولیس جس شخص کو پکڑے...... وہ اصل میں بے گناہ ہو؟'' رانا گلزار نرمی سے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''قانون کے مطابق جب تک کسی کا جرم ثابت نہ ہو جائے، اس وقت تک اسے بے گناہ ہی سمجھا جاتا ہے...... بے گناہوں کو سزا سے بچانے کے لیے ہی شک کا فائدہ دینے کا قانون بنایا گیا ہے...... سزا صرف اسی وقت دی جاتی ہے جب ہر شک وشبہ سے بالاتر ہو کر جرم ثابت ہو جائے...... ورنہ! ان کے شہری اور انسانی حقوق متاثر ہوتے ہیں...... انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔''

''آپ کون سے انسانی حقوق کی بات کر رہے ہیں؟'' ناہید کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''یہی کہ کچھ انسانوں کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ دوسرے انسانوں کو قتل کر سکیں۔ خواتین کی عزت لوٹ سکیں۔ اکثر مجرم جب پکڑے جاتے ہیں، تو سب کو پتا ہوتا ہے کہ یہ مجرم ہیں، لیکن چند شاطر وکیل عدالت میں ایسے ایسے چکر چلاتے ہیں۔ ایسے ایسے قانونی نقطے نکالتے ہیں۔ حقائق کو یوں توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں کہ عدالت مجبور ہو کر انھیں رہا کر دیتی ہے۔''

پھر گویا اچانک اسے یاد آیا کہ اس کا مالک بھی تو ایک وکیل ہے، اس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

''معاف کیجیے گا...... جناب! میرا خیال ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی بولنے لگی ہوں۔''

رانا گلزار بے پروائی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ وہ یہ بات پہلی بار نہیں سن رہا تھا۔ بارہا اس سے یہ بات کہی گئی تھی۔ سب سے زیادہ بار تو اس نے یہ بات اپنی بیوی کے منہ سے سنی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو کوئی عرصہ پہلے طلاق دے چکا تھا۔ وہ تو جانے کتنی بار اس کی پیشہ ورانہ قابلیت پر بڑی بے رحمانہ تنقید کر چکی تھی۔ وہ موت کے منہ میں جاتے ہوئے مجرموں کو قانون کی گرفت سے یوں نکال لیتا تھا جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ اسے اس کی بیوی اس کی قابلیت نہیں بلکہ خباثت اور شیطانیت قرار دیتی تھی۔ وہ اس کی کمائی کو حرام کی کمائی سمجھتی تھی۔ اپنے بیٹے کا خرچہ وہ باقاعدگی سے بھیج رہا تھا اور اسے اس کی سابقہ بیوی نے کبھی بھی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔

وہ ناہید کو خجالت زدہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں تمھیں ایک بات بتاؤں...... اگر تمھارا یہ پراسرار سخی کبھی سامنے آ گیا اور معلوم ہوا کہ وہ اصل میں

ایک ایسا شقی القلب قاتل ہے، جو بڑی سفاکی سے کئی افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے، تو ضرورت پڑنے پر میں عدالت میں اس کی وکالت کروں گا ...... اگر اس نے میری خدمات حاصل کرنا چاہیں، تو میں اس کا بھی وکیل صفائی بن جاؤں گا۔''

☆......☆......☆

رانا گلزار ایک پوش علاقے کی ایک شان دار عمارت میں واقع اپنے آراستہ و پیراستہ دفتر میں داخل ہوا، تو اس کی سیکرٹری نے فون پر موصول ہونے والے ایک پیغام کو تحریری صورت میں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ شخص متوقع مؤکل لگتا ہے۔ غالباً اسے آپ کی خدمات کی ضرورت ہے۔ پولیس نے اس کے ساتھی کو آج اس واردات کے الزام میں گرفتار کیا ہے، جو پچھلی رات کو ہوئی تھی۔ جس میں جمیل خان کی بیوی اور دو بچوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ بچوں کی عمریں سات اور چار سال تھیں۔''

رانا گلزار نے کاغذ کو دیکھا۔ فون کرنے والے کا نام جانا پہچانا تھا۔ اسے اپنے ساتھی منظور حسین کے لیے اس کی قانونی خدمات کی ضرورت تھی۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود گلزار کو یاد نہ آیا کہ وہ اس نام کے کسی شخص کو جانتا ہے۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور خود کو سمجھایا کہ وہ یقیناً ایک کامیاب وکیل صفائی ہے، لیکن شہر کے سارے مجرموں سے واقف تو نہیں ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے دل ہی دل میں تصحیح کہ اسے سوچتے وقت بھی ان کے لیے 'مبینہ مجرموں' کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے، کیوں کہ اس کے اپنے فلسفے کے مطابق جب تک کسی کو تمام شکوک و شبہات سے بالاتر ہو کر مجرم ثابت نہ کر دیا جائے، اس وقت تک اسے مجرم نہیں کہا جا سکتا۔

یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنی سیکرٹری مس نشا کو دیکھ کر سر ہلایا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''ٹھیک ہے...... میں اس سے رابطہ کر لوں گا۔''

☆......☆......☆

رانا گلزار نے اپنے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھے منظور حسین کو دیکھا اور پھر اپنے آگے رکھی فائل کا جائزہ لیا۔ پھر کہا۔

''مجھے امید نہیں ہے کہ جج تمھاری ضمانت منظور کر لے گا۔''

''وہ کیوں......''

''تمھیں اس بات کا علم نہیں ہے؟''

''کس بات کا؟''

''تم کس طرح کے ہو؟''

''مجھے تو نہیں پتا، آپ بتا دیں۔''

''بڑے بھولے بن رہے ہو...... تمھارا ریکارڈ خاصا شرم ناک ہے۔ تم اٹھارہ بار گرفتار ہوئے ہو۔ دو بار تمھیں سزا ملی ہے۔ ہر طرح کے الزام میں تم گرفتار ہو چکے ہو۔ غیر قانونی اشیا اور منشیات فروشی، زبردستی لوگوں کے گھروں میں داخل ہونے اور قتل کی کوشش تک کے الزامات ماضی میں تم پر لگ چکے ہیں۔ اس رکارڈ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ضمانت ہونا مشکل ہے۔''

''کیوں مشکل ہے بھئی؟'' منظور حسین نے قدرے جارحانہ سے لہجے میں کہا۔ ''میں اس شہر میں پیدا ہوا تھا، میرے تمام کاروباری رابطے یہیں ہیں۔ جن جرائم میں مجھے سزا ہوئی تھی، وہ معمولی قسم کے تھے...... میرا مطلب سمجھ رہے ہیں ناں!''

اس نے رانا گلزار کو آنکھ ماری۔ پھر بولا۔

''میں سب کچھ چھوڑ کر کہیں بھاگ تھوڑا ہی جاؤں گا۔''

پھر وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''اس کے علاوہ وہ میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ میرے پاس جائے وقوعہ سے اپنی غیر حاضری کا ایسا ٹھوس ثبوت موجود ہے جسے کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا۔''

اس ثبوت کے لیے اس نے ایک فحش سی تشبیہ بھی استعمال کی۔ پھر بولا۔

''جس وقت جمیل خان کی بیوی کو اس کے اعمال کی سزا ملی، اس وقت میں شہر کے ایک دور دراز حصے میں موجود تھا۔ دو خواتین اس کی حلفیہ گواہی دینے کے

کو تیار ہیں۔''

وہ خاموش ہوا، تو کئی لمحوں تک رانا گلزار اپنے متوقع مؤکل کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''ہمیں ذرا کھل کر بات کرنا ہوگی۔ تمھیں پتا ہے کہ پولیس نے تمھارا نام قرعہ اندازی میں نکال کر نہیں پکڑا۔ سب کو پتا ہے کہ مقتولہ کا شوہر ایک طرح سے تمھارا کاروباری حریف تھا۔ وہ دوسری مافیا کا بندہ تھا۔ وہ افغانی تھا، لیکن دو تین سال پہلے اس نے پاکستانی شہریت حاصل کر لی تھی۔ پولیس کے بقول منشیات کی تجارت میں وہ تمھارے مقابلے میں کام شروع کر کے تمھیں کروڑوں کا نقصان پہنچا رہا تھا۔ اس کے علاوہ پولیس کے پاس ایک گواہ بھی موجود ہے۔''

''گواہ! کون سا گواہ اور کس چیز کا گواہ؟''

''جس نے تمھیں اس عمارت میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ جہاں مقتولہ رہائش پذیر تھی۔''

''یہ...... یہ...... یہ سب بکواس ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی مجھے اس وقت دیکھتا۔''

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گیا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ جوش میں سب کچھ نا چاہتے ہوئے بھی بتا گیا تھا، لیکن اس نے خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ جیل کے اس ملاقاتیوں والے کمرے میں اس وقت ان دونوں کے سوا کوئی اور موجود نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر وہ خباثت بھرا ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

''یہ بات میرے اور صرف آپ کے درمیان میں رہنی چاہیے۔''

''وکیل اور مؤکل، ڈاکٹر اور مریض کے درمیان میں ہر بات راز ہی ہوتی ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔'' منظور حسین نے طمانیت سے سر ہلایا اور بولا۔ ''جب میں اس عمارت میں داخل ہوا تھا، تو لابی اور لفٹ خالی تھیں اور میری واپسی پچھلی طرف کے ہنگامی زینے کے راستے سے ہوئی تھی...... یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی نے مجھے اندر جاتے ہوئے دیکھا ہو؟''

''خیر! تمھاری اس بات سے میرا ایک شک تو یقین میں بدل گیا......''

''کک...... کک...... کون سا شک؟''

''وہ شک یہ تھا کہ قتل تم نے ہی کیا تھا۔'' رانا گلزار خشک لہجے میں بولا۔ ''اب میں تم سے صرف دو سوال اور پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''جی...... پوچھیے!''

''ان میں سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''کک...... کک...... کیسا کیوں کیا؟'' منظور نے حیرت سے منہ پھاڑتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ تم نے جمیل خان کی بیوی اور اس کے کم سن بچوں کو کیوں قتل کیا؟ ان کا تو منشیات کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا...... انھیں قتل کر کے تمھیں کیا فائدہ حاصل ہوا؟''

''میں نے جمیل خان کو یہ سبق دیا ہے...... وہ یہی زبان سمجھتا ہے...... یہ افغانی خود بھی تو یہی کرتے ہیں...... چناں چہ میں نے سوچا کہ آج کل جب کہ جمیل خان ایک بہت بڑی کھیپ کی خریداری کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے، تو کیوں ناں اسے اس کی زبان میں سبق دے دیا جائے۔''

پھر اس نے انگلی میں دبی سگریٹ کا ایک کش لیا اور طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

''جمیل خان کو اب صحیح طور پر پتا چلے گا کہ مجھ سے الجھنے والے کو کتنا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔''

''ٹھیک ہے!'' رانا گلزار نے سر ہلایا۔ ''میرا دوسرا سوال میری فیس کے بارے میں ہے...... کیا تم میری فیس ادا کرنے کے قابل ہو؟ تم نے کسی سے فرمائش کی تھی کہ شہر کے بہترین وکیل صفائی سے تمھارا رابطہ کرایا جائے...... تمھیں پتا ہی ہوگا کہ بہترین چیزیں سستی اور آسانی سے نہیں ملتیں۔''

''ہاں...... مجھے پتا ہے۔'' منظور نے قہقہہ لگایا۔ ''آپ فیس بتایئے۔''

''پچاس لاکھ تو میں پیشگی لوں گا...... باقی مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد پچاس لاکھ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے...... کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' منظور

نے فیس سن کر ذرا بھی پریشان ہوئے بغیر کہا۔ ''میں برے وقت کے بارے میں جانتا ہوں کہ یہ بھی بتا کر نہیں آتا اور ویسے بھی ہمارا جو دھندا ہے ...... اس میں تو پتا ہی نہیں چلتا، اس لیے میں اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں ...... میں کچھ رقم ایک طرف رکھتا رہا ہوں ...... وہ اچھی خاصی رقم ہے ...... آپ کی فیس ادا کرنے کے بعد بھی میرے پاس اچھی خاصی رقم بچ جائے گی۔''

''ہوں ں ں!'' رانا گلزار نے ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمھارا دردِ سر ہے۔''

''اور ہاں ...... مجھے ایک بات یاد آ گئی۔''

''کیا؟''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے ...... کچھ عرصہ پہلے آپ نے علی نواز نامی ایک شخص کا مقدمہ لڑا تھا ...... اس پر تشدد اور قتل کا الزام تھا ...... عام خیال یہی تھا کہ اسے موت کی سزا ہو جائے گی، لیکن آپ نے اسے بچا لیا تھا۔''

''تمھیں اس مقدمہ کے بارے میں کہاں سے پتا چلا؟''

''اصل میں علی نواز میرا دوست تھا، اس لیے میں اس مقدمے کی تفصیل میں دل چسپی لیتا رہا تھا ...... آپ نے اس کی رہائی کے بعد اس کے لیے کچھ ایسے انتظامات کیے تھے کہ بعد میں خفیہ پولیس والے اسے کسی اور چکر میں نہ دھر لیں ...... آپ نے اس کے لیے نئے کاغذات اور پاس پورٹ وغیرہ کا انتظام کر کے اسے خاموشی سے ملک سے باہر نکال دیا تھا۔''

''ممکن'' میں نے ایسا کیا ہو۔'' رانا گلزار نے مبہم لہجے میں کہا۔

''ممکن نہیں ...... بلکہ ایسا ہی ہوا ہے۔''

''اچھا! اس بات کو چھوڑو ...... تم اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے بھی ایسے انتظامات کر دیں۔''

''لیکن تم تو کہہ رہے تھے تم اس شہر کو چھوڑ کر کہیں نہیں بھاگ سکتے ...... یہاں تمھارے کاروباری رابطے ہیں اور ......''

منظور نے اس کی بات کاٹی اور کہا۔

''میں ہمیشہ کے لیے بھاگ جانے کی بات تو نہیں کر رہا ہوں۔''

''پھر؟''

''مجھے عارضی طور پر تو انڈر گراؤنڈ ہونا ہی پڑے گا ...... اگر میرے آدمی مقدمے کے دوران میں ہی جمیل خان کا بھی بندوبست کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا، تو رہائی کے بعد میرا کچھ مدت کے لیے نکل جانا ہی اچھا ہوگا، کیوں کہ جمیل خان کوئی نہ کوئی جوابی کارروائی ضرور کرے گا ...... میرے نکل جانے کے کچھ عرصہ کے بعد جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے، تو میں واپس آ جاؤں گا۔''

''یہ کام بھی ہو جائے گا ...... میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن ......''

''آپ بے فکر رہیں ...... میں ان انتظامات کے بدلے میں بھی آپ کو بہت اچھی رقم دوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔

''ان انتظامات کا معاوضہ پچاس لاکھ روپے ہوگا۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے ...... آپ میرا اچھی طرح خیال رکھیں ...... میں آپ کا اچھی طرح خیال رکھوں گا۔''

☆......☆......☆

منظور کے خلاف جو مقدمہ استغاثہ نے عدالت میں پیش کیا تھا، وہ بہت کمزور بنیادوں پر استوار تھا۔ شہادتیں اکٹھی کرنے کے سلسلے میں بالکل جدوجہد نہیں کی گئی تھی۔ کوئی بھی قابل وکیل ان کے بخیے ادھیڑ سکتا تھا۔ سارا مقدمہ اصل میں ایک ہی شخص کی گواہی پر لٹک رہا تھا۔ وہ شخص اس عمارت کا رات کا سیکورٹی گارڈ تھا جس میں جمیل خان اور اس کے بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ وقوعے کی شب اس نے منظور کو لابی سے لفٹ میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اس کا نام مبشر خان تھا۔

رانا گلزار نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ ایک جاسوسی کا شوق رکھنے والے بندے کی خدمات حاصل

زیادہ معلومات اکٹھی کرے۔ مقدمے کی سماعت شروع ہونے سے ایک دن پہلے ہی جاسوس کی رپورٹ رانا گلزار کی میز پر پہنچ چکی تھی۔ اس کا مطالعہ کر کے رانا گلزار بہت مطمئن ہوا اور ہلکی ہلکی سیٹی بجانے لگا۔

مقدمے کی سماعت کی تاریخ جیسے جیسے قریب آتی چلی گئی، منظور سے گفتگو کرنا یا اسے کچھ سمجھانا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا۔ جیل میں بند رہ کر اس کی چڑچڑاہٹ اور بدمزاجی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ رانا گلزار کی توقع کے عین مطابق جج نے منظور حسین کی ضمانت منظور نہیں کی تھی۔ دوسرا منظور کو اس کے آدمیوں نے بتایا تھا کہ جمیل خان باہر سے واپس آنے کے بعد چھپ گیا تھا۔ یوں اسے نشانہ بنانا مشکل ہو گیا تھا، لیکن منظور کے بارے میں زیرِ زمین دنیا میں یہ خبر گرم تھی کہ اس کی موت کے احکامات جاری کیے جا چکے ہیں۔

تاہم منظور نے جیل کے ملاقاتیوں والے کمرے میں ایک تازہ ترین ملاقات میں رانا گلزار سے کہا تھا۔

''مجھے ان خبروں پر کوئی تشویش نہیں ہے......''

''وہ کیوں؟''

''یہاں سے میں رہا ہو جاؤں، تو مجھے صرف کچھ عرصے کے لیے کسی اچھے سے مقام میں روپوشی کی ضرورت ہوگی...... جیسے ہی جمیل خان سامنے آئے گا اور ذرا غیر محتاط رہنے لگا...... میرے آدمی اس سے نمٹ لیں گے۔''

''تم جمیل خان کے ساتھ کیا کرتے ہو...... یہ تمھارا معاملہ ہے......'' رانا گلزار نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں تو محض تمھارا قانونی دفاع کر رہا ہوں۔''

''آپ کو میرے بیرونِ ملک سفر کے انتظامات بھی کرنے ہیں...... جس کے لیے میں آپ کو پچاس لاکھ روپے دوں گا۔''

''مسئلہ صرف اس سیکورٹی گارڈ کی گواہی کا ہے...... ورنہ استغاثہ کے مقدمے میں کوئی جان نہیں ہے۔''

''اس کرائے کے ٹٹو کا بھی کوئی بندوبست کر دیتے ہیں...... ایسے کوئی معاملہ بھی پیش آتا ہے۔ اگر انسان رقم خرچ کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور کام کے لوگوں کو جانتا ہو، تو ہر طرح کے کام ہو جاتے ہیں۔''

''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ایسی کوئی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... وہ جب ابھر کے سامنے آئے گا، تو میں اس سے خود نمٹ لوں گا۔'' رانا گلزار ذرا سخت لہجے میں بولا۔

☆......☆......☆

عدالت کا منظر تھا۔ وکیل استغاثہ سرکاری وکیل تھا، اس لیے اس کی اس مقدمے میں دلچسپی بالکل نہیں تھی۔ وہ تو خانہ پری کر رہا تھا۔ اس نے جو چند سوال مبشر سے کیے تھے، وہ بس یہی ظاہر کر رہے تھے کہ جس شخص کو قتل والی رات مبشر نے دیکھا تھا، وہ منظور حسین تھا۔ دو منٹ کے بعد ہی وکیل استغاثہ نے مبشر کو فارغ کر دیا تھا۔ اب باری رانا گلزار کی تھی۔ وہ اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر کٹہرے کی طرف بڑھا۔

رانا گلزار بارعب انداز میں چلتا ہوا گواہوں کے کٹہرے تک گیا اور مبشر خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

''تمھارا دعویٰ یہ ہے کہ جمیل خان کی بیوی اور ان کے بچوں کے قتل کی شب تم کہیں باہر سے لابی میں واپس آئے، تو تم نے ایک شخص کو لفٹ میں داخل ہوتے دیکھا......''

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''بعد میں تم نے میرے مؤکل منظور کو اس شخص کی حیثیت سے شناخت کر لیا...... یہ درست ہے؟''

''درست ہے۔''

رانا گلزار چند لمحے درمیانہ قامت، ادھیڑ عمر اور فربہی مائل سیکورٹی گارڈ کو یک ٹک دیکھتا رہا۔ اس کے یوں مسلسل تکنے سے وہ کچھ نروس دکھائی دینے لگا۔ رانا گلزار جج کو یہی دکھانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ جج اس کے پھولے پھولے سے پپوٹے، اس کے لباس کی شکنیں اور اس کی پھولی پھولی ناک کی

نوک پر دکھائی دینے والی سرخ سرخ باریک نسوں کے جال کو بھی دیکھ لے۔ وہ اس کی شخصیت کا جو تاثر ابھارنا چاہتا تھا، اس کے لیے یہ تمام نشانیاں اہم تھیں۔

''اور تم اس وقت کہاں سے واپس آرہے تھے ...... مبشر!'' رانا گلزار نے بظاہر نرم، لیکن زہریلے لہجے میں پوچھا۔

سیکورٹی گارڈ کا چہرہ کچھ ایسا تھا کہ، جو صرف اور صرف اس کی والدہ ہی کو اچھا لگ سکتا تھا۔ رانا گلزار کا سوال سن کر اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار ظاہر ہوئے اور وہ ذرا سا ہکلا کر بولا۔

''مم ...... مم ...... میں باتھ روم سے واپس آرہا تھا۔''

''واہ ...... واہ ...... کیا بات ہے۔'' رانا گلزار اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''رات کا وقت تھا اور تم اس عمارت کی لابی میں حفاظتی ڈیوٹی پر مامور واحد گارڈ تھے ...... اس کے باوجود جب تمہارا جی چاہا ...... تم اپنی ڈیوٹی کی جگہ چھوڑ کر چلے گئے ...... بہت خوب! تمھارے تو خوب مزے ہیں ...... تمھیں تو شاباش دی جانی چاہیے کہ اتنی خوب صورتی سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہو ...... دوسروں کے لیے تم ایک رول ماڈل کی حیثیت سے رکھتے ہو ...... کیا بات ہے!''

رانا گلزار کے لہجے کا زہریلا پن اسے کاٹ رہا تھا۔

''میں جی چاہنے پر نہیں گیا تھا ......''

''پھر کیوں گئے تھے؟''

''میں فطری تقاضے سے مجبور ہو کر گیا تھا ......''

''تمھارا فطری تقاضا بھی بڑا سیانا ہے ......''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تو بالکل واضح ہے ...... جب بھی تم ڈیوٹی پر موجود ہوتے ہو ...... تمھارا فطری تقاضا تمھیں ستانے لگتا ہے ...... جب بھی تمھاری ڈیوٹی شروع ہوتی ہے، تو تمھارا یہ فطری تقاضا تم سے بار بار اس بات کا اصرار کرنے لگتا ہے کہ تم باتھ روم جاؤ۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے، تو پھر کیسی بات ہے؟''

''میں جی چاہنے پر نہیں، فطری تقاضے سے مجبور ہو کر گیا تھا ...... ویسے میں بار بار ایسا نہیں کرتا ...... میرا مطلب ہے کہ میں بار بار اپنی ڈیوٹی کی جگہ چھوڑ کر نہیں جاتا، لیکن کبھی کبھی ضرورت بہر حال انسان کو مجبور کر دیتی ہے۔''

''تمھیں یقین ہے کہ تمھارے جانے کی وجہ کچھ اور نہ تھی ......''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مبشر! مثلاً کوئی بوتل وغیرہ ......؟'' رانا گلزار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ اور پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''نن ...... نن ...... نہیں ...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے ایک نظر جج کو دیکھ کر بولا۔

''پھر کیسی بات ہے؟''

''میں واقعی باتھ روم گیا تھا۔''

''زیادہ شراب نوشی بہت لمبے عرصے تک تمھارا مسئلہ رہی ہے ...... مبشر!'' رانا گلزار ملائمت سے بولا۔ ''اس کی وجہ سے تمھیں کئی ملازمتوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں ...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس سے پہلے کہ مبشر کوئی جواب دیتا، وکیل استغاثہ جو کوئی دیر سے خاموش بیٹھا تھا، وہ بول اٹھا۔ آخر اسے بھی تو اپنی فیس حلال کرنا تھی۔

''مجھے اعتراض ہے جنابِ عالی!''

''میرے فاضل دوست کو کس بات پر اعتراض ہے؟'' رانا گلزار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں جمیل خان کے خاندان کے قتل کا مقدمہ زیرِ سماعت ہے جب کہ وکیل صفائی گزری باتوں کو دہرا کر معزز عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

یہ سن کر جج نے رانا گلزار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ یہ دیکھ کر رانا گلزار نے سر جھکا کر کہا۔

''جنابِ عالی! میرے اس سوال کا تعلق بھی زیرِ سماعت مقدمہ سے ہے ...... آگے چل کر اس کا ثبوت بھی آپ کو مل جائے گا۔''

یہ سن کر جج نے سر ہلا کر کہا۔

''اعتراض مسترد کیا جاتا ہے ...... آپ اپنے سوالوں کا سلسلہ جاری رکھیں۔''

''بہت بہت شکریہ ...... جنابِ عالی!'' رانا گلزار

نے سر کو خم دے کر کہا اور ایک بار پھر وہ مبشر کی طرف مڑا۔ ''امید ہے کہ اب تمھیں بھی میرے اس سوال کا جواب دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''میں آپ کا سوال بھول گیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... میں دوبارہ دہرا دیتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر رانا گلزار نے سوال دہرا دیا۔ ''زیادہ شراب نوشی بہت لمبے عرصے تک تمھارا مسئلہ رہی ہے...... مبشر! اس کی وجہ سے تمھیں کئی ملازمتوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نن...... نن...... نہیں...... میرا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے شراب نوشی کا عارضہ لاحق نہیں ہے...... میں نے علاج کرا لیا ہے...... اب میں بالکل نہیں پیتا ہوں...... ہفتے میں دو بار میں متعلقہ ہسپتال میں معائنے کے لیے بھی جاتا ہوں۔'' مبشر نے مضطرب لہجے میں کہا۔

رانا گلزار اس کا جواب سن کر چند کاغذات الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن میری معلومات کے مطابق اس ہفتے کے دوسرے معمول کے معائنے کے لیے تم وہاں نہیں پہنچے تھے...... کیا تم اس وقت بھی باتھ روم میں تھے؟''

مقدمے کی تمام تر سنگینی اور موضوع کی تمام تر سنجیدگی کے باوجود اس موقع پر عدالت میں زوردار قہقہہ پڑا۔ جج کو سختی سے انھیں روکنا پڑا۔ مبشر کا چہرہ خجالت سے سرخ پڑ گیا۔ وہ کچھ اور بوکھلاہٹ کے سے عالم میں بولا۔

''نن...... نن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں تھی......''

''پھر کیوں نہیں گئے؟''

''بس! میں نے ضرورت محسوس نہیں کی...... اس کے علاوہ اس دن مجھے دو تین دوسرے ضروری کام بھی کرنے تھے۔''

رانا گلزار نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے بالکل سامنے ٹہلتے ہوئے اسے مزید بدحواس کر دیا اور نہایت پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''عین ممکن ہے کہ وہ ضروری کام یہی ہو کہ بوتل تمھارے ہاتھ لگ گئی ہو اور تمھیں اسے خالی کرنا ہو...... اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ قتل کی رات لابی سے غائب ہونے کی وجہ بھی بوتل رہی ہو؟''

اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ، رانا گلزار کے اس طرزِ عمل پر اعتراض کرتا، مبشر تقریباً چیخ اٹھا۔

''نن...... نن...... نہیں...... نہیں...... یہ جھوٹ ہے...... میں اب بالکل نہیں پیتا ہوں۔''

یہ سن کر رانا گلزار انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

''اس صورت میں مجھے عمارت کی صفائی کرنے والے تنویر نامی شخص کو گواہوں کے کٹہرے میں بلانا پڑے گا اور وہ معزز عدالت کو بتائے گا کہ تم کتنی بار اس کے ساتھ بیٹھ کر پی چکے ہو۔''

اس سوال کا مبشر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی شکست کے ساتھ ہی استغاثہ کی شکست کے تابوت میں آخری کیل بھی جڑ گئی۔

''جنابِ عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔'' رانا گلزار نے اپنے سوالوں کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

'شک کا فائدہ!'

یہ تھی وہ قانونی اصطلاح، جو اس سے پہلے بھی بار ہا بار رانا گلزار کے کام آ چکی تھی۔ یہ اس کے لیے نیا تجربہ نہیں تھا۔ وہ اس کام کا بڑا ماہر تھا۔ جج کے ذہن میں صرف شک کے چند بیج بوئے جاتے تھے۔ پھر بہترین الفاظ سے ان کی آب یاری کی جاتی تھی اور آخر کار...... جج ملزم کو رہا کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

رانا گلزار کے شاطرانہ طریقۂ کار کے آگے مبشر ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ایک معمولی تعلیم یافتہ اور احساسِ کمتری کا شکار انسان تھا۔ پہلی بار اس نے عدالت میں حاضری دی تھی، جہاں وہ بہت سے لوگوں کی گھورتی ہوئی نگاہوں کا مرکز تھا۔ اس کا اپنا ماضی بہت خراب کارکردگی کا حامل تھا۔ وہ بھلا ایک شاطر، کامیاب اور منجھے ہوئے فوج داری وکیل کا سامنا کیسے کر سکتا تھا۔

رانا گلزار کو یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ مبشر اس رات کہیں پینے پلانے گیا ہوا تھا

۔اس نے سب کی توجہ صرف اس امکان کی طرف مبذول کرا دی تھی اور مبشر کے داغ دار ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے اتنا ہی کوفی تھا۔ پھر اس کی گواہی معتبر نہیں رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس نے آدمی کو پہچاننے میں غلطی کی ہو۔

اگلی پیشی پر عدالت نے منظور حسین کو باعزت بری کر دیا تھا!

وہ شہر کے بہترین وکیل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک آزاد شہری کی حیثیت سے عدالت سے نکلا، تو ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی ایک کثیر تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ رانا گلزار ان سب سے معذرت کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اپنے مؤکل کو لفٹ کی طرف لے کر چلا۔

''فی الحال ہم دونوں عدالت کے اس فیصلے پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔''

اس کے باوجود شہر کے سب سے بڑے اخبار کے رپورٹر نے بھیڑ کر چیرتے ہوئے اپنا چھوٹا سا ٹیپ رکارڈر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''رانا گلزار صاحب! ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ قانون کی لچک سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں آپ کا جواب نہیں...... کیا موجودہ مقدمہ میں بھی آپ نے یہی کیا ہے؟''

رانا گلزار نے لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے خوں خوار نظروں سے رپورٹر کو دیکھا اور کاٹ دار لہجے میں بولا۔

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا...... اور یہ میری نہیں، نظامِ انصاف کی فتح ہے، لیکن تم ایسے اخبار والوں کی بات سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی۔''

اتنا کہہ کر اس نے لفٹ بند کر دی تھی۔ اس دوران میں منظور کے پاس ایک شخص آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا، جو اس نے منظور کو پکڑا دیا۔ وہ بندہ اصل میں منظور کا ایک خاص آدمی تھا۔ اس سے اس نے پیسے منگوائے تھے۔ اس بیگ میں رقم تھی۔

اس آدمی پر منظور حسین کو اتنا اعتماد تھا کہ اس نے بیگ کھول کر رقم دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

''ابھی اور کتنی دور جانا ہے؟'' گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے منظور حسین نے قدرے بے زاری سے پوچھا۔

''بس! اب میرا کیبن تقریباً چار کیلومیٹر دور رہ گیا ہے۔'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے رانا گلزار نے جواب دیا۔

''آپ میرے لیے شہر کے پاس کسی جگہ چھپنے کا بندوبست نہیں کر سکتے تھے؟ خاص طور جب کہ میں آپ کو اتنا معاوضہ دے رہا ہوں۔'' منظور حسین نے شکوہ کیا۔

''تم نے فرمائش کی تھی کہ میں تمھارے لیے وہی انتظامات کر دوں، جو میں نے اس سے پہلے علی نواز کے لیے کیے تھے...... چناں چہ میں وہی کر رہا ہوں...... میرا یہ تعطیلاتی کیبن چھپنے کے لیے بہترین جگہ ہے...... دو چار روز تمھیں اس ویران مقام پر رہنا پڑے گا...... اس دوران میں، میں تمھارے لیے نئے کاغذات اور پاس پورٹ تیار کروا لوں گا...... ایک موٹر بوٹ تمھیں دوسرے ملک کے ساحل پر پہنچا دے گی...... وہاں سے کہیں بھی چلے جانا...... تمھارے لیے شان دار انتظامات ہو رہے ہیں...... تم اور کیا چاہتے ہو؟''

کچھ دیر کے بعد رانا گلزار کی مرسڈیز ایک پگ ڈنڈی پر مڑی اور آخر کار ایک کیبن کے ڈرائیووے میں جا کر رکی۔ یہ کیبن ایک جنگل میں واقع تھا۔ لگتا ایسے تھا کہ ادھر کوئی شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ منظور گاڑی سے اتر کر کیبن کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''جگہ تو بری نہیں ہے...... آپ کے سوائے کسی اور کو تو اس کے بارے میں پتا نہیں ہے؟''

''نہیں...... یہ خود میری بھی خفیہ پناہ گاہ ہے۔'' رانا گلزار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے منظور حسین کا سوٹ کیس بیڈ روم میں

لے جا کر رکھا اور سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔
''اب تم باقی پچپن لاکھ روپے بھی نکال کر میز پر رکھ دو۔''
منظور حسین نے ہاتھ میں رقم والا بیگ پکڑا ہوا تھا۔ وہ بیگ اس نے میز پر رکھ دیا۔ اچانک وہ چونک پڑا، کیوں کہ اس نے دیکھا تھا کہ رانا گلزار نے اپنی جیب سے ایک پستول نکال کر اس پر تان لی تھی اور کہہ رہا تھا۔
''اب تمھیں میرے ساتھ کچھ اور آگے تک سیر کے لیے چلنا ہے۔''
''یہ...... یہ...... یہ کیا مذاق ہے......!'' منظور برہمی سے بولا۔
''چلو!'' رانا گلزار پستول سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غرایا۔
شاید اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ منشیات کا اسمگلر اس کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔
پانچ منٹ کے پیدل کے سفر کے بعد وہ گھنے جنگل میں جا پہنچے۔ ایک جگہ درختوں کے درمیان میں ایک تازہ کھدا ہوا گڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ رانا گلزار نے اسے وہاں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''یہاں تمھارا دوست علی نواز اور معاشرے کے اس جیسے کئی دوسرے ناسور دفن ہیں...... تمھارے 'روپوش' ہونے کے لیے یہ ایک بہترین جگہ ہے...... یہاں کوئی بھی کبھی بھی تمھارا سراغ نہیں لگا سکے گا۔''
''کک...... کک...... کیا مطلب؟''
''مطلب یہ ہے کہ دنیا کی عدالت سے تو میں نے تمھیں بچالیا، کیوں کہ اگر میں ایسا نہ کرتا، تو کوئی اور تمھیں بچالیتا...... اب میں تمھیں اپنی عدالت میں لایا ہوں اور اس عدالت نے تمھیں موت کی سزا سنائی ہے...... جس پر میں فوری عمل کرنے لگا ہوں۔''
اتنا کہہ کر رانا گلزار نے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ منظور حسین کچھ بھی نہ کر سکا۔ ایک دھماکا ہوا۔ منظور حسین کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے اور وہ سیدھا گڑھے میں جا گرا۔ اسے چیخنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

☆......☆......☆

اپنے گھر میں آدھی رات کو رانا گلزار سجدے میں گرا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ آنکھیں یوں برس رہی تھیں جیسے ساون بھادوں کی بارش ہو۔ وہ سسکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''اے میرے اللہ تعالیٰ! میں نظامِ انصاف کو بچانے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں...... میں معاوضہ لے کر اپنے مؤکل کو بچانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں اور یوں اپنا پیشہ وارانہ فرض ادا کرتا ہوں، لیکن اس کے بعد میں ایک انسان کی حیثیت سے بھی اپنا فرض نہیں بھولتا...... میری سمجھ بوجھ کے مطابق یہ راستہ بہتر ہے...... اگر فیس لے کر میں ان کی وکالت نہیں کروں گا، تو کوئی اور وکیل اس طرح ان کا کیس لڑ کر انھیں بری کرا دے گا اور وہ تو بعد میں ایک انسان کی حیثیت سے اپنا فرض بھی ادا نہیں کرے گا...... یوں یہ لوگ مزید اپنا شر پھیلانے اور معصوم لوگوں کو اپنا نشانہ بنانے کے لیے ہمیشہ آزاد رہیں گے...... میں امید کرتا ہوں کہ میری ان حقیری کوششوں کو شرفِ قبولیت حاصل ہو گا۔''
وہ اٹھا اور چند لمحے خاموش رہا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں موجود الماری کی طرف بڑھا۔ اسے کھول کر اس میں سے منی آرڈر فارم نکالے۔ پھر اپنی ڈائری سے فلاحی اداروں کے پتے دیکھ کر ان منی آرڈر فارموں کو مکمل کرنے لگا۔ وہ جو پچاس لاکھ روپے اس نے منظور حسین سے اسے اس ملک سے بھگانے کے لیے تھے، وہ اس نے فلاحی اداروں کو دینے تھے۔ یہ منی آرڈر وہ مختلف ڈاک خانوں سے بھیجتا تھا۔ یوں وہ سامنے بھی نہیں آتا تھا، لیکن ان اداروں کی مدد بھی کر دیتا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کا نام پر اسرار خدا ترس اور سخی انسان رکھ دیا تھا۔

☆☆......☆☆

مقصود احمد بلوچ

ایک مردِ مومن کی شہادت کی داستان، میانوالی سے

افواج پاکستان کا کردار ہر جگہ مثبت رہا ہے۔ ملک پاکستان پر جب بھی کسی بھی قسم کی آفت آئی ہے۔ افواج پاکستان ہی سب سے آگے ہوتی ہے۔ چاہے اس میں چھ ستمبر کی جنگ ہو، دہشت گردی ہو، سیلاب ہو، فوج نے اپنا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ آج اس وقت ملک جس دور سے گزر رہا ہے۔ اس میں بیرونی

خطرات سے زیادہ اندرونی خطرات لاحق ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی فوج ان اندرونی خطرات سے بھی نمٹ رہی ہے۔ اور انشاءاللہ وہ دن دور نہیں ہے کہ جب ملک دشمن عناصر کو بہت بری طرح شکست ہوگی۔

محمد اجمل ایک بہت ہی بہادر اور جراٗت مند جوان تھا۔ 2 جولائی 1968ء میں محمد اجمل نے ایک بہت ہی غریب خاندان میں آنکھ کھولی۔ اس کے والدین انتہائی غریب تھے۔ لیکن غربت کے اُس دور میں بھی انہوں نے محمد اجمل کو میٹرک تک تعلیم دلوائی۔ اجمل ایک بہت ہی خوب صورت نوجوان تھا۔ چھ فٹ کے قریب اس کا قد تھا۔ جسم اور باڈی کے لحاظ سے بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ جو بھی اجمل کو دیکھتا تھا اس کی دہشت سے خوف کھا جاتا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کے گھر والے اسے ایف اے اور اس سے آگے تک تعلیم حاصل کروانا چاہتے تھے۔ لیکن اجمل انتہائی سمجھدار تھا۔ اس نے اپنے گھر کی غربت کو دیکھتے ہوئے۔ میٹرک کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ میٹرک کرنے کے بعد اجمل کچھ عرصہ تو اپنے باپ کے ساتھ مل کر مزدوری کرتا رہا۔

ایک دن معمول کے مطابق اجمل اپنے باپ کے ساتھ جب صبح کے وقت مزدوری پر گیا تو شہر میں اسے ایک دوست مل گیا۔ حال احوال کے بعد اجمل کو اس کے دوست نے بتایا کہ کل 10 بجے بلدیہ ٹاؤن کراچی میں فوج کی بھرتی ہو رہی ہے۔ آپ بھی آجانا۔ شاید ہمارے نصیب میں ہو اور ہم فوج میں چلے جائیں۔

''اجمل نے کہا'' ٹھیک ہے دوست اگر زندگی رہی تو کل دس بجے انشاءاللہ میں وہاں بلدیہ ٹاؤن آجاؤں گا۔''

''شام کے وقت اجمل اور اس کا باپ جب مزدوری کرنے کے بعد واپس گھر لوٹے۔ تو کھانا کھانے کے بعد اجمل نے اپنے والدین سے فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت مانگی۔ اجمل کے ابو نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا تم کل چلے جانا۔ کیونکہ جب تم میرے ساتھ مزدوری کرتے ہو تو ایک باپ ہونے کی حیثیت سے میرا دل نہیں کرتا کہ تجھے مزدوری کرتے ہوئے دیکھوں۔ اس لیے بیٹا میری طرف سے اجازت ہے۔'' اس کے بعد اجمل نے اپنی ماں کی طرف دیکھا تو ماں کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔ اجمل خان نے ماں کے آنسو صاف کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

''ماں جی اگر آپ مجھے اجازت نہیں دیں گی۔ تو میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ ہر کام میں والدین کی رضا مندی ضروری ہے۔'' آنسو صاف کرتے ہوئے ماں نے اجمل کو کہا بیٹا میری طرف سے بھی اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو کامیاب کرے۔''

اجمل خوشی کے مارے ماں کے ہاتھ چومنے لگا۔ اس طرح خوشی خوشی اجمل کی رات گزری۔ صبح سویرے اجمل خان نے نماز فجر ادا کی، اپنے ضروری کاغذات لیے، ماں سے بہت ساری دعائیں لیں۔ اور بلدیہ ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اجمل اس جگہ پر موجود تھا، جہاں پر فوج کی بھرتی ہو رہی تھی۔ اس کا دوست بھی وہاں موجود تھا۔ متعلقہ وقت پر فوج کا ایک صوبیدار آیا۔ اس نے تمام لڑکوں کو اکٹھا کیا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے ہر لڑکے کی تعلیم اور ڈاکومنٹس وغیرہ دیکھے۔ کیونکہ اُس دور میں مڈل بھی بہت تعلیم ہوتی تھی اور اجمل تو پھر بھی میٹرک تھا۔ خیر ڈاکومنٹس دیکھنے کے بعد ہر لڑکے کا میڈیکل ہوا۔ اسی طرح اجمل کا بھی میڈیکل ہوا۔ اجمل خان ماشاءاللہ بہت ہی کڑیل جوان تھا۔ وہ فوج کے ہر اس قائدے، قانون پر پورا اترا جس کی فوج کو ضرورت ہوتی ہے۔

سارا دن گزر جانے کے بعد شام کے کو سب لڑکوں کو ایک جگہ بلا کر ان کو رزلٹ بتانا تھا۔ کہ کون بھرتی ہوا ہے اور کون نہیں ہوا۔ سب لڑکوں کے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ خیر کچھ دیر کے بعد رزلٹ اناؤنس ہوا۔ تو اس میں اجمل خان کا نام بھی بھرتی ہونے والوں میں سرِ فہرست اُسے وہاں لیا تھا اور اس کا جو دوست تھا وہ میڈیکل پرابلم کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ اور ساتھ ہی انہوں نے بتایا کہ سات دن کے اندر اندر آپ نے

یہاں رپورٹ کرنی ہے۔ تاکہ آپ لوگوں کو فوجی ٹریننگ کے لیے مختلف سینٹرز میں بھیجا جا سکے۔

☆☆☆......☆☆☆......

اجمل خان جب شام کو گھر لوٹا۔ تو یہ خوشخبری سب سے پہلے اس نے اپنی ماں کو سنائی۔ اجمل کی ماں یہ خبر سن کر پہلے تو بہت خوش ہوئی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد بہت اداس ہوگئی۔ اجمل نے اپنی ماں سے اداسی کی وجہ معلوم کی تو وہ بولی۔

''بیٹا خوش اس لیے ہوئی ہوں کہ تجھے کو اچھی نوکری کے ساتھ ساتھ اس ملک وقوم کی خدمت کا موقعہ مل گیا ہے۔ جو ہر انسان کو نہیں ملتا۔ اور اداس اس لیے کہ میرا بیٹا مجھ سے دور چلا جائے گا۔''

یہ کہہ کر ماں اس کو گلے لگا کر رونے لگی۔ اجمل کے باپ نے جب اپنی بیوی کو روتے دیکھا تو اس نے کہا۔

''بھلی مانس! کیوں رو رہی ہے۔ پر تو خوش قسمت ہے کہ تیرا بیٹا اس ملک کی خدمت کرے گا۔ اور اک دن اپنا نام روشن کرے گا۔''

اسی طرح دن گزرتے رہے آخر کار وہ دن بھی آگیا، جس دن اجمل نے اپنا گھر چھوڑ کر ٹریننگ پر جانا تھا۔ اس دن اجمل کی ماں صبح ہی سے بہت زیادہ پریشان نظر آرہی تھی۔ اجمل خان نے اپنی ضرورت کی سب چیزیں اکٹھی کر کے اپنا بیگ تیار کرلیا۔

اجمل خان نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ اور ڈٹ کر فوجی مہارت حاصل کی۔ ٹریننگ کے دوران اسے اپنی ماں کی بہت یاد آتی لیکن وہ کبھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ پیچھے ماں بھی اپنے بیٹے کی یاد میں روتی رہتی۔

اسی طرح گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اجمل کو ہر محاذ پر بھیجا گیا۔ وہ ثابت قدم رہا۔ اس کی پلاٹون کے اندر جو بھی مشکل ٹاسک ہوتا تھا۔ وہ اجمل کو دیتے تھے۔ کیونکہ انہیں پتا تھا یہ ایک بہادر سپاہی ہے اور ہر حال میں پورا کرے گا۔ اور وہ بھی ان کی امیدوں پر پورا اترتا تھا۔ اجمل خان سے اس کے آفیسر صاحبان بہت خوش تھے۔ کیونکہ اجمل نے اپنی سروس میں بہت سارے کارنامے انجام دیے تھے۔

☆☆☆......☆☆☆......

اجمل کو فوج میں گئے تقریباً آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اب اس کی ماں کی یہ خواہش تھی کہ میں اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجاؤں۔ اس کی ماں نے اس کے لیے ایک بہت خوب صورت لڑکی پسند کرلی تھی اور اسے خط بھی لکھا کہ بیٹا جلد از جلد چھٹی لے کر آؤ اب تمہاری شادی کرنی ہے۔

محمد اجمل شہید کی ایک یادگار تصویر

اجمل نے اپنی ماں کی نصیحت کو مانتے ہوئے چھٹی لی اور گھر آیا۔ جب گھر آیا تو شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

آخر کار وہ دن بھی آگیا جس کی ہر ماں کو خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیکھے۔ بڑی دھوم دھام سے اپنے بیٹے کی شادی کی اور دلہن کو گھر لے آئی۔ ماشاء اللہ دونوں میاں بیوی کی بہت اچھی جوڑی تھی۔ اجمل خان کو بہت ہی زیادہ پیار کرنے والی بیوی ملی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اجمل کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

ایک دفعہ معمول کے مطابق وہ اپنی ڈیوٹی پر تھا۔ تو اسے کسی نے بتایا کہ آپ کی ماں جی فوت ہوگئی ہے۔ ماں کی خبر سن کر بہت پریشان ہوا اسی وقت چھٹی لی اور بائی ائیر گھر آیا۔ اس کی ماں تو کب کی اپنے خالق حقیقی سے مل چکی تھی۔ ماں کو سفید کفن میں دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ماں کے چلے جانے کے بعد اجمل خان اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ بکھر گیا تھا۔ ماں کی جدائی کے صدمے نے اسے بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ بس ہر

وقت وہ خاموش رہتا، نہ کسی سے کوئی بات کرتا۔ صبح شام اپنی ماں کی قبر پر جاتا اور کافی وقت تک فاتحہ خوانی کرتا رہتا۔ کچھ دن کی چھٹی تھی جو کہ ختم ہوگئی اور اجمل خان واپس اپنی ڈیوٹی پہ جانے لگا۔

وہ جب بھی چھٹی میں گھر آتا تو۔ وہ گھر سے واپسی پر کبھی بھی نہیں رویا تھا۔ اس دفعہ نہ جانے ماں کے غم نے اسے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ جاتے وقت وہ بہت رویا اور اپنی بیوی کو نصیحت کی کہ وہ ہر روز شام کے وقت ماں جی کی قبر پر جائے اور فاتحہ خوانی کرے اور ساتھ ہی اجمل نے اپنے بچوں کا خیال رکھنے کو کہا۔ خاص کر دانش، دانش اس کا بڑا بیٹا تھا اور اجمل اس سے بہت زیادہ پیار کرتا تھا۔ جاتے وقت اجمل اپنے بچوں سے لپٹ لپٹ کر رویا نہ جانے اس کے دل میں کون سا خوف تھا۔ کون سا وہم تھا۔ اور آخری بات اس نے اپنی بیوی سے یہی کہی تھی کہ میں بہت جلد واپس لوٹ آؤں گا'' اجمل خان ایک دفعہ پھر پردیس کی طرف روانہ ہوگا۔

اس دفعہ اجمل خان کو یونٹ کی طرف سے ایک خاص قسم کا ٹاسک دیا گیا تھا۔ کراچی کے اندر دہشت گردوں کو پکڑنے کا۔ خاص کر لیاری کے ایریا میں۔ اور اس نے اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے بہت سارے دہشت گردوں کو ٹھکانے لگایا۔ اسی طرح جب بھی کوئی آپریشن ہوتا تو اجمل سب سے آگے ہوتا۔ اس کو گھر سے آئے ہوئے چار ماہ ہوگئے تھے اس کی بیوی سے آخری دفعہ بات 15 مارچ 2012ء کو اپنی بیوی سے ہوئی تھی۔

اس کی بیوی نے کہا کہ آپ نے تو بہت جلد آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب تو چار ماہ سے بھی زیادہ ٹائم ہوگیا ہے۔ بچے بہت اداس ہیں اور ساتھ...... '' اجمل خان مسکراتے ہوئے کہا۔

'' ساتھ میں بچوں کی ماں بھی اُداس ہے۔'' یہ بات سن کر اس کی بیوی رونے لگی۔ اور وہ اسے کہنے لگا اداس نہ ہو میں کل یا اس سے اگلے دن لازمی آجاؤں گا۔ ٹھیک ہے۔ اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا خدا حافظ۔''

شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا اور ان دونوں کے درمیان یہ آخری باتیں ہوئیں۔

پندرہ مارچ 2012ء کی رات اجمل خان کو ایک بار پھر یہ ٹاسک ملا کہ وہ کل صبح لیاری کے علاقے میں آپریشن کے لیے جائے گا۔ 16 مارچ کی صبح صبح اجمل خان نے اپنے ساتھ موبائل گاڑی میں چھ جوان اور بھی ساتھ بٹھا لیے۔ اور اپنی یونٹ ایریا سے نکل پڑے۔ اور کچھ وقت تک وہاں اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے۔ اور سرچ آپریشن شروع کر دیا۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ وہاں فائرنگ شروع ہوگئی۔ اب یہ پتا لگانا مشکل تھا کہ فائرنگ کس سمت سے ہو رہی ہے۔ اسی طرح اجمل خان اور اس کے ساتھ اپنے بچاؤ کے ساتھ ساتھ فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ ایک گولی اجمل خان کا سینہ چیرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اجمل خان نے اپنے آپ کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی لیکن زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اور جام شہادت نوش فرما گیا۔

اجمل خان نے آخری دفعہ اپنی بیوی سے دو دن کے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے اپنا وعدہ نبھایا۔ اور دو دن بعد اجمل خان کا جسدِ خاکی روایتی شان و شوکت کے ساتھ جب اس کے گاؤں میں پہنچا تو لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ خاص کر اجمل کا سب سے چھوٹا بھائی محمد ارشاد اس دن بہت رویا۔ کیونکہ اجمل اسے سب سے چھوٹا ہونے کی حیثیت سے بہت پیار کرتا تھا۔

جب اجمل کی بیوی نے سب کو روتا دیکھا تو اس نے زوردار ایک نعرہ لگایا۔

'' نعرہ تکبیر اللہ اکبر......! خبردار اگر اب کسی نے ایک آنسو بھی بہایا! میرا اجمل تو شہید ہو کر آیا ہے۔ اور شہید کی لاش پر رویا نہیں جاتا۔ مجھے آج فخر ہے۔ کہ میں شہید کی بیوہ ہوں۔ ایک فوجی جوان شہید ہوتا ہے تو پوری قوم کو بچا لیتا ہے۔

'' آخر کار شہید محمد اجمل کو مکمل فوجی اعزازت کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس کی شہادت کی تاریخ 17 مارچ 2012ء ہے۔ اس شہید کی قبر کے ساتھ قومی پرچم لگایا تھا۔ جو جب جب لہراتا ہے، اجمل خان کی بہادری اور پاکستانی فوج کی عظمت کی کہانی سناتا محسوس ہوتا ہے۔

......☆☆☆......

تیسری مرد کہانی

ایم ارشد وفا

گوجرانوالہ سے، ایک ایسے مرد کی کہانی جس نے حرم سے چوری کرنے کی کوشش کی تھی مگر......

دسمبر کی ٹھٹرتی کالی سیاہ راتوں میں وہ ہاتھوں پر دستانے چڑھائے، خود کو کالی سیاہ چادر میں لپیٹے بڑے سکون سے گلیوں میں گشت کر رہا تھا۔ اس کا رُخ آج شہر کے مشہور بزنس مین کے گھر کی طرف تھا۔

وہ ایک مانا ہوا چور تھا۔ وہ بس رات کی تاریکیوں میں نظر آتا اور دن کے اُجالوں میں نہ جانے کہاں گم ہو جاتا۔

ہر کوئی پریشان اور خوف سے سہما ہوا تھا۔

سب سے بڑی پریشانی کی بات یہ تھی کہ چور صرف اور صرف پیسے لے کر جاتا تھا۔ سونا چاندی یا اور کوئی قیمتی چیز کو ہاتھ بھی نہ لگاتا تھا۔ بہت سختی سے ہر کسی کو حکم تھا کہ رات کے دس بجے کوئی اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلے گا۔

پولیس کی بھاری نفری شہروں کی گلیوں میں گشت میں مصروف تھی۔ مگر وہ اپنے مخصوص راستوں سے ہوتا ہوا شہر کے مشہور بزنس مین راحت اوجلہ کی بنی ہوئی کوٹھی کے پاس تھا۔

اس نے اپنے جسم سے چادر ہٹائی۔ اور ایک لمبا سا چاقو کھولا اور زمین کھودنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اس نے ایک پلاسٹک کا تھیلا باہر نکالا اور مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھوں کو صاف کرنے لگا۔

30 فٹ کی لمبی رسی کو اُس نے بڑے احتیاط سے کھولا اور چھت پر پھینکنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ تیس فٹ بلند کوٹھی کی چھت پر موجود تھا!

......☆☆☆......

ڈی آئی جی، ایس پی، انسپکٹر سر جوڑے رات والے واقعے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کہ مجرم ابھی تک پکڑا کیوں نہیں گیا؟

''سر چور بہت زیادہ عقل مند ہے۔'' فیض اللہ نے اپنا خیال اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک بار نہیں بلکہ بار بار اُس جگہ کا موزانہ کرتا ہے اور موقع دیکھ کر چوری کرتا ہے، رات کے اندھیروں میں غائب ہو جاتا ہے۔''

''سر راحت اوجلہ کے گھر سے 40 لاکھ کی چوری ہوئی ہے۔'' ایس پی وحید نے ایک فائل ڈی آئی جی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ جس کی وجہ سے ڈی آئی جی اور بھی پریشان ہو گیا۔

''سر اِس سال تقریباً 1 کروڑ 20 لاکھ روپے چُرائے گئے ہے۔ مگر مجرم ابھی تک حراست میں نہیں آیا۔ اگر یہی حال رہا تو بہت جلد لوگوں کا یقین ہم سے اٹھ جائے گا۔''

''کب تک ہم عوام کو حوصلہ دیتے رہیں گے۔ اگر یہی حال رہا تو میں یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔'' ایس پی وحید نے اپنے آخری کلمات کہے اور کرسی کو پیچھے دھکا دیا اور فائل اٹھا کر کمرے سے باہر آ گیا۔

......☆☆☆......

حیدر علی ایک اُنیس سال کا خوب صورت نوجوان تھا۔ لمبا قد خوبصورت نین نقش، تیکھے نقوش، پُرکشش چہرہ دیکھنے والوں کے دل میں گھر کر جاتا تھا۔

وہ شہر کے سب سے گندے علاقے میں رہتا تھا۔ مگر اُس کی شخصیت دیکھ کر ہر کوئی یہی سمجھتا تھا کہ وہ کسی امیر باپ کی اولاد ہے۔

حیدر علی نے میٹرک کیا ہوا تھا۔ اور اپنے باپ کے ساتھ ریڑھی پر کھڑا ہو کر دال چاول بیچا کرتا تھا۔

اس کے لہجے میں اتنی مٹھاس تھی کہ لوگ بہانے بہانے سے اُس سے بات کرتے۔

وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہر کسی سے خندہ پیشانی سے پیش آتا اور اپنے گاہکوں سے بات کرتا۔

''یار سُنا ہے چوہدری راحت اوجلہ کی کوٹھی سے 40 لاکھ کی چوری ہوئی ہے۔'' حیدر علی کی ریڑھی کے پاس ہر روز کی طرح آج بھی بہت رش تھا۔ اور لوگ رات کو ہونے والے واقعے کے بارے میں ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے۔

''یار کیسا چور ہے، نہ کوئی اُس کو پہچان سکا اور نہ ہی کوئی پکڑ سکا۔''

''ہماری پولیس بھی بے بس ہوتی جا رہی ہے! چُور نے تو پورے شہر میں خوف پیدا کر دیا ہے۔'' حیدر نے بھی پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے کہا حالانکہ اتنی سردی تھی مگر پھر بھی اُس کی پیشانی پر چند قطرے پسینے کے آ گئے تھے۔

جس کو سب نے محسوس کیا تھا۔
''آج کے اخبار میں ایس پی نے کھو کھلے لفظوں میں کہا ہے۔ کہ اگر چور پکڑا گیا تو اُس کو عبرت ناک سزا دی جائے گی اور اگر کوئی اُس کے بارے میں بتائے گا تو اُس کو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔''ایک شخص نے تازہ ترین رپورٹ پیش کی۔
''کل رات کے خبرنامے میں ڈی آئی جی نے کہا ہے کہ میں اُس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔ ایسی سزا دوں گا کہ وہ کیا اُس کو دیکھنے والے بھی اُس سے عبرت پکڑیں گے۔''ایک بزرگ نے رات کا خبرنامہ دہرایا۔
''چاچا اور کچھ چاہیے۔'' حیدر نے بات کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔
''ناں پُتر بس۔''
ساری باتیں سُننے کے بعد حیدر خوف و حراس میں گھر گیا تھا۔ اس کے کانوں میں بار بار یہی الفاظ گونج رہے تھے۔
''اگر ایک بار مجرم پکڑا گیا تو ایسی سزا دیں گے کہ اُس کو دیکھنے والے بھی اُس سے عبرت پکڑیں گے۔''

☆☆☆

پورا ہفتہ سکون سے گزرا تھا۔ کوئی چوری نہیں ہوئی تھی۔ ہر طرف امن و امان تھا۔ مگر خوف ابھی تک لوگوں کے دلوں سے نہیں گیا تھا۔
دسمبر کی آخری بارش تھی اور زیادہ سردی تھی۔
شہر کے مختلف حصّوں میں پولیس کی گاڑیاں گشت کر رہی تھی۔
آج اُس کا رخ سیٹھ نوید کے گھر کی طرف تھا۔ جو کہ شہر کے ویسٹ میں واقع تھا۔
اُس نے آج سر پر ہیٹ اور ہاتھوں پر ہمیشہ کی طرح بڑے بڑے دستانے چڑھا رکھے تھے۔ کالی سیاہ چادر میں ہر بار کی طرح اُس نے خود کو چھپایا ہوا تھا۔
اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ سیٹھ نوید کے گھر کے بالکل سامنے تھا۔
دو منزلوں پر بنا ہوا یہ گھر بہت خوب صورت تھا۔ اُس نے گھر کا چاروں طرف سے جائزہ لیا۔ اور کندھے سے 30 فٹ کی رسی نکال کر چھت پر پھینکی

اور ہر بار کی طرح یہاں سے بھی نقدی چرا لی اور رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

''سر میں اس نوکری سے اپنی جان چھڑانا چاہتا ہوں۔ میں ایک سال سے تنگ آ گیا ہوں۔ میڈیا سے جھوٹ بولتے بولتے۔'' ایس پی وحید نے اپنا بیلٹ، ریوالور اور کیپ ڈی آئی جی کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا اور آخری سیلوٹ مارا اور وارڈ روب سے باہر آ گیا۔

ڈی آئی جی عمران خان نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور آنکھیں موند لیں۔

ایک بار پھر سارا شہر خوف میں مبتلا تھا۔ اب کی بار چور نے ایسا کام کیا تھا کہ لوگ دن میں بھی ڈرنے لگے تھے۔ اب کی بار کوئی اُس کے بارے میں بات نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ سارے ایسے سہمے ہوئے تھے جیسے وہ ابھی ان راستوں سے ہوتا ہوا آئے گا۔ اور سب سے سب کچھ چھین کر لے جائے گا۔

☆☆☆

''بابا میں باہر جانا چاہتا ہوں۔'' حیدر علی نے جب شہر کے حالات دیکھے تو اپنے بابا سے اپنے باہر جانے کی ضد کر ڈالی۔

''کہاں جانا چاہتے ہو۔''

''سعودی عرب میں میرا ایک دوست ہوتا ہے۔ وہ وہاں حرم پاک کی صفائی کرتا ہے۔ ہم کو اور کیا چاہیے۔''

حیدر علی نے اپنے بابا کو قائل کرنا چاہا اور باپ کی طرف سے اجازت ملنے پر خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا۔

''تُو پاگل ہے۔'' حیدر علی کا دوست انعام علی حیدر کو سمجھانے لگا مگر وہ نہ مانا۔

''تُو تیار رہنا، بس آج کی رات ہم لمبا ہاتھ ماریں گے۔ تم ٹائم پر گاڑی لے کر آ جانا۔''

حیدر علی نے اپنے دوست کو کہا اور مسکراتا ہوا اُس کے گلے لگ گیا۔

''تم کو پتا ہے ناں میری خواہش ہے کہ میں حرم پاک......''

انعام نے حیدر علی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ناں حیدر ہم ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جس کی وجہ سے ہم خُدا کے دربار سے بھی رد ہو جائیں۔''

مگر حیدر اپنی ہی بات پر قائم رہا۔

حیدر علی نے اپنے دوست اور اپنے ساتھی انعام کے کندھے تک ہلکا سا زور دیا۔

''تم کو پتا ہے سارا شہر کتنا خوف زدہ ہے۔ شام کے سائے ڈھلنے سے پہلے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں کیسے قید ہو جاتے ہیں۔''

''یہ سب کچھ ہماری وجہ سے ہو رہا ہے۔ تُو فکر نہ کر، تم ایسا کرو ماریہ کو کال کر دو اور اُس کو بتا دو کہ آج رات ہم بینک میں ڈاکا ڈالیں گے۔ اور یہ چوری ہماری آخری چوری ہو گی۔''

حیدر علی نے انعام کی ساری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''حیدر ہوش کے ناخن لو۔'' ڈی آئی جی ہم کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے۔ اگر پکڑے گئے ناں تو......''

''یار کہا ناں آج کی چوری آخری چوری ہے۔ تم ماریہ کو فون کر دو۔ باقی سارا کام مجھ پر چھوڑ دو۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''رات کو ٹائم پر پہنچ جانا۔'' حیدر علی نے چلتے چلتے انعام علی کو پھر سے رات کی بات یاد کروائی۔

اور انعام علی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

جنوری کی سردی اپنی پورے جوبن پر تھی لوگ سرِ شام اپنے اپنے گھروں کی لائٹس آف کر کے سو چکے تھے۔ ذرا سی آہٹ پر ہر کوئی خوف سے اٹھ جاتا تھا۔ رات کو ہی ڈی آئی جی نے حکم دیا تھا کہ اگر وہ رات کے پہر کسی کے گھر بھی آ جائے تو اُس کو گولی مار دو۔ اُن کے خلاف کوئی قانونی کاروائی نہیں ہو گی بلکہ انعام سے نوازا جائے گا۔

اب تو ذرا سی بھی آہٹ ہوتی۔ تو لوگ بندوقوں کا رُخ باہر کی جانب کر دیتے تھے۔

شہر شہر خموشاں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں اپنی روز مرہ کی طرح آج بھی گشت میں

مصروف تھی۔
آج وہ اکیلا نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ دو لوگ اور بھی تھے۔
وہ بڑی احتیاط کے ساتھ عسکری بینک کے دروازے پر موجود تھے۔
بڑی مہارت سے انہوں نے بینک کا تالا کھولا۔ سامنے سوئے ہوئے گارڈ کو وہ ہمیشہ کی نیند سلا چکے تھے۔ اب کی بار انہوں نے بہت انوکھے طریقے سے سارے کام کیے تھے۔ سیکورٹی گارڈ کو انہوں نے بُری طرح قتل کیا تھا۔ اب کی بار وہ نقدی کے علاوہ اور بہت سی چیزیں بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔
حیدر علی اور ماریہ کا قہقہہ بلند ہوا اور شہر کی خموشی کو توڑ ڈالا تھوڑی دیر بعد اُن کی گاڑی ہوا سے باتیں کرتی ہوئی اپنی منزل تک پہنچ چکی تھی۔
تینوں ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ حیدر علی اُٹھا اور ماریہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اور اپنی شیطانی مستی میں تینوں ہی کھو گئے۔

☆☆☆

پورے شہر میں قیامت برپا تھی۔ ہر کوئی اپنی جگہ ساکت تھا۔ کسی میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو بس اتنا ہی کہہ سکے کہ اچھا نہیں ہوا۔''
سیکورٹی گارڈ کی لاش کے پاس ایک سفید کاغذ پڑا ہوا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔ کہ آج کی یہ چوری ہماری آخری چوری ہے۔ ہم دوبارہ اِس شہر میں کبھی چوری نہیں کریں گے۔ ہم تین لوگ ہیں۔ ایک لڑکی اور دو لڑکے، تم ہر بار کی طرح اب بھی نامعلوم افراد کے خلاف پرچہ درج کرادو۔ خُدا حافظ
ایس پی وحید بھی موقع پر پہنچ گیا تھا۔ خط باری باری سب کو پڑھنے کے لیے دیا جا رہا تھا۔ اب کی بار ڈی آئی جی نے کھلے لفظوں میں میڈیا کا منہ بند کر دیا تھا۔ کہ اگر وہ کچھ کر سکتی ہے تو کر لے۔ باقی جو کچھ ہوا آپ لوگوں کے سامنے ہے۔
لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادو۔ اور اب کی بار پرچہ ان تینوں کے خلاف درج کرلو''
اتنا کہنے کے بعد وہ اِدھر نہ رکا اور سیدھا اپنے آفس میں آگیا۔ جہاں وہ آج ہونے والے واقعے میں بری طرح کھویا ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ تینوں پاکستان سے بہت بڑا ہاتھ مار کر اب سعودی عرب آگئے تھے۔
اُن کا رُخ حرم پاک کی طرف تھا۔ وہ وہاں کے لوگوں کی جیبوں سے کچھ چُرانا چاہتے تھے۔ وہ ظالم یہ بھول گئے تھے کہ جس مالک نے اس کی حفاظت خود کرنی ہے۔ وہاں سے وہ اپنا ناپاک اور گندہ ارادہ کیسے پورا کر سکتے تھے۔
جو اتنے بڑے ہاتھی کو ایک چھوٹے سے پرندے کی چونچ سے گرے ہوئے چھوٹے سے پتھر سے مار سکتا ہے تو انسان اُن کے آگے کیا چیز ہے؟
وہ ظالم اپنے ناپاک ارادے کیسے پورے کر سکتے تھے۔
وہ مالک کیسے اپنے بندوں کو تکلیف میں دیکھ سکتا ہے۔
اُن کو حرم میں داخل ہوئے آج چھ دن ہو گئے تھے۔
وہ موقع کی تلاش میں تھے۔ مگر ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔
سعودی پولیس کی نظروں میں وہ جلد ہی آگئے۔
ہوا یوں کہ انہوں نے حرم پاک کے صحن سے راہ چلتے ہوئے بندوں کو نیچے گرایا اور اٹھانے کے بہانے اُن پر اپنا ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ مگر وہ خُدا کے دربار میں کھڑے ہو کر ایسا گندا اور غلط کام کیسے کر سکتے تھے۔
کچھ ہی لمحوں میں ہی وہ تینوں قاضی کے سامنے پیش تھے۔ اور اپنے سارے ہونے والے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے۔
''اِن تینوں کے ہاتھ کاٹ کر پاکستانی پولیس کے حوالے کر دو۔'' وہ پھٹی پھٹی نظروں سے تینوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ تینوں اُن کو پتا تھا کہ ڈی آئی جی عمران خان سرِ بازار اُن کی گردنیں اُتار دے گا۔ اب کی بار اُن کو چوری بہت مہنگی پڑی۔ وہ حرم سے چوری کرنے آئے تھے۔ مگر ظالم اپنی جانوں سے ہاتھ دو بیٹھے۔ اُن کے ہاتھ کب کے کٹ چکے تھے۔
اور اب اُن کو اپنی گردنوں کی فکر تھی۔ جو بہت جلد اُن کے تن سے جُدا ہونے والی تھیں۔

☆☆☆

بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفر نامہ بھارت

پہلا حصہ

آگ اور خون سے بھری نصف صدی

میں اکثر سوچتا ہوں۔

آپ بھی یقیناً کبھی کبھی سوچتے ہوں گے کہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات اگر اچھے رہتے، دوستانہ ہوتے، لڑائیاں نہ ہوتیں، ایک دوسرے کو دل سے مان لیا جاتا۔ عالمی اور علاقائی فورموں پر پیش ہونے والے معاملات پر یہ دونوں ہمسائے ایک آواز بلند کرتے۔ ایک مؤقف اختیار کرتے۔ تو اس خطے میں آج حالات کتنے بہتر ہوتے۔ عام لوگ کتنے سکھی ہوتے۔ تعلیم کی شرح کیا ہوتی۔ علاج معالجے کی سہولتیں کتنی زیادہ ہوتیں۔ دونوں ملکوں کے شہریوں کو کتنا ذہنی سکون میسر ہوتا۔

یہ خطہ زرعی، صنعتی اور تجارتی پیداوار میں کتنا آگے بڑھ چکا ہوتا۔ یورپ، مشرق وسطیٰ سے کتنے قافلے جنوب مشرقی ایشیا، مشرقی ایشیا اور مشرق بعید تک جانے کے لیے یہاں سے گزرتے تو دونوں ملکوں کو کتنا زرمبادلہ ملتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ 1947ء سے اب تک کوئی ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا ہے۔ جب دونوں ملکوں کے درمیان بین الاقوامی سرحد، ورکنگ باؤنڈری، لائن آف کنٹرول پر جھڑپ نہ ہوئی ہو۔ دونوں ملکوں کے سربراہوں فارن آفسوں کے درمیان بیان بازی نہ ہوئی ہو۔ کسی نہ کسی بین الاقوامی فورم پر پاکستان اور بھارت کے مندوبین کے درمیان تصادم نہ ہوا ہو۔

آگ اور خون سے بھری اس نصف صدی کی شدتیں دیکھ کر یہ حیرت بلکہ تعجب ہوتا ہے کہ پہلے اتنی صدیوں تک یہ دونوں قومیں کیسے اکٹھے گزارہ کرتی رہیں۔ ایک دوسرے کو کیسے برداشت کرتی رہیں۔ یا تو اس وقت بھی تصادم ہوتا ہوگا۔ اطلاعات سفر نہیں کرتی تھیں۔ ذرائع ابلاغ اتنے مؤثر نہیں تھے۔ اخبارات تھے۔ ریڈیو نہ ٹیلی ویژن، اس لیے علم نہیں ہوا۔ یا یہ دونوں بالجبر ایک دوسرے سے نباہ کرتی رہیں۔ یا اس زمانے کے حکمران مسلم یا غیر مسلم اتنے رواداد، مہربان اور منصف تھے کہ وہ دونوں قوموں کے درمیان محبت اور یگانگت کی فضا قائم اور برقرار رکھتے تھے۔ آخری امر زیادہ مناسب لگتا ہے کہ عوام کے مختلف طبقوں کے درمیان یکجہتی اور پرامنی کی فضا

حکمران ہی پیدا کر سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو حکمران ہی ان کو آپس میں لڑوا سکتے ہیں۔

جو نہیں ہوا اور جو نہیں ہو سکا۔ وہ تو ایک خواب ہی ہے۔ تاریخ میں خوابوں کی اس وقت تک کوئی جگہ نہیں ہوتی جب تک وہ حقیقت میں نہ بدل جائیں۔ اور جب حقیقت میں بدل جائیں تو وہ تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ بن جاتے ہیں۔ پھر ان کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔

پاکستان اور بھارت کے آزاد ہونے کے بعد افریقہ اور ایشیا میں اور ممالک بھی آزاد ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی ترقی اور خوشحالی قابل رشک ہے چین کو دیکھ لیں۔ کتنی بڑی آبادی کو منظم کیا ہے۔ نئی پہچان دی، امن وامان، خوراک کے معاملات سنبھالے۔ عالمی برادری میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ سائنسی میدان میں سبقت لی۔ ہانگ کانگ اور مکاؤ واپس لیے۔ اب امریکہ اور دوسرے آزاد ممالک بھی مانتے ہیں کہ چین آئندہ ڈیڑھ دو عشروں میں عالمی اقتصادی طاقت بن جائے گا۔ اس عرصے میں انڈونیشیا نے پرتگالیوں سے آزادی کی جنگ جیتی۔ پھر اس سے ملائیشیا اور پھر ملائیشیا سے سنگاپور الگ ہوا۔ اس خطے میں لسانی کشمکش بھی تھی، مذہبی تصادم بھی، سرحدی تنازعات بھی۔ انہوں نے مل جل کر ان مسائل سے نجات حاصل کی۔ یہ تینوں ممالک اقتصادی طور پر ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کر رہے ہیں۔ ادھر جرمنی اور جاپان کی مثالیں بھی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بھی تقریباً اسی نصف صدی میں جنگی تباہ کاریوں کے اثرات ختم کیے۔ راکھ اور ملبے پر نئے جرمنی اور نئے جاپان کی تعمیر کی۔ جاپان صنعت و تجارت میں امریکا اور یورپ میں جا کر ان کو چیلنج کر رہا ہے۔ جرمنی بھی اقتصادی طور پر طاقتور ملک ہے۔ ادھر ہمارے پڑوس میں متحدہ عرب امارات، بحرین، کویت کی مثالیں ہیں۔ ان کی ترقی کا دور بھی یہی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے محنت کشوں اور ہنرمندوں نے ان صحراؤں کو گل و گلزار بنایا۔ ریگستانوں میں پلازے کھڑے کر دیے۔ سعودی عرب کی مملکت بھی اسی نصف صدی میں تیل کی دولت سے مالا مال ہوئی اور تیزی سے ترقی کرتی ہوئی اقتصادی طاقت بنی۔

یہ نصف صدی دنیا میں تعمیر و ترقی کا عرصہ تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دنیا میں کوئی اور ایسی لڑائی نہیں ہوئی۔ انہی پچاس برسوں میں افریقہ اور ایشیا کے اکثر ممالک نے غلامی کی زنجیریں توڑیں۔

پاکستان اور بھارت میں آنکھ کھولنے والی ہر نسل یہ سوال کرتی ہے کہ جنوبی ایشیا میں یہ نصف صدی تعمیر و ترقی کا عرصہ کیوں نہیں بن سکی؟

اس کا جواب یہی ہے کہ پاکستان اور بھارت آپس میں متصادم رہے۔ ایک دوسرے کے وسائل سے فائدہ اٹھانے، آپس میں تجارت کر کے غیر ضروری اخراجات بچانے کے بجائے انہوں نے مخالف راہ اختیار کی۔ وسائل جنگی تیاریوں میں جھونکے جاتے رہے۔ کارخانوں، اسکولوں، اسپتالوں کے بجائے روپیہ ٹینکوں، طیاروں اور تباہ کن بحری جہازوں پر لگتا رہا۔ جو بویا کاٹنا تو وہی تھا۔

یہ صورت حال تو دوسری دنیا کے مقابلے میں جنوبی ایشیا کی ہے۔ جس کا سامنا جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو تقابلی مطالعے اور مشاہدے سے کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح پاکستان سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو بھارت کے تقابلی مطالعے اور مشاہدے کے بعد ایک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت ہم اپنے آپ کو اسی تک محدود رکھنا چاہیں گے۔

بھارت کو کیا کرنا چاہیے؟

جو کرنا چاہیے تھا، وہ کیا ہے یا نہیں؟

اس کا جائزہ لینا۔ بھارتی صحافیوں اور دانشوروں کی ذمہ داری ہے۔ وہی بھارت کو یہ بتا سکتے ہیں کہ اسے جو کرنا چاہیے تھا کیا یا نہیں۔

ہمیں تو اپنا جائزہ لینا ہے۔ اپنے گریبان میں جھانکنا ہے کہ ہمیں جو کچھ کرنا چاہیے تھا کیا یا نہیں۔

اس کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ نہ اس سے حقیقت پر ضرب پڑتی ہے کہ پاکستان کا سب سے بڑا دشمن بھارت ہے۔ بھارت بھی پاکستان کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے۔ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے دشمن کو اچھی طرح جاننا ضروری ہے۔ مقابلہ صرف

فوجی نہیں ہوتا ہے۔ یہ معیشت میں ہوسکتا ہے، تعلیم کے میدان میں ہوسکتا ہے۔ ٹیکنالوجی اس کا محور بن سکتی ہے۔ آبادی پر کنٹرول اس کا ہدف بن سکتا ہے۔ اچھی حکمرانی اس کا موضوع بن سکتی ہے۔ شعبہ کوئی بھی ہو۔ اس میں مقابلے کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔ مدمقابل کی صلاحیت' اہلیت اور ہنر مندی سے واقفیت ہی مضبوط دفاعی پوزیشن اختیار کرنے اور کسی مناسب وقت پر حملہ کرنے میں معاون ہوسکتی ہے۔

یہ کہا جاتا ہے جو کسی حد تک درست بھی ہے کہ پاکستان میں جمہور کی حکمرانی اور سیاسی عمل کا تسلسل نہیں رہا ہے۔ اس لیے یہاں مسائل زیادہ جڑ پکڑتے رہے ہیں۔ اقتدار میں عوام کی شراکت مسلسل نہیں رہی۔ اس لیے عوام کی پریشانیاں دور نہیں ہوسکی ہیں۔ یہاں بار بار نافذ ہونے والے مارشل لاء کے باعث فرقہ پرستی، صوبائی تعصبات، لسانی رنجشوں اور دہشت گردی نے جنم لیا ہے۔ لیکن جب بھارت پر نظر ڈالتے ہیں جہاں آزادی کے پہلے دن سے اب تک سیاسی حکومتیں ہی رہی ہیں۔ جو معروف جمہوری اصولوں کی مطابقت سے وجود میں آتی رہی ہیں۔ جمہوریت کا تسلسل رہا ہے۔ وہاں مسائل کیوں حل نہیں ہوسکے ہیں۔ غربت دور کیوں نہیں ہوسکی ہے۔ فسادات کیوں ہوتے رہتے ہیں۔ کشمیر کے عوام کو حق خودارادیت کیوں نہیں دیا گیا۔ مسلمان ظلم وستم کا شکار کیوں ہوتے رہتے ہیں۔ نچلے طبقے کے ہندو ابتر حالت میں کیوں زندگی گزار رہے ہیں۔ وہاں تو اب تک صرف سیاستدانوں نے ہی فیصلے کیے ہیں اور ان پر عملدرآمد بھی ان کے اختیار میں ہی رہا ہے۔

پاکستان میں بھارت کے مختلف شعبوں کا تحقیقی اور تفصیلی مطالعہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے باقاعدہ سرکاری اور غیر سرکاری محکمے قائم ہونے چاہئیں۔ یونیورسٹیوں میں انڈین اسٹڈیز کے شعبے کھلنے چاہئیں۔

آیئے کچھ بنیادی معلومات ملاحظہ کریں۔

رقبہ: 3.29 ملین مربع کلومیٹر۔

سیاسی نظام: 1950ء میں منظور شدہ آئین کے تحت پارلیمانی نظام حکومت، دو ایوانی، مقننہ، تین شاخیں، انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ۔ وفاقی ڈھانچہ، ریاستوں اور یونین کے علاقوں میں منتخب حکومت۔

آبادی: 1027 ملین (ایک ارب دو کروڑ ستر لاکھ)

شرح پیدائش: 2.14 فیصد۔

اوسط عمر: مرد 62 سال۔ عورت 64 سال۔

شرح تعلیم: 65.38 فیصد۔

مجموعی ملکی پیداوار: 19895 ارب روپے۔

مجموعی ملکی پیداوار کی شرح: 6 فیصد۔

شرح افراط زر: 6.6 فیصد۔

ڈالر کی قیمت: 45.51 روپے۔

برآمدات: 38 ارب ڈالر

کاٹن یارن، ٹیکسٹائل، تیار شدہ گارمنٹس، چمڑے کی مصنوعات، ہیرے، زیورات، زرعی پیداوار، ٹرانسپورٹ مصنوعات، سوفٹ ویئر، بجلی کی مصنوعات۔

حکومت پاکستان کے سرکاری مؤقف کے مطابق بھارت سے جو معاملات اب تک تصفیہ طلب ہیں۔ ان میں مرکزی حیثیت کشمیر کو حاصل ہے، جس پر تین بار بھارت سے جنگ بھی ہوچکی ہے۔ دیگر تنازعات یہ ہیں۔

سیاچن۔

ولر بیراج۔

سرکریک۔

سفارتی عملے سے بدسلوکی۔

ویزے کے اجراء سے متعلق مسائل۔

جوناگڑھ اسٹیٹ کا تنازعہ۔

قدرتی طور پر آپ سب سے پہلے دفاعی طاقت جاننا چاہیں گے۔

اس کا تقابلی مطالعہ یوں کریجیے۔

	بھارت	پاکستان
کل مسلح افواج (حاضر)	1145000	587000
محفوظ	528400	513000
بری فوج	980000	520000
بحریہ	55000	22000

فضائیہ	110000	45000
پیراملٹری	1088000	247000

بھارت کی پیراملٹری قوت میں نیشنل سکیورٹی گارڈز (7400) پروٹیکشن گروپ (3000) اسپیشل فرنٹیئر فورس (9000)، راشٹریہ رائیفلز (40000) ڈیفنس سکیورٹی کور (31000) انڈوتبت بارڈر فورس (32200) آسام رائفلز، (52510) ریلوے پروٹیکشن فورسز (70000)' سینٹرل انڈسٹریل سکیورٹی فورس (88600) سنٹرل ریزرو پولیس فورس (165300) بارڈر سکیورٹی فورس (185000) ہوم گارڈز (محفوظ) (472000) اسٹیٹ آرمڈ پولیس (400000) سول ڈیفنس (محفوظ) (394000) کوسٹ گارڈز (4000)۔

پاکستان کی پیرا ملٹری قوت میں نیشنل گارڈز (185000) فرنٹیئر کور (35000)' پاکستان رینجرز (25000)' میری ٹائم سکیورٹی ایجنسی (2000) اور کوسٹ گارڈز شامل ہیں۔

بھارت کی فوجی تعداد سے مرعوب نہیں ہو جانا چاہیے۔ آبادی اور رقبے کے تناسب سے موازنہ کیا جانا چاہیے۔

دونوں ملک جدید ترین اسلحے کے حصول کے لیے کوششیں جاری رکھتے ہیں۔ بجٹ کا بڑا حصہ دفاع پر خرچ ہوتا ہے۔ جس کا اثر اقتصادی ترقی پر پڑتا ہے۔ بھارت کی شرح نمو 3 فیصد سے 4 فیصد تک ہے۔ ایسا ملک جہاں دنیا کی ایک چوتھائی غریب آبادی رہتی ہے۔ وہاں یہ شرح انتہائی شرمناک ہے اور اس ملک کے اقتصادی ذمہ داریوں کی صریح ناکامی بھی ہے۔

ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عالمی تجارت میں بھارت کا حصہ ان دنوں 2 فیصد بھی نہیں ہے۔ 1950ء میں آزادی کے صرف تین سال بعد ایک سابقہ کالونی کی حیثیت سے یہ جتنا تھا۔ اس سے بھی کم ہے۔

بھارت کے اقتصادی ماہرین اور میڈیا کی طرف سے اس صورتِ حال پر تشویش ظاہر کی جاتی ہے اور وہ مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں کہ حالات میں بہتری لائی جائے۔

بھارت کے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر جون 2001ء کے آخر میں 43 بلین ڈالر تھے۔ (پاکستان کے اس وقت 6 بلین ڈالر ہیں)۔

بھارت نے نوے کی دہائی کو اقتصادی اور اصلاحات کے عشرے کے طور پر منایا۔

معیشت کے زاویے یکسر بدل دیے گئے۔ قواعد و ضوابط میں تبدیلیاں لائی گئیں اور سیاسی پارٹیوں نے آپس میں یہ مفاہمت بھی کی کہ حکومتی پارٹی کی تبدیلی اقتصادی اصلاحات پر اثر انداز نہیں ہونی چاہیے۔ سب سے بنیادی تبدیلی یہ لائی گئی کہ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سرمایہ بھارت لانے کے لیے معیشت کو آزاد کر دیا گیا اور دنیا بھر میں سرمایہ کاروں کو اس امر پر قائل کرنے کی کوشش کی گئی کہ بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ جہاں جمہوری اقدار کو ہمیشہ بالا دستی رہتی ہے۔ جمہوری استحکام ہے۔ اس لیے سرمایہ محفوظ رہے گا۔ مزدور سستے ہیں۔ خام مال دستیاب ہے۔ بجلی، پانی سب کچھ میسر ہے، امن و امان ہے۔

سرکاری طور پر درج ذیل 16 فوائد کی تشہیر کی گئی۔

آزادی کے 50 سے زیادہ برسوں میں مستحکم جمہوری ماحول۔

بڑے سائز کی مارکیٹ جس میں 250 سے 350 ملین مڈل کلاس آبادی ہے۔ جس کی قوت خرید مسلسل بڑھ رہی ہے۔ جس کا اظہار حالیہ برسوں میں عام استعمال کی اشیا کی خریداری میں بے حساب اضافے سے ہوتا ہے۔

علاقائی یکجہتی کے دائرہ کار کی رکنیت کے ذریعے علاقائی بین الاقوامی مارکیٹوں تک رسائی، جیسے سارک۔

حساس سیکٹروں مثلاً دفاع اور ایٹمی توانائی کے علاوہ تقریباً ہر سیکٹر میں غیر ملکی سرمایہ کاری کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ ملک بھر میں صنعتوں کے لیے وسیع اور متنوع ڈھانچہ موجود ہے۔

ٹیکنالوجی، جدت اور علم کی بنیاد پر زور۔
مینوفیکچرنگ کی بھرپور استعداد، ہر شعبے میں رابطہ۔
ریسرچ اور ڈویلپمنٹ کا بھرپور انفرااسٹرکچر، ٹیکنیکل اور مارکیٹنگ کی خدمات۔
فطری دولت کے غیر استعمال شدہ کثیر وسائل۔
انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی کرتی ہوئی صنعت میں روشن مستقبل۔
ترقی دیا گیا بینکاری نظام۔ 63000 سے زیادہ برانچوں پر مبنی کمرشل بینکنگ نیٹ ورک۔
متحرک کیپٹل مارکیٹ۔ 23 اسٹاک ایکس چینج، جن میں 9000 کمپنیاں شامل فہرست ہیں۔
بھارت مالیت کی بنیاد پر مقابلہ کرتی ٹیکنیکل محنت کشوں کی ایک بڑی قوم کی حیثیت سے آگے بڑھ رہا ہے۔
غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے بہت سازگار ماحول، جہاں آنے جانے، سرمایہ لگانے، جگہ چننے، ٹیکنالوجی کے انتخاب، درآمد برآمد کی آزادی ہے۔
پرائیوٹائزیشن کا عمل تیزی سے جاری ہے اور سرکاری تحویل میں صنعتوں کی از سر نو تنظیم۔
کرنٹ اکاؤنٹ کیپٹل اکاؤنٹ کی منتقلی کی سہولت، غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے اور بتدریج عملدرآمد بھارتی شہریوں کے لیے۔
آزاد عدلیہ، ایک درجہ بدرجہ قائم شدہ نظام۔
سرکاری طور پر بھارت کی اقتصادی ترقی کا بہت شور مچایا جاتا ہے۔ لیکن خود بھارت کے اقتصادی ماہرین اس ترقی سے مطمئن نہیں ہیں۔ پبلک سیکٹر کے اقدامات پر سخت تنقید ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سیکٹر میں فنڈز کا ضیاع بہت ہو رہا ہے۔ قرضوں کا بڑا جال، ایک طویل المیعاد تشویش ہے۔ کاغذ پر سود کی شرح 8 فیصد درج کی جاتی ہے جبکہ حقیقت میں 10 سے 12 فیصد تک ہے۔ بیرونی آزادیوں کی بات زیادہ کی جاتی ہے۔ حالانکہ پہلے اندرونی طور پر آزادی کی ضرورت ہے۔
موجودہ حکومت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ معاشی پالیسیوں پر عملدرآمد میں بالکل ناکام رہی ہے۔ موجودہ مالی سال 03-2002ء کے بجٹ نے صنعت کاروں کو پریشان کر دیا ہے۔ اس میں توسیع اور ترقی کے لیے کوئی محرک نہیں رکھا گیا۔ مطلوبہ بینک اصلاحات نہیں کی گئیں۔ پرائیوٹائزیشن کا عمل رک گیا ہے۔ کسانوں اور غریبوں کے لیے مراعات کا اعلان نہیں کیا گیا۔ مڈل کلاس موجودہ حکمران جماعتوں کا سب سے زیادہ حمایت کرنے والا حلقہ ہے اس کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔
ویسے بھارت کی اصل قوت اسی مڈل کلاس کے 30 کروڑ ہیں۔ جن میں سے اکثر انگریزی بولنا پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔ اور بہت جارح منصوبہ بند Enterpreneur ہیں۔ اسی مڈل کلاس نے سمندر پار دیار غیر میں بھی اس رشتے کو مستحکم کیا ہے۔ اور بھارت کے سیاسی اور اقتصادی استحکام میں بھرپور تعاون کیا ہے۔ امریکا میں کیلی فورنیا کی سلی کون وادی اور ادھر بھارت میں بنگلور، حیدرآباد کے درمیان رابطے کی بہترین مثال ہیں۔ بعض امریکی ماہرین کے مطابق قواعد وضوابط سے آزادی کے ایک عشرے میں سوفٹ ویئر کی برآمدات نے بھارت کو دنیا کی تیز ترین ترقی کرتی معیشتوں میں سے ایک بنا دیا ہے۔
بھارت سرد جنگ کے دوران روس سے بہت قریب تھا اور اس سے کئی طویل المیعاد اقتصادی اور دفاعی معاہدے بھی تھے۔ پاکستان امریکی بلاک سے وابستہ تھا۔ سیٹو اور سینٹو کا رکن تھا۔ اس لیے بھارت نے امریکا مخالف کردار اختیار کیا۔ لیکن سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا نے اس بڑی مارکیٹ کو اپنانے کے لیے پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ افغانستان سے روسی تسلط کے خاتمے کے بعد امریکا کو پاکستان کی چنداں ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ بل کلنٹن کے دورے سے پاک بھارت معاشقے کا آغاز ہوا۔ لیکن یہ عشق ابھی پوری طرح پروان نہیں چڑھا تھا کہ القاعدہ کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر مبینہ حملوں کا ہولناک واقعہ رونما ہو گیا۔ 11 ستمبر کی اس دہشت گردی کے بعد دنیا ہی تبدیل ہو گئی امریکا کو پھر پاکستان کی

ضرورت پڑگئی۔ پاکستان پھر ایک بار فرنٹ لائن اسٹیٹ بن گیا۔ امریکا اور یورپی یونین کے نزدیک پاکستان کی اہمیت بڑھ گئی۔ کیونکہ افغانستان میں القاعدہ کے اسامہ بن لادن اور دیگر مجاہدین کے خلاف کارروائی پاکستان سے ہی ہوسکتی تھی۔ اسلام آباد میں دنیا بھر کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے لوگ فوج درفوج پہنچنا شروع ہوگئے۔ پاکستان آزاد دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ امریکا اور یورپ نے پاکستان پر عائد وہ سب پابندیاں اٹھالیں جو 1998ء میں ایٹم بم کے دھماکے کے بعد لگائی گئی تھیں اور وہ بھی جو 12 اکتوبر 1999ء میں فوجی حکومت کے قیام کے نتیجے میں عائد کی گئی تھیں۔

بھارت کے لیے یہ بڑا مایوس کن مرحلہ تھا۔ بھارت تو برسوں سے اس کوشش میں تھا کہ پاکستان کو دہشت گرد مملکت قرار دلوائے۔ اس کے لیے کشمیر میں مجاہد تنظیموں کی سرگرمیاں اور پاکستان میں موجود تنظیموں کی طرف سے علی الاعلان ان کی حمایت اور دعوے اس کے لیے واضح ثبوت تھے۔ کئی بار عالمی رائے عامہ کو اس نے اس کے لیے آمادہ کرلیا تھا۔ لیکن نئی صورتِ حال میں اس کے لیے اپنے ان عزائم کو عملی جامہ پہنانا مشکل ہوگیا۔ اِدھر پاکستان کی فوجی حکومت نے فرقہ پرست تنظیموں اور جہادی گروپوں کو خلافِ قانون بھی قرار دینا شروع کردیا۔

اب اس نے اپنے مغربی دوستوں کے ساتھ صلاح ومشورے کے بعد یہ مہم چلائی کہ پاکستان نے یہ پابندی برائے نام لگائی ہے۔ یہ تنظیمیں اب بھی سرگرم ہیں۔ کئی مقامات پر دہشت گردی کے واقعات ہوئے۔ بہت باریک بینی سے منظم طور پر یہ واقعات سری نگر اسمبلی، بھارتی پارلیمنٹ پر کروائے گئے اور انہیں بھارت کی جمہوریت پر حملہ قرار دیا گیا۔ دنیا بھر میں واویلا کیا گیا کہ پاکستان کی طرف سے لائن آف کنٹرول پار کی جارہی ہے اور سرحد پار دہشت گردی جارہی ہے۔ یہ تحریک آزادی نہیں ہے، یہ دہشت گردی ہے۔

13 دسمبر 2001ء کو بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کے بعد بھارت نے اپنی مسلح افواج پاکستان کی سرحد کے قریب تعینات کردیں اور کسی بھی وقت پاک بھارت جنگ اور اس کے بعد ایٹمی تصادم کے خطرات بڑھ چکے ہیں۔

اس ساری صورت حال میں اپنے اس دشمن کے بارے میں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ پاکستان کے مقابلے میں عالمی رائے عامہ کو متاثر کرنے میں کس طرح کامیاب ہوجاتا ہے۔

بھارت کا سب سے کامیاب ہتھیار تو جمہوری تسلسل ہے۔ ایک ارب آبادی رکھنے والی یہ واحد پارلیمانی جمہوریت ہے۔ اور گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصے سے وہاں حکومتیں معروف جمہوری طریقہ کار سے ہی آتی رہی ہیں۔ کبھی فوج نے اقتدار پر قبضہ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ وہاں کی فوج بھی برطانیہ سے تربیت یافتہ ہے۔ لیکن وہاں فوج میں کسی ایک علاقے کا غلبہ نہیں ہے۔

بھارت کا دوسرا کامیاب ہتھیار سیکولرازم ہے۔ عملی طور پر اگرچہ بھارتی معاشرے کی اکثریت کٹر ہندومت کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن آئین میں تمام مذاہب کو تحفظ دیا گیا ہے۔

اپنے بڑے رقبے اور آبادی کو آزاد مارکیٹ کے دور میں بھارت نے ایک کامیاب وسیلہ بنایا ہے۔ دنیا بھر کی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی مصنوعات کے لیے اتنے زیادہ خریداروں والے ملک کو نظرانداز نہیں کرسکتی ہیں۔

اپنی سوسائٹی کو روشن خیال اور لبرل دکھانے کے لیے بھارت نے پرائیوٹ ٹی وی چینلوں کا جو دریچہ وا کیا ہے اس سے باہر والوں کو ایک بڑی چمکتی دمکتی دنیا دکھائی جاتی ہے۔ جس میں کوئی اخلاقی پابندی نہیں ہے۔ مغرب جیسی اقدار ہیں، مخلوط دعوتیں۔ نت نئے فیشن، مذہبی اور معاشرتی پابندیوں سے آزاد نوجوان، تیزی سے ترقی کرتے تاجر حلقے، یہ سوسائٹی عملی طور پر بھارت میں بہت کم موجود ہے۔ لیکن غیرملکی سرمایہ کاری کو پرکشش بنانے کے لیے ٹیلی ویژن چینل یہ رنگین ماحول دکھا رہے ہیں۔

بیرونی دنیا میں مقیم بھارتی شہری بالخصوص بھارتی نژاد امریکی اپنے ملک کی ترقی کے لیے نہ صرف نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں بلکہ وہ امریکی اور بھارتی حکومت کے درمیان انتہائی مؤثر لابی بنے ہوئے ہیں۔ اپنے ملک کی جمہوریت، شناخت اور سیکولر چہرے کی بہت زیادہ پروجیکشن کرتے ہیں۔ بڑے منظم اور مہذب انداز میں وہ حکومتوں اور معاشروں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اپنے وطن میں بھی ان کو بہت زیادہ قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی وطن آمد پر ان کی بہت تکریم و تعظیم کی جاتی ہے۔

امریکا سمیت دوسرے غیر ممالک میں مقیم بھارتی اپنی الگ الگ سیاسی، مذہبی، سماجی تنظیمیں بنا کر نہیں رہتے ہیں۔ ان کی سیاسی جماعتوں کی بیرونی ملک شاخیں نہیں ہیں۔ وہ غیر ممالک میں اکٹھے ہو کر رہتے ہیں۔ تقسیم کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں۔ اپنے قومی دن ایک جگہ اور ایک ساتھ مناتے ہیں۔

ان کے سفارتکار بھارت کے وقار اور ساکھ کو بڑھانے کے لیے دن رات مصروف رہتے ہیں۔ انڈین ازم کا جارحانہ مظاہرہ کرتے ہیں۔ ملک کے لیے غیر ملکی سرمایے کی کشش، سیاحت کے لیے ترغیبات کی مہمیں چلاتے رہتے ہیں۔

بھارت نے جاگیرداری کو آزادی کے فوراً بعد بڑی حد تک محدود کر دیا تھا۔

انتظامی طور پر جہاں اور جب نئے صوبے بنانے کی ضرورت ہوئی انہوں نے اس میں دیر نہیں لگائی۔

آئین سازی کا مرحلہ بھی بھارت نے جلدی طے کر لیا تھا۔

ایک بنیادی ترجیحی فائدہ بھارت کو یہ بھی رہا ہے کہ یہ نیا ملک نہیں تھا۔ صدیوں پرانا ملک تھا۔ اس لیے اسے کسی نئی مملکت کی طرح ہر شعبے میں جدوجہد کرنا نہیں پڑی۔ پاکستان بننے پر جتنے ہندو ادھر سے بھارت گئے وہ اسی سوسائٹی میں گھل مل گئے۔ انہوں نے اپنی الگ شناخت کے لیے کوئی مسائل پیدا نہیں کیے۔

اپنے آپ کو دفاعی طور پر مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے بھارت میں فوج کو شہریوں اور سیاستدانوں پر سیاسی اور اقتصادی قبضے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ سیاستدانوں نے فوجی ضروریات کو اہمیت دی اور انہیں پورا کیا۔

بھارت نے ایٹمی توانائی اور ایٹمی دفاعی پروگرام کو ابتداء سے ہی اہمیت دی اور اسے تکمیل تک پہنچا کر 1947ء میں اس کا تجربہ بھی کر لیا۔ عالمی رائے عامہ کو زیادہ شور مچانے اور ہنگامے کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

ان اہم اور کلیدی امور کے علاوہ بھی بہت سے ایسے ناقابل ذکر نکات ہیں جن کی بنیاد پر بھارت علاقے کی غالب قوت بنتا رہا ہے۔

اہل پاکستان کو انتہائی سنجیدگی، دانشمندی اور غیر جذباتی انداز میں منصوبہ بندی کر کے بھارت کا ان تمام شعبوں میں مقابلہ کرنا ہوگا۔

یہ تجاویز بھی آتی ہیں کہ پاکستان جنوبی ایشیا سے قطع تعلق کر کے مشرق وسطیٰ اور خلیج کا سرگرم رکن بن جائے یا اب وسطی اشیا سے ناتا جوڑنے کے مشورے دیے جا رہے ہیں۔ یہ تجاویز اپنی جگہ قابل عمل ہو سکتی ہیں لیکن بھارت سے قطع تعلق ایک غیر فطری، غیر منطقی عمل ہوگا۔ مسائل اور تنازعات کا حل ناگزیر ہے۔ مسائل کو ٹالنا مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہمسائیگی ختم نہیں ہو سکتی۔

کشمیر کا مسئلہ کشمیریوں کی خواہشات کے مطابق حل ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اس خطے میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

پاکستان بھارت اور اس خطے کے دوسرے ملکوں کے عوام کا غربت، پسماندگی، بے روزگاری، بے سروسامانی ہمیشہ مقدر نہیں رہنا چاہیے۔ یہ سب محنت کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کا آپس میں کوئی تنازع نہیں ہے۔

پاکستان کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہ صرف دفاعی طور پر مستحکم کرے بلکہ اقتصادی، تہذیبی، صنعتی، تعلیمی اور ثقافتی طور پر قوت بننا بھی وقت

کا تقاضا ہے۔ یہ منزل پوری قوم سرگرم اور متحد ہو کر حاصل کر سکتی ہے۔

جن شعبوں میں ہم بھارت سے پیچھے رہ گئے ہیں مثلاً جاگیرداری کا خاتمہ، نئے انتظامی صوبے، تعلیم کی شرح میں اضافہ، وہاں آگے بڑھنا ضروری ہے۔ بیرونی ملکوں میں پاکستانیوں کی شناخت صرف پاکستان ہونی چاہیے۔ اپنے سیاسی، لسانی، صوبائی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو اپنے ساتھ برآمد کر کے باہر لے جانے سے پاکستان کی عزت اور قوت مجروح ہو جاتی ہے اس لیے باہر سیاسی جماعتوں، مذہبی تنظیموں کی ذیلی شاخیں نہیں ہونی چاہئیں۔

اس بار فوجی حکومت نے یہ پروگرام بتایا ہے کہ وہ ملک کو ایک مضبوط دیرپا اور عوام کے مزاج کے مطابق ایسا جمہوری نظام دے کر جائے گی جو بتدریج اتنا مستحکم ہو جائے کہ فوج کو پھر مداخلت نہ کرنی پڑے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو اگر ایسا ہو گیا تو ہمارے ہاں جمہوری عمل کو تسلسل مل گیا تو ہم بھی امریکا اور یورپ میں سر اٹھا کر چل سکیں گے۔ اپنی جمہوری شناخت کے حوالے سے مغربی معاشروں سے معاملات طے کر سکیں گے۔

عالمی رائے عامہ کے سامنے ہم بھارتی حکومت کی ناکامیوں کو اجاگر کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں رہے ہیں۔ کیونکہ پہلے تو یہ کہ پاکستانی متحد نہیں ہیں۔ بھارت دانشوروں، صحافیوں اور سفارت کاروں کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں یا صرف جذبات سے کام لیتے ہیں۔ حقائق کا تجزیہ نہیں کرتے۔

بھارت کی قیادت نے اپنی جن ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا ہے اور جن کوتاہیوں کو چھپانے کے لیے وہ جارحانہ رویہ اختیار کرتا ہے ہم ان کو بے نقاب کیوں نہیں کرتے ہیں اب انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے، عالمی رائے عامہ جس زاویہ نگاہ سے اور جس انداز فکر سے حالات کا جائزہ لیتی ہے، تجزیہ کرتی ہے ہمیں بھی اس کسوٹی سے بھارت کے منفی پہلوؤں کو پرکھنا چاہیے اور ان کی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنی چاہیے۔ ہمارا اپنا مذہبی نقطہ نظر جذباتی ذریعہ اظہار عالمی رائے عامہ کو متاثر نہیں کر سکتا۔ وہ جو ہم نے بتا چکے ہیں ہم ان کو استعمال کر کے ہی ان کو قائل کر سکتے ہیں اور اس کے لیے بے شمار مواقع موجود ہیں۔ بھارت میں حقوق انسانی کو پامال کیا جاتا ہے۔ حکومتی سطح سے معاشرتی سطح پر ذات پات کی ہولناک تقسیم ہے۔ مذہب کی بنیاد پر، بھارت میں غربت کی سطح سے نیچے لوگ رہ رہے ہیں اور بھارت ایٹمی پروگرام پر اربوں ڈالر خرچ کر رہا ہے۔ پینے کا پانی بہت بڑی آبادی کو نصیب نہیں ہے۔ کشمیر بھارت کے غاصبانہ اور توسیع پسندانہ عزائم کی سب سے بڑی مثال ہے۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے صوبوں میں بھی اسی طرح حقوق غصب کیے جا رہے ہیں۔

سیکولرازم کا دعویٰ ہے لیکن مسلمانوں، عیسائیوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ ہم اپنی اس مہم میں اس وقت کامیاب ہو سکیں گے کہ ہم ساتھ ساتھ اپنی کمزوریوں کو بھی دور کرتے جائیں اور بیرونی معاملات میں ہماری ایک فکر ہونی چاہیے۔ ہمیں اپنے سائز، اپنی دفاعی، سیاسی، سماجی حیثیت کے مطابق منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔

اس تشویش یا خوف میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم بھارت کے مقابلے میں ایک چھوٹا ملک ہیں۔ دنیا میں بہت سے چھوٹے ملکوں نے بے مثال ترقی کی ہے۔ سنگاپور اس کی بہترین مثال ہے۔ جس کا رقبہ بڑا نہیں ہے۔ زرعی اراضی نہیں ہے، دریا نہیں ہیں، پھر بھی اس کی معیشت مضبوط ہے۔ برآمدات بہت ہیں۔ بڑے ملک کی بڑی مارکیٹ تو ہوتی ہے لیکن اسے سنبھالنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ چھوٹا ملک زیادہ Managable ہوتا ہے۔ اسرائیل بھی عربوں کے مقابلے میں چھوٹا ملک ہے۔ اس نے بھی پروا نہیں کی کہ عرب زیادہ بڑی مارکیٹ ہیں۔ اس نے اپنے جارحانہ انداز سے ثابت کر دیا ہے کہ چھوٹے ملک کس طرح بقا حاصل کر سکتے ہیں۔

بھارت کے جمہوری، دفاعی، اقتصادی، زرعی، ایٹمی اور تجارتی نظام کے مسلسل مطالعہ، مشاہدے اور تجزیہ کے لیے ملک بھر میں غیر سرکاری ادارے قائم

ہونے چاہئیں اور ان کے مطالعے کے نتائج مسلسل عوام کے سامنے لائے جائیں تاکہ عوام میں مقابلے کی ترغیب پیدا ہو۔ اب تک عوام اسی خیال میں رکھے گئے ہیں کہ بھارت کا مقابلہ فوج کرے گی، کشمیر کا مسئلہ بھی فوجی انداز سے حل ہوگا، عوام صرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر فوج کو مضبوط بناتے رہیں تو وہ بھارت کے مقابلے میں محفوظ رہیں گے۔ یہ بنیادی طور پر غلط بات ہے۔ عوام کو بھی اس مقابلے میں پوری طرح حصہ لینا ہوگا۔ یہ ان کی آزادی، سلامتی اور بقا کا سوال ہے۔

آ گرے میں امن کی تلاش

11 جولائی 2001ء

اس بار کمپیوٹر کے لکھے پر پکڑے نہیں گئے ہیں۔ امیگریشن والوں نے پاسپورٹ پر جلد مہر لگا دی ہے۔ اور میں وہ کنٹرول لائن عبور کر آیا ہوں۔ جو 3 سال پہلے دس گھنٹے تک میرے اور دہلی کے درمیان حائل رہی تھی۔ معلوم نہیں میں مستقل طور پر بھارت کی بلیک لسٹ سے نکل گیا ہوں۔ یا یہ صرف اسی سرکاری دورے کی بدولت ہے۔ مقصد اس بار بھی پاک بھارت دوستی ہے۔ جنوبی ایشیا میں امن کا قیام ہے۔ صحافیوں کا ایک بڑا قافلہ قربتوں کی خواہش لیے دہلی ایئر پورٹ پر اترا ہے۔

ایک بس ہمیں موریہ شیرٹن ہوٹل کی طرف لے کر چل پڑی ہے۔ وہی دلی ہے۔ وہی رکشوں، ٹیکسوں، بسوں اور کاروں سے بھری سڑکیں۔ وہی غربتوں میں رنگے سپاٹ چہرے حیران آنکھیں چوراہوں پر بھیک مانگتے بچے اور بڑے۔

ہریالی میں گھرے۔ جیومیٹری کی مختلف شکلوں میں ڈھلے ہوٹل میں داخل ہوتے ہیں تو مسکراتی ہوئی حسینائیں موتیے کے ہار اور ایک تھال میں روشن دیے لیے ہمارا سواگت کر رہی ہیں۔ ٹی وی کیمرے، چینل رپورٹرز بھی بکھرے ہوئے ہیں۔

میری خوش قسمتی کہ چودھویں آسمان پر جہاں کمرہ ملا ہے۔ پاکستان ہائی کمیشن نے اسی منزل پر میڈیا سینٹر قائم کر رکھا ہے۔ جہاں انٹرنیٹ ہے۔ ای میل فیکس اور ٹیلی فون کی سہولتیں ہیں۔ فوٹو اسٹیٹ مشین ہے۔

28 سال پہلے شملے میں صرف ٹیلی فون اور ٹیلیکس تھا۔ خبریں بھیجنے کے ذرائع محدود تھے۔ اب تو کسی بھی لمحے کہیں بھی رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میڈیا سینٹر کے سب فیکس مصروف ہو گئے ہیں۔ کوئی ڈاکومنٹ نہیں بھیجا جا رہا ہے۔

اپنے گھر والوں عزیز و اقارب کو دنیا میں کہیں بھی رہتے ہوں۔ انہیں اطلاع دی جا رہی ہے کہ ہم دہلی پہنچ گئے۔ ہیں بہت سے عزیزوں کو تو ایک مدت سے فون نہیں کیا تھا کہ گھر کے فون سے رابطہ کرنے سے بل بہت آ جاتا ہے۔ پاکستانی عام ہو یا خاص۔ اس کا اصول یہ ہے کہ اپنی جیب صرف بھرنی چاہیے۔ سرکاری خزانہ صرف خالی کرنا چاہیے۔ اس لیے یہ مفت کا آئی ایس ڈی، ملتے ہی تمام رشتے دار یاد آ گئے ہیں۔ رشتے دار بہت ممنون ہیں کہ دلی میں بھی ہمیں یاد رکھا ہے۔

ٹی وی چینل بھارت میں بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ ان کا آپس میں سخت مقابلہ ہے، دوڑ لگی ہوئی ہے پاکستانی صحافیوں سے انٹرویوز کی۔ ہم سب ہی امور خارجہ کے ماہرین بن گئے ہیں۔ صدر مشرف، وزیر اعظم واجپائی اور وزرائے خارجہ کو قیمتی مشورے دے رہے ہیں پاکستان بھارت قریبی ہمسائے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان انمٹ دوریاں ہیں۔ جو 54 سال سے دور نہیں ہو سکیں۔ اب چینلوں پر آنے والے ماہرین کی توقعات ہیں کہ یہ فاصلے مٹ جائیں گے دونوں رہنما بہت مخلص ہیں۔ بیرونی دباؤ اتنا ہے۔ پہلے سے دستاویزات تو تیار ہی ہوں گی۔ یہ تو صرف اوپر کا دکھاوا ہے۔

ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ کے ایڈیٹر ترن وجے اپنی ٹیم لے کر آ گئے ہیں۔ پانچ جنیہ نے پاک بھارت مذاکرات کے لیے عوام سے ایجنڈا مانگا۔ انہوں نے سوچا کہ اس مقابلے میں اگر پاکستان سے جنگ

گروپ شامل ہو جائے تو اس سے دونوں طرف کے عوام میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگی۔ دی نیوز کے حالات حاضرہ کے ایڈیٹر امتیاز عالم سے انہوں نے رابطہ کیا۔ امتیاز صاحب نے یہ تجویز ہماری طرف بڑھا دی۔ پھر ترن وجے صاحب سے مسلسل رابطہ رہا۔ اور بالآخر یہ طے پا گیا کہ 'جنگ' اور 'پانچ جنیہ' مل کر پاکستان اور بھارت کے عوام کو دعوت دیں گے کہ وہ اس مقابلے میں حصہ لیں۔ پاکستان سے جیتنے والے کو بھارت کی سیر کروائی جائے اور بھارت سے جیتنے والے کو پاکستان کا دورہ کروایا جائے۔

اس مشترکہ مقابلے کا اعلان ہوتے ہی بھارتی اخبارات نے لکھا کہ (آگرہ چوٹی کانفرنس) میں پاکستان بھارت ایک دوسرے سے کوئی معاہدہ کریں یا نہ کریں۔ پاکستان کے سب سے بڑے اخباری گروپ اور آر۔ایس۔ایس کے ترجمان پانچ جنیہ نے آپس میں معاہدہ کرلیا ہے۔

ترن وجے امتیاز عالم سے ملے تھے۔ ہماری پہلے ملاقات نہیں تھی۔ مگر فون پر روزانہ ہی بات ہوتی رہی ہے۔ اس لیے اب اجنبیت نہیں ہے۔ وہ اگلے روز پاکستانی صحافیوں کو استقبالیہ دے رہے ہیں۔ اس کے دعوت نامے سب کے لیے لائے ہیں۔

ہوٹل میں ایک گہما گہمی ہے۔ چہل پہل ہے۔ کچھ پاکستانی سابق بیورو کریٹ۔ سابق جنرل۔ ماہرین پہلے سے اسی ہوٹل میں موجود ہیں۔ جو پاک بھارت تعلقات کے ضمن میں ہونے والے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ امیدوں، آرزوؤں، خواہشات کے جھرمٹ میں لمحے گزر رہے ہیں۔

12 جولائی 2001ء

دہلی کی صبح، موریہ شیرٹن کے دریچے پر دستک دیتی ہے۔ ہوٹل کا سرسبز لان مجھے بلا رہا ہے۔ میں اس کی دعوت سے انکار نہیں کرسکتا۔ ہریالی اور آنکھوں میں کچھ گفتگو رہتی ہے میں واپس لفٹ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ پاکستان ہائی کمیشن کے ایک اہلکار بھاگے بھاگے آرہے ہیں۔

''آپ کو ابھی وزیراعظم کے انٹرویو کے لیے چلنا ہے۔ چلیں میں چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس بحث کا وقت نہیں ہے کہ کیا یہ اطلاع ابھی ملی ہے۔ کیا یہاں بھارت میں اسی طرح ہوتا ہے۔ یا پاکستان ہائی کمیشن ہمیں دیر سے بتا رہا ہے۔

کاغذ قلم سنبھال، ہم ہائی کمیشن کی گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔

ریس کورس روڈ سکیورٹی کی رکاوٹیں۔

جو ہر جگہ کھڑی کی جاتی ہیں۔

آگرہ کی شان، محبت کی پہچان، تاج محل

پھر استقبالیہ۔

کیمرے، موبائل فون نہیں جائیں گے۔ یہیں چھوڑ دیں۔

پھر سامان کی مشین سے اسکیننگ۔

جسم کی تلاشی۔

اب ہم ایک سڑک پر آگئے ہیں۔ پردھان منتری ہاؤس کی گاڑی آئے گی۔ جو ہمیں اس حصے میں لے کر جائے گی۔ جہاں پردھان منتری کا دفتر ہے۔

گاڑی نے ایک پورچ میں اتارا۔

''نمستے۔ آیئے۔ ادھر چلیے۔''

یہ وہ پینٹنگ ہے جو ایم ایف حسین۔ بھارت کے مشہور مصور صدر پاکستان کو دینا چاہتے تھے۔ لیکن پردھان منتری کو پیش کرتے ہوئے اس کی تصویریں

چھپ گئی ہیں۔ اس لیے اب حیرت کا عنصر نہیں رہا ہے۔ اب وہ یہ پینٹنگ نہیں کوئی نئی پینٹنگ انہیں دیں گے۔

ہم انتظار میں ہیں۔ چند لمحوں بعد ہی انٹرویو شروع ہو جائے گا۔

دریچے سے نظر آ رہا ہے۔ ایک گالف کارٹ، میں بھارت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی دروازے پر اترے ہیں۔ پھر دروازہ کھولا گیا۔ اور وہ آہستہ آہستہ اندر داخل ہو رہے ہیں۔ گھٹنوں کے آپریشن کے بعد وہ زیادہ دیر اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں رہ سکتے۔

27 سال پہلے کا دلی یاد آ رہا ہے۔ میں بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے انٹرویو کر رہا تھا۔ یہ پارلیمنٹ ہاؤس میں وزیر اعظم کا دفتر تھا۔ وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ دونوں ملکوں میں کتنے وزرائے اعظم آئے چلے گئے۔ اب میں اکیسویں صدی کے پہلے بھارتی وزیر اعظم سے انٹرویو کے لیے موجود ہوں۔

اس وقت دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات بھی نہیں تھے۔ میں شاید اکیلا پاکستانی ہوں گا جو اس وقت ہندوستان میں موجود تھا۔ اب تو ہمارے ساتھ ہی صحافیوں کی بڑی تعداد آئی ہے۔ روزانہ بس سے، ٹرین سے، پروازوں سے سیکڑوں پاکستانی آتے ہیں۔ اس وقت کے لوگوں نے پاکستان بھارت کے درمیان تعلقات کو بحال کرنے کی جو کوششیں کی تھیں، وہ رنگ لے آئی ہیں۔ تاریخ کا بہاؤ۔ دونوں ملکوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لا رہا ہے۔

"آیئے جناب۔ جنگ گروپ والے آ ئیں۔"

ایکسٹرنل پبلسٹی کے جواں سال انفرمیشن آفیسر سنجے ورما کی آواز مجھے واپس 2001 میں لے آئی ہے وقت کی سرنگ ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یا ہم وقت کی سرنگ سے گزرتے رہتے ہیں۔ ہمارا جسم ماہ و سال کی مار کھا کر فرسودہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ذہن ماہ و سال کو سمیٹتا رہتا ہے۔ اور ہمیشہ تر و تازہ رہتا ہے۔

ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ جہاں صرف چند کرسیاں لگ سکتی ہیں۔ کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے بڑے بڑے فانوس ہیں اور سجاوٹیں۔ مہاتما گاندھی کی تصویر ہے۔ دائیں طرف ایک تجریدی آرٹ کا فریم آویزاں ہے۔ سامنے کی میز اور سائیڈ کی میز پر زرد رنگ کے پھول ہیں۔

ایک ارب سے زیادہ آبادی کے ملک دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت۔ 23 سیاسی جماعتوں کے اتحاد کے نمائندے۔ ایٹمی دھماکہ کرنے والے۔ بھارت کے منتخب وزیر اعظم شری اٹل بہاری واجپائی سفید کرتے۔ سفید دھوتی۔ اور سیاہ واسکٹ میں ملبوس ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔ بھارت کی ترجمان نروپو ماراؤ ہیں۔ وزیر اعظم آفس کے سیکریٹری ٹنڈن جی ہیں۔ انفارمیشن آفیسر ہیں۔

'صبح بخیر'

آیئے بیٹھیے۔

'کیسے چل رہا ہے۔ آپ کا گروپ۔'

'آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔ گھٹنے کیسے ہیں۔'

'اب میں کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'

'یہ ہمارا اخبار ہے۔'' جنگ۔'

'جی۔ میں جانتا ہوں۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ یہیں دلی سے شروع ہوا تھا۔'

آپ بھی شاعر ہیں۔ میں اپنی شاعری کی کتابیں لایا ہوں۔ اور یہ ایک ناول ہے۔ 'شب بخیر' جس میں سیاستدانوں اور بیورو کریٹس کی رنگین شاموں کی کہانی ہے۔'

'شکریہ۔'

'آپ نے پہلے نظم لکھی تھی۔ اب ہمارے صدر کو بھارت کے دورے کی دعوت دینے کے بعد بھی آپ نے شعر لکھے۔'

'ہم نے لکھا تھا' جنگ نہ ہونے دیں گے۔ اور جنگ ہو گئی۔ اس کے بعد اس لیے نہیں لکھا کہ پھر جنگ نہ ہو جائے۔'

'پردھان منتری جی۔ میں شملے میں بھی تھا۔ 'جنگ' کی طرف سے میں نے شملہ معاہدے کی رپورٹنگ بھی کی تھی۔ اس وقت آپ کو ہم نے دیکھا تھا۔ آپ پاک بھارت مذاکرات کے خلاف مختلف

مقامات پر تقریریں کر رہے تھے۔ ایک چوک میں آپ کی تقریر میں نے بھی سنی تھی۔ اس وقت آپ پاک بھارت ڈائیلاگ کے خلاف تھے۔

'جی ہاں۔ اس وقت ہم اپوجیشن (اپوزیشن) میں تھے۔'

'اب آپ کی کیا امیدیں ہیں۔'

'دیکھیں۔ آپ کے صدر صاحب آرہے ہیں۔ بات چیت شروع ہو تو دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ہم تو امید کرتے ہیں کہ بات آگے بڑھے گی۔'

اب ہم باضابطہ انٹرویو شروع کر رہے ہیں۔

''واجپائی جی۔ آپ تو ایک جہاندیدہ اور بزرگ سیاستدان ہیں۔ آپ نے زمانہ دیکھا ہے آپ نے واقعی امریکہ کے دباؤ میں آکر پاکستان کو مذاکرات کی دعوت دی ہے۔'

بھارتی وزیراعظم کا چہرہ جواب تک کسی تاثر سے خالی چلا آرہا تھا۔ ایک دم سرخ ہوگیا ہے۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی ہے۔

یہ تاثر بالکل غلط ہے۔ امریکہ کو تو بلکہ تعجب بھی ہوا اور پریشانی بھی کہ انہیں علم بھی نہیں تھا۔ اور یہ خط جاری ہوگیا۔ امریکہ نے اپنے بیان میں بھی یہ کہا ہے۔ ہم امریکہ کے دباؤ میں آنے والے نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے طور پر اپنے فیصلے کے تحت یہ دعوت دی ہے۔

'مگر آپ نے جنرل مشرف کو دعوت دینے میں اتنی دیر کیوں کی۔'

واجپائی جی نے اپنا معروف توقف کیا۔ اور پھر کہنے لگے۔ 'میرے خیال میں اس لمحے (وقت) آگے کی طرف دیکھنا زیادہ زیادہ بہتر ہوگا۔ ماضی کے بکھیڑے اٹھانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم نے سندیسہ بھیجا۔ صدر مشرف جی نے دعوت مان لی اور ہم اب ان کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔'

مجھے وزیراعظم اندرا گاندھی یاد آرہی ہیں۔ وہ بھی جواب بہت مختصر دیتی تھیں۔ واجپائی جی بھی کم بولتے ہیں۔ جملوں کے درمیان میں وقفہ بہت طویل کرتے ہیں۔ ایک بار تو یہ لگتا ہے کہ جواب ختم ہوگیا ہے۔ ہم اگلا سوال کرنے والے ہوتے ہیں کہ پھر ان

بھارت کے سابق وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی

کی آواز ابھرنے لگتی ہے۔ اس لیے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ جب ان کی آنکھیں اگلے سوال کی منتظر ہوتی ہیں۔ تب ہم بولتے ہیں۔

ہم پوچھ رہے ہیں۔

''جب مشرف صاحب اپنے موقف میں لچک لانے کا ارادہ ظاہر کر رہے ہیں۔ تو کیا آپ بھی کچھ ایسا کریں گے۔''

لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ۔ جو واجپائی جی کے ہاں بہت کبھی کبھار آتی ہے۔ پھر آواز آتی ہے۔

'ہم جنوبی ایشیا میں امن اور خوشحالی کا اک نیا دور آغاز کرنا چاہتے ہیں اپنی اس چاہت میں جراتمندانہ اور جدت بھرے اقدامات کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے۔ لیکن ہمارے یہ اقدامات ظاہر ہے۔ ہمارے قومی مفادات کے تابع ہوں گے۔ اور امن و انصاف کے قیام کے لیے ہمارے مسلسل عہد کے پابند ہوں گے۔'

ہم سیاچین کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔

'بھارت سیاچین کے بارے میں بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کے درمیان ہونے والے معاہدے پر عملدرآمد کرنے سے کیوں گریز کر رہا ہے۔'

محمود شام کی بھارت کے وزیراعظم سے ہوئی بقیا ملاقات کا احوال ماہِ فروری میں ملاحظہ فرمایئے ساتھ ہی بھارت میں گزرے اُن کے اس سفر کے دیگر دلچسپ واقعات بھی.....

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت ساماں
دل سوز تحریریں، جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

یاد رکھے گی دنیا!

مجید احمد جائی

جرم کی ایک ایسی سفاک کہانی جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی

صبح ہوئی تو عاشر کی امی، اُسے اٹھانے کے لیے کمرے کی طرف گئیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ ماحول میں رس گھول رہی تھی۔ عاشر کی امی نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر عاشر کے کمرے میں گئیں۔ عاشر کا آج دوسرا پیپر تھا۔ رات دیر تک پڑھتا رہتا تھا۔ خوب تیاری میں لگا ہوا تھا، تاکہ اول پوزیشن لے سکے۔ اسی لیے راتوں کو دیر تک جاگ کر تیاری کر رہا تھا۔

عاشر! جہاں آراء بیگم نے دروازے پر دستک کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہی آواز دی،

یہ کیا؟ دروازہ تو کھلا ہے۔ عاشر کہاں کیا ہوگا۔ واش روم۔ واش روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ مسجد مسجد تو اپنے پاپا کے ساتھ جاتا ہے اور اُس کے پاپا ابھی وضو بنا رہے ہیں۔ یہ عاشر کہاں چلا گیا۔'' جہاں بیگم کے دل میں خیال آیا۔ خود سے سوال کرتے ہوئے عاشر۔ عاشر، اُسے آوازیں دینے لگیں۔ مگر عاشر ہوتا تو جواب ملتا۔ عاشر کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ سورج اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو چکا تھا۔

عاشر کے پاپا، نماز کی جماعت نکل جانے کے خوف سے بنا عاشر کے چلے گئے تھے۔ اب وہ بھی مسجد سے لوٹ آئے تھے۔ عاشر مسجد میں بھی نہیں تھا۔ گھر والے بھی حیران و پریشان تھے۔ انعم بھی اٹھ گئی تھی، جہاں بیگم نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے نیند سے بیدار کیا تھا۔ جو ابھی تک لمبی تان کر سو رہی تھی۔ انعم بڑبڑا کر اٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' ماں کے اس طرح نیند سے بیدار کرنے پر 'کیا ہوا' کیا ہوا، کی گردان کرنے لگی۔

''وہ عا..... عاشر نہیں ہے۔'' جہاں بیگم نے بمشکل کہا۔ الفاظ اُن کے حلق میں دب کر رہ گئے تھے۔ غم سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آنکھوں نے خاموشی توڑ دی تھی اور ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھیں۔

انعم نے عاشر کی گمشدگی کا سنا تو وہ ششدر رہ گئی۔ سبھی گھر والے اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ عاشر کی گمشدگی کی خبر گھر کی چار دیواری سے نکل کر پورے محلے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مسجدوں میں اعلان کروائے گئے۔ مگر ہاتھ خالی۔ نظریں پیاسی۔ اُداسی کے بادل ہر سو قابض ہو گئے تھے۔ عاشر کی ماں۔ جہاں آراء بیگم، رو، رو کر

ہلکان ہو رہی تھیں۔ دن کے دس بج گئے تھے اور عاشر کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اب تو محلے کے ہمدرد بھی عاشر کی تلاش میں شامل ہو گئے تھے۔ آخر عاشر گیا کہاں؟ ہر فرد محو حیرت تھا۔

☆......☆......☆

سلمان واپڈا میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ ابھی چند ماہ پہلے اُس کا ٹرانسفر ملتان سے فیصل آباد ہوا تھا۔ سلمان کا فیصل آباد تبادلہ ہوا تو فیملی کو بھی ساتھ لے آیا۔ یہاں اُس نے مکان خریدا اور رہائش اختیار کر لی۔ سروس کے آخری سال چل رہے تھے، اب اُس کا کہیں تبادلہ نہیں ہونا تھا۔ سلمان کا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا۔ سلمان، اس کی بیوی جہاں بیگم، سب سے بڑی بیٹی انعم اور انعم سے چھ سالہ چھوٹا عاشر۔ یہی کل کائنات تھی۔ سلمان کے دو ہی بچے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اور اولاد سے نہیں نوازا تھا۔ انعم کے پیدا ہونے کے چند سال جہاں بیگم بیمار پڑ گئی تھیں اور اس دوران اولاد نہ ہو سکی۔ پھر چھ سال کے بعد بڑی منتوں، مرادوں کے بعد عاشر پیدا ہوا۔ درباروں پر چادریں چڑھائی گئیں۔ نذر و نیاز بانٹی گئی۔ محلے میں مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ سلمان نے اپنے آفس میں دوستوں کو شاندار پارٹی بھی دی۔ عاشر کی پیدائش کیا ہوئی، سلمان کے گھر خوشیوں نے ڈیرے ڈال لیے۔ سلمان خوش تھا تو جہاں بیگم بھی پیچھے نہیں تھیں۔ عاشر کے صدقے واری ہوتی، ماتھے پر ممتا کی محبت سے سرشار ہو کے بوسے دیتیں۔ توتلی زبان میں اس سے باتیں کرتیں۔ انعم کو بھائی مل گیا تھا۔ اُس کا دل بھی ناچ رہا تھا۔ حتیٰ کہ در و دیوار خوشیوں کی نوید دیتے نظر آتے۔ ہر سو بہاروں کا راج تھا۔

عاشر کے بعد اللہ تعالیٰ نے سلمان کو مزید اولاد سے نہ نوازا۔ عاشر کی پیدائش ہسپتال میں ہوئی تھی، ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اب جہاں بیگم کبھی بھی ماں نہیں بن سکیں گی۔ سلمان نے صبر و شکر کر لیا اور رب کی رضا میں راضی ہو گیا۔ یہی اُن کا خاندان تھا۔

وقت مست گھوڑے کی طرح اپنی مستی میں دوڑتا

رہا۔ انعم نے بچپن سے جوانی تک سفر کر لیا تھا۔ خوب حسن آیا تھا۔ بلا کی خوبصورت تھی۔ ستواں ناک، نشیلی آنکھیں، چمکتے گال، اور لال لال ہونٹ، قیامت ڈھاتے تھے۔ قد کاٹھ بھی درمیانہ تھا۔ شباب بھی خوب آیا تھا۔ جہاں بیگم ہر وقت اُس کی نظر اُتارتی رہتی تھیں۔ انعم نے میٹرک کر لیا تھا اور ایف۔اے میں پڑھ رہی تھی۔

عاشر نے جب ہوش سنبھالا تو اُسے بھی اسکول میں داخل کروا دیا گیا، اب وہ بھی پانچویں میں پڑھ رہا تھا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ سلمان سرکاری ملازم جو تھا۔ گھر کی بجلی سرکاری تھی، بل ادا نہیں کرنا پڑتا تھا، اور پھر سرکاری ملازم کی سلمان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

سلمان صبح سویرے آفس چلا جاتا، عاشر بھی اسکول چلا جاتا تھا، اور انعم ان دنوں کالج نہیں جارہی تھی، شاید کوئی چھٹیاں چل رہی تھیں۔ جہاں بیگم یوں تو ٹھیک ٹھاک تھی، مگر چند مہینوں سے گھٹنوں کے درد سے دوچار تھی۔ گھر کا سودا سلف انعم کے ذمے تھا۔ سلمان، رقم دے کر گھر کی ذمہ داریوں سے مبّرا ہو جاتا۔ جہاں بیگم، دوائی لینے جائیں تو انعم کو ساتھ لے جاتیں۔

محلے کے دوسرے نکڑ پر ڈاکٹر الیاس کا کلینک تھا۔ پورے محلے میں صرف ایک ہی کلینک تھا۔ ڈاکٹر الیاس سب کے لیے مسیحا بنا ہوا تھا۔ اُس کے کلینک پر صبح سے شام تک رش رہتا۔ اور بیماریاں جیسے اِسی محلے پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ کوئی بخار میں تپ رہا ہے، کوئی کھانسی سے مرا جارہا ہے۔ کسی کی کمر دُکھ رہی ہے تو کسی کا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔ کسی کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں، کوئی تپ دق میں سسک رہا ہے۔ کسی کو ٹی۔بی نے آن لیا ہے، کوئی دمہ میں مبتلا ہے۔ مختصر پورا محلہ ہی بیماریوں کی لپیٹ میں نظر آتا تھا، جن کو بیماری نہیں تھی، وہ جواء، شراب نوشی میں مبتلا تھا۔

جہاں بیگم بھی انعم کے ساتھ اِدھر سے دوائی لیتی تھیں۔ ڈاکٹر الیاس چڑھتی جوانی میں خوبصورت نوجوان تھا۔ خوبصورت نین نقش، ستواں ناک، سفید دودھیا رنگ، بال بجے سنوارے، کلین شیو۔ سفید شلوار قمیض میں ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی رہتی۔ لبوں پر مسکراہٹ، اُسے اور حسین و جمیل بنا دیتی، حسن اخلاق کا پیکر، لمبا قد کاٹھ، ۔اونچا لمبا قد، اُس کی شخصیت میں رنگ بھرے ہوئے تھا۔ ایک جوانی، اوپر سے پُرکشش شخصیت، قیامت ڈھاتی تھی۔

☆......☆......☆

پورا محلہ چھان مارا مگر عاشر کا کہیں سُراغ نہ مل سکا۔ محلے میں گمشدگی کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی کا بچہ گم ہوا تھا۔ سبھی محوحیرت تھے۔ چند روز گزرنے کے بعد سلمان نے تھانے جا کر ایف آر کٹوا دی۔ نامعلوم افراد کے خلاف اغواء کی درخوست دائر کی گئی۔ اب پولیس بھی عاشر کی تلاش میں حرکت میں آگئی تھی۔ ابتدائی کاروائی جاری تھی۔ سلمان کی کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی۔ چند ماہ پہلے ہی تو وہ اِس محلے میں آئے تھے۔ سبھی محلے والے اُن سے خوش تھے اور عزت کرتے تھے۔ کس پہ شک کرتا۔ کس کو اندر کرواتا؟ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اُدھر تھانے میں تھانے دار، تفتیش کے ساتھ معاملے کی گہرائی میں پہنچنے کے لیے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ مگر عاشر کا کہیں اتا پتا نہ تھا۔ واپڈا کے اعلیٰ آفیسروں نے تھانے میں کالز کر کر کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آخر ان کے دوست کا بیٹا گم ہو گیا تھا۔

عاشر کے اسکول سے پتا کروایا گیا۔ دوستوں سے پوچھ گچھ کی گئی۔ دس، گیارہ سالہ عاشر کی دوستیاں برائے نام تھیں۔ محلے کے چند لڑکے دوست تھے۔ اور بس۔ ہر کوئی عاشر سے لاعلم تھا۔ عاشر کی گمشدگی محلے والوں کے لیے المیہ تھی۔ پولیس کے لیے بھی باعث شرمندگی تھی۔ کہتے ہیں پولیس والے کافی تیز طرار ہوتے ہیں۔ بات بے بات کیڑے نکالتے ہیں۔ مگر۔ یہاں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے۔ عاشر کی گمشدگی کو ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ دس بارہ سالہ عاشر کی کسی سے دشمنی بھی تو نہیں تھی، یہ عمر تو کھیلنے کودنے کی ہوتی

ہے۔ایسے لڑکوں کو دشمنی کا پتا تک نہیں ہوتا۔دشمن کی اولادیں بھی دوست ہوتی ہیں۔سلمان کا کردار بھی کسی سے چھپا ڈھکا نہیں تھا۔

جہاں بیگم چارپائی کی ہو کر رہ گئی تھیں۔پہلے ہی گھٹنے کام چھوڑ گئے تھے،اب عاشر کی گمشدگی نے ادھ موا کر دیا تھا۔انعم پر ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔گھر کی مکمل دیکھ بھال،ماں کی دوائی،اس کی ذمہ داری تھی۔دن بھر مشین کی طرح کام کرتی رہتی تھی۔سلمان،شام کو تھکے ہارے آتے تو بستر پر دراز ہو جاتے۔بڑھاپا چڑھ آیا تھا۔دن بھر گھر میں کیا کیا ہوتا رہتا ہے،سلمان لاعلم تھا۔والدین کا یہی اعتماد اولاد کو بگاڑ دیتا ہے۔اولادیں کیا کیا گل کھلاتی ہیں خبر نہیں رہتی،جب پانی سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے تب پچھتائے کچھ نہیں ہوتا،سوائے آنسو بہانے کے۔

جہاں آراء بیگم،انعم کو ساتھ لے کر دوائی لینے جاتی تھیں،اور جب اُن کی طبعیت اجازت نہیں دیتی تو انعم کو اکیلا بھیج دیتی تھیں۔جب بھی انعم کلینک پر جاتی،ڈاکٹر الیاس کی نظریں اُس پر مرکوز ہو مریضوں کو چیک کرتے،دوائی دیتے،نظریں انعم پر ہی ہوتیں۔الیاس کی قاتلانہ نظریں انعم کی روح تک میں پیوست ہو جاتیں۔انعم سہمی سی گم صم خاموش بیٹھی رہتی۔اُسے بھی ڈاکٹر الیاس بھلے لگتے تھے۔جاذب چہرہ،لمبا قد کاٹھ،بھوری بھوری آنکھیں،لبوں پر مسکراہٹ،سفید لٹھے کی شلوار قمیض میں شہزادے ہی لگتے تھے۔خوابوں کے شہزادے۔انعم کمزور نازک سی کلی تھی اور لڑکیاں تو جوانی میں قدم رکھتے ہی شہزادوں کے خوابوں کے تانے بانے بننا شروع کر دیتی ہیں۔انعم بھی جوانی میں قدم رکھ چکی تھی۔رنگ وروپ خوب آیا تھا۔مرمریں جسم،چاندنی کی طرح حسین مکھڑا،لمبی کالی سیاہ زلفیں،چمکتے رُخسار،نشیلے ہونٹ اور قیامت ڈھاتی موٹی موٹی آنکھیں۔جن میں سپنے ہی سپنے تھے۔سادہ لباس میں،حسین نین نقش میں بلا کی پیاری لگتی تھی۔لڑکیاں تو ایک اشارے کی منتظر ہوتی ہیں۔میٹھی شیریں باتوں میں آجاتی ہیں،اندھا اعتبار کر بیٹھتی ہیں۔نادانی کا ایک لمحہ،انسان کو بھٹکا دیتا ہے،جس کی سزا عمر بھی بھگتنی پڑتی ہے۔زندگی روگ بن جاتی ہے۔یہی وہ نادان لمحہ تھا،جب انعم ان راہوں پر گامزن ہوئی تھی۔یہ کھیل جانے کب سے شروع تھا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر الیاس،کب کا انعم کا دیوانہ تھا۔انعم جب اسکول جاتی تھی،اِسی کے کلینک کے سامنے سے گزرتی تھی۔ڈاکٹر کی نظریں،انعم کے تعاقب میں رہتی تھیں۔آتے جاتے انعم کی آنکھیں چار ہوئیں،محبت کا بیج بویا گیا اور انعم اپنا دل الیاس کو دے بیٹھی۔ملاقاتوں کا معمول بن گیا۔انعم کو جب چھٹی ہوتی،ڈاکٹر کے دوپہر کے کھانے کا وقت ہوتا،وہ کلینک بند کرتا،اور اسکول کی طرف نکل پڑتا۔پھر ہوٹلوں پر ملاقاتیں ہونے لگیں،پیار کے عہد وپیمان ہونے لگے۔انعم جب بھی بازار سے سود اسلف لینے آتی تو ڈاکٹر الیاس کے پاس ضرور آتی۔یوں نظروں کی پیاس بجھتی،دل کو قرار آتا۔انعم اور الیاس محبت کی کشتی میں سوار ہو گئے۔محبت کا بھوت سر چڑھ کر بول رہا تھا۔اور کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔کس کو،کس سے،کس پل ہو جائے،کوئی نہیں جانتا۔

اِس دوران جہاں بیگم بیمار پڑ گئیں،اور ڈاکٹر الیاس بہانے سے انعم کے گھر آنے لگا۔جہاں بیگم اُسے دعائیں دیتی۔اُس کے صدقے واری ہوتی۔انعم کو کہہ کر اُس کے لیے چائے بنواتیں۔اُس کی خاطر تواضع ہوتی۔یوں انعم اور الیاس کو نظروں کی پیاس بجھانے کا وقت مل جاتا۔لیکن جو آگ اندر لگی تھی وہ نہ بجھ پاتی۔من کی آگ میں دونوں جل رہے تھے۔محبت میں جب شیطانیت عنود کر جائے تو محبت،محبت نہیں رہتی،ہوس بن جاتی ہے۔دونوں نوجوان تھے،اور ہوس کی آگ میں چُور چُور تھے۔پھر ایک دن اُنہیں موقع مل ہی گیا،تنہائی میسر آئی اور محبت کا جنازہ اُٹھ گیا۔مسیحا،شیطان بن گیا۔اور عورت تو

ہمیشہ میٹھی زبان کی بھوکی ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر الیاس جسے لوگ مسیحا کہتے نہیں تھکتے تھے۔سفید لباس میں ملبوس ،انسان سے شیطان بن گیا۔

ڈاکٹر الیاس اور انعم محبت کے نام پر منہ کالا کرتے رہے۔

جس رات دونوں کا ملاقات کرنے کا پروگرام ہوتا، ڈاکٹر الیاس ،انعم کو نیند آور گولیاں دے دیتا اور انعم شام کو کھانے میں ملا دیتی۔کھانا وہ خود ہی بناتی تھی۔کوئی خوف خطرہ نہیں تھا۔سلمان اور اس کی بیوی جہاں بیگم کھانا کھاتے ہی بستر پر دراز ہو جاتے اور دُنیا سے بے نیاز ہو جاتے۔عاشر اپنے کمرے میں سو جاتا اور دونوں شیطانی کھیل میں خرمستیاں کرتے رہتے۔ڈاکٹر الیاس نے انعم سے شادی کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔انعم عورت ذات تھی، اُس کے قول و قرار پر مرمٹی۔

☆......☆......☆

یہ ان دنوں کی بات ہے۔سردیاں ابھی باقی تھیں اور بہار رُت آنے کو تھی۔اسکولوں میں امتحانات چل رہے تھے۔عاشر پانچویں میں تھا۔اُس کے بورڈ کے پیپر ہونے تھے۔دن بھر اسکول پڑھتا اور شام کو محلے میں سر اشتیاق سے ٹیوشن لیتا تھا۔عشاء کی نماز کے وقت گھر آتا کھانا کھاتا، مسجد میں نمازِ عشاء ادا کرتا اور اپنے کمرے میں آکر پڑھنے بیٹھ جاتا۔پڑھنے کا جنون تھا۔انجینئر بننے کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔بچپن ہی میں اُس نے انجینئر بننے کے خواب سجا لیے تھے۔ان خوابوں کو حقیقت کا رُوپ دینے کے لیے محنت کرنا لازمی تھا۔اور عاشر تن من دھن سے محنت کر رہا تھا۔یہ معمول کی رات تھی۔عاشر کے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔پہلا پیپر بہت اچھا ہوا تھا اور صبح دوسرا پیپر تھا۔اُسی دن ڈاکٹر الیاس اور انعم نے ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔دوپہر کو ہی الیاس نے انعم کو نیند آور گولیاں دے دی تھیں۔انعم نے شام کو کھانا تیار کرتے ہوئے گولیاں شامل کر لی تھیں۔سلمان بھی گھر آچکے تھے،سلمان اور جہاں بیگم نے مل کر کھانا کھایا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دونوں بستر پر دراز ہو گئے۔عاشر اُس شام ،ٹیوشن لینے گیا تو سر اشتیاق کے ہاں محفل میلاد تھی۔وہاں مٹھائی کے ساتھ ساتھ لنگر بھی تقسیم ہوا۔عاشر وہاں بڑھ چڑھ کر کام کرواتا رہا، محفل ختم ہوئی تو شریک ہونے والے بھی لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔سر اشتیاق نے ٹیوشن لینے والے بچوں کو بٹھا کر کھانا کھلایا۔اُس دن عاشر لیٹ ہو گیا۔

گھر آیا تو ماما ،پاپا سو چکے تھے۔وہ بھی سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔انعم تو عاشر کے انتظار میں بیٹھی تھی۔فوراً کھانا لے آئی۔باجی! مجھے بھوک نہیں ہے۔لیکن انعم بضد تھی، کہ تمہاری پسند کی ڈش بنی ہے۔کھالو۔عاشر نے معصومیت سے جواب دیا۔ٹھیک ہے باجی! کھانا میرے کمرے میں لا دو، میں تھوڑی دیر میں کھاتا ہوں۔انعم نے کھانا لاکر عاشر کے کمرے میں رکھ دیا اور خود برتن سمیٹنے کچن میں چلی گئی۔سلمان اور جہاں بیگم تو کب کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔حسب وعدہ الیاس گھر کی دہلیز کراس کر آیا۔دونوں اپنی خرمستیوں میں گم ہو گئے۔اور ان کو عاشر کا خیال ہی نہ رہا۔

انعم ،الیاس کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور عاشر کمرے میں دیر تک پڑھتا رہا۔پڑھتے پڑھتے اُسے اونگھ آنے لگی تو منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے باتھ روم کی طرف جانے کے لیے کمرے سے نکلا۔باتھ روم مین دروازے کے ساتھ تھے۔عاشر کو تمام کمرے کراس کر کے وہاں تک جانا تھا۔عاشر کے کمرے کے ساتھ سلمان اور جہاں آراء بیگم کا کمرا تھا، اور آگے ہال میں انعم سویا کرتی تھی۔عاشر اپنے کمرے سے نکل کر ہال کے دروازے تک پہنچا تو مدہم روشنی میں سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔اُس کے قدم رُک گئے۔انعم کسی کے ساتھ مسکراتے ہوئے سرگوشی میں بات کر رہی تھی۔دروازہ لاک تھا اور ونڈو سے ہلکی سی روشنی کی لکیر باہر کو آرہی تھی۔عاشر نے اُسی ونڈو سے اندر جھانکا۔اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔انعم ،کسی لڑکے کے

ساتھ بے لباس لیٹی ہوئی تھی۔ اندر کا منظر قیامت خیز تھا۔ عاشر بچہ ضرور تھا، مگر سمجھدار تھا۔ اپنی بہن کو کسی لڑکے کے ساتھ برہنہ گتھم گتھا دیکھ کر اُس کے تن من میں آگ بھڑک اُٹھی۔

''انعم۔''اُس نے وہیں سے آواز دی۔''انعم میں ابھی پاپا کو جگاتا ہوں۔''دونوں عاشر کے یوں آ جانے سے حیران ہو گئے۔ان کو ایسی اُمید ہرگز نہیں تھی۔وہ تو کب کے یہ کھیل کامیابی کے ساتھ کھیلتے آئے تھے۔لیکن کہتے ہیں ناں، کھاتا چور ایک نہ ایک دن پکڑا جاتا ہے۔لمحہ بھر کی غفلت نے ان کے کارنامے سے پردہ اٹھا دیا تھا۔دونوں اِس کے لیے تیار نہیں تھے۔عاشر نے وہیں سے پاپا کو آواز دی، مگر اُس کی آواز گم ہی ہوگئی، وہ تو نیند آور گولیاں کھا کر سو چکے تھے۔عاشر کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔اتنے میں ڈاکٹر الیاس کمرے سے باہر آیا اور عاشر کو اپنے بازوؤں میں قید کر لیا۔عاشر پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا رہا، مگر وہ طاقتور ہاتھوں میں قید ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

اہل علاقہ کے لیے عاشر کا یوں لاپتا ہونا باعثِ تشویش تھا اور پولیس بھی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔علاقے کے مشکوک افراد کو گرفتار کر کے پوچھ گچھ جاری تھی۔ محلے میں آنے والے ملنگ، فقیر ٹائپ لوگوں کو حراست میں لیا گیا تھا۔بچوں کے اغواء کار سمجھ کر ان کو حوالات میں بند کر دیا گیا تفتیشی پوچھ گچھ کر رہا تھا۔لیکن بیچارے روتے بسورتے، دہائیاں دیتے ہوئے کہتے،

''صاحب ہمیں کیا معلوم،؟ ہم ایسا کیوں کر کریں گے۔؟ ہمارے بھی چھوٹے بچے ہیں۔''

کہیں سے کوئی فون کال بھی نہیں آ رہی تھی۔ہو سکتا ہے عاشر کو کسی نے اغواء کیا ہو۔اگر کسی نے اغواء کیا تھا تو رقم کے مطالبے کے لیے کال کرتا، کسی نہ کسی طرح رابطہ کرتا۔کوئی نہ کوئی خبر ملتی۔چھ دن گزر گئے تھے، کہیں سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔اغواء کار رات کو اغواء کیوں کرتے، وہ بھی گھر سے۔کیوں کہ جس دن عاشر پراسرار طور پر غائب ہوا تھا، اُسی شام تو گھر پہ تھا۔جہاں بیگم نے پولیس والوں کو بتایا کہ ہاں۔سر اشتیاق سے ٹیوشن لینے ضرور گیا تھا۔ہم سو گئے تھے پھر جانے واپس آیا تھا یا نہیں آیا تھا۔عشاء کی نماز کے بعد۔''اچانک انعم بول پڑی۔

تھانیدار سوچوں میں گم تھا اور تفتیشی آفیسر دانتوں میں اُنگلیاں دبائے بیٹھا سوچوں کے نگر میں اس کیس کی کڑیاں ملا رہا تھا۔

''تمہارا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا، کوئی تنازعہ۔''تھانیدار نے پوچھا۔

''نہیں۔بالکل نہیں۔''اس بار سلمان نے جواب دیا۔

''گھر میں کون کون رہتا ہے؟''دوبارہ سوال کیا گیا؟

''میں، میری بیوی جہاں بیگم، میری بیٹی انعم اور عاشر۔''سلمان نے جواب دیا۔

''اُس دن گھر میں کوئی آیا ہو، میرا مطلب ہے کوئی رشتے دار، کوئی جان پہچان والا؟''

''نہیں جی۔رات آٹھ بجے تک تو کوئی نہیں آیا تھا۔''اس بار انعم نے جواب دیا۔سلمان نے انعم کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہاں جی کوئی نہیں آیا تھا، پھر ہم سو گئے اور صبح سب سے پہلے میں ہی اٹھا تھا۔میری بیگم تلاوت کر رہی تھی اور انعم سو رہی تھی۔میں وضو بنانے لگا تو میری بیگم نے تلاوت ختم کی اور۔وہ سیدھی عاشر کی کمرے کی طرف، عاشر کو جگانے گئی تھی۔اور پھر۔سلمان روہانسا ہونے لگا۔

تفتیشی آفیسر کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔اچانک بول پڑا۔

''سلمان صاحب! اگر بُرا محسوس نہ کریں تو عرض کروں۔''

''ہاں۔ہاں جی۔حکم۔''

''ہم آپ کی بیٹی سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔''انعم ہڑبڑا گئی۔اس کے چہرے کی رنگت اڑ

گئی۔ بولنا چاہتی تھی، مگر الفاظ اُس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ جیسے زبان گنگ ہوگئی۔ تفتیشی آفیسر نے تو ہوا میں تیر چھوڑا تھا۔ تفتیشی آفیسر انعم کی باتوں پر غور کر رہا تھا، رات آٹھ بجے تک تو کوئی نہیں آیا تھا۔ یہی جملہ اُس کی سماعتوں سے ٹکرا رہا تھا۔ تفتیشی آفیسر نے تھانیدار کے کان میں سرگوشی کی۔ اور تھانیدار سر ہلانے لگا، ہوں۔ جیسے اس کی بات سے متفق ہو۔ اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

''سلمان صاحب! معذرت کے ساتھ، ہمیں آپ کی بیٹی کو تھانے لے جانا ہوگا۔'' اب کے بار جہاں آراء بیگم بول اُٹھیں۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب۔! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ بیٹا بھی ہمارا لاپتا ہے اور تفتیش بھی ہماری اور وہ بھی میری معصوم نازک سی بیٹی سے۔ اور اُسے تھانے کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ جو پوچھنا ہے، ہمارے سامنے پوچھ لو ناں۔ محلے والے کیا کہیں گے؟ ہماری ناک کٹ جائے گی، رہی سہی عزت کی دھجیاں مت اُڑاؤ۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا، ہرگز نہیں۔'' جہاں بیگم نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''جہاں آراء بیگم! فکر مت کریں، انعم سے چند سوالات کرنے ہیں اور بس۔''

''تو یہیں کر لو ناں سوال؟ تھانے ہی کیوں؟''

''جہاں آراء بیگم! معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا۔'' تھانیدار نے جواب دیا۔

جہاں بیگم خاموش ہو گئیں۔ سلمان نے جہاں آراء بیگم کے کندھوں پہ تسلی دینے والے انداز میں ہاتھ رکھا۔ حوصلہ رکھو بیگم۔''

تھانیدار، انعم کو تھانے کے لیے لے گئے، ان کی ٹیم کے ساتھ لیڈی انسپکٹر تھی، جس نے انعم کو اپنے ساتھ بٹھایا اور تھانے روانہ ہو گئے۔ سلمان، جہاں آراء بیگم کو تسلی دینے لگا، اور جہاں آراء بیگم، آنسوؤں میں نہا رہی تھیں۔

لیڈی انسپکٹر، انعم کو تفتیشی روم میں لے گئی۔

☆......☆......☆

عاشر نے اپنی بہن کو برہنہ حالت میں کسی غیر لڑکے کے ساتھ خرمستیاں کرتے دیکھا تو چلایا تھا، مگر رات کے اس پہر اس کا چلانا کام نہ آیا اور ڈاکٹر الیاس نے، اُسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ عاشر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، تاکہ آواز حلق سے نکل نہ پائے اور اُسے اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔ اِدھر انعم خود کو سنبھال چکی تھی۔ اُس نے ننگے بدن کو کپڑوں سے ڈھانپ لیا تھا۔ عاشر، الیاس کے بازوؤں میں قیدی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا، کم سن بچہ تھا، کہاں تک مداخلت کرتا۔

طاقتور ہاتھوں میں معصوم پھول کی طرح دب کر رہ گیا، الیاس نے، عاشر کو جب بیڈ پر پھینکا تو وہ نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ اُس نے حرکت کرنی بند کر دی تھی۔ الیاس نے مضبوطی سے جو پکڑ رکھا تھا۔ عاشر کا سانس رُک گیا اور لمحوں میں جان کی بازی ہار گیا۔ الیاس نے عاشر کو بیڈ پر لٹایا تو اُس نے لمحہ بھر اکھڑے اکھڑے دو، تین سانس لیے اور پھر بے سدھ ہو گیا۔ ہاں۔ عاشر بے جان ہو گیا تھا۔

انعم اور الیاس، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، شاید وہ اُسے مارنا نہیں چاہتے تھے، لیکن۔ اب......؟

انہونی ہو گئی ہی تھی۔ دونوں کی ہوائیاں اُڑ گئیں۔ اور وہ سب ہو گیا، جو ان کے من میں نہیں تھا، یا وہ اِس کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن اب۔ کیا ہو گا؟ یہی سوال ان کے ذہنوں پر اُبھرا۔ اور پھر انسانیت شرمانے لگی۔

دونوں نے اپنا گناہ چھپانے کے لیے ننھی جان کو بے جان تو کر دیا، لیکن قیامت خیز منظر وہ تھے جب دونوں نے مل کر ننھی جان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے۔ الیاس نے عاشر کے جسم کے ٹکڑے شاپر میں ڈالے اور انعم برابر ساتھ دے رہی تھی۔ الیاس، شاپر میں ننھی جان کے ٹکڑے ڈال کر رات کی تاریکی میں گھر سے نکل گیا اور انعم کمرے سے خون کے دھبے صاف کرنے لگی۔ اپنی طرف سے تمام ثبوت مٹا کر، بستر جوڑ کر لمبی تان کر سوگئی۔

جانے ایسے سفاک لوگوں کو نیند کیسے آجاتی

ہے۔ کہتے ہیں جب ضمیر مُردہ ہوجائے تو آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھ جاتی ہے، پھر اچھائی اور بُرائی میں تمیز نہیں رہتی۔ایک سفاک لمحے نے کیا سے کیا کروادیا تھا۔شیطان نے گھر میں آگ لگادی تھی۔

انعم سوگئی اور اُس کی آنکھ صبح اُس وقت کھلی جب جہاں آراء بیگم نے اُسے جھنجوڑ کر جگایا تھا۔اور عاشر کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔اور وہ حیرانگی کے عالم میں اُٹھ کر آنکھیں مسلنے لگی تھی۔

اُدھر الیاس، عاشر کے جسم کے ٹکڑے اٹھائے رات کی تاریکی میں گھر سے نکل گیا تھا۔الیاس اُسی راستے واپس جا رہا تھا،جس راستے سے آتا جاتا تھا،راستے میں محلے کے ملک صاحب کا باڑہ آتا تھا،اُس نے کافی بھینسیں رکھی ہوئی تھیں اور پورے محلے کو دودھ یہاں سے جاتا تھا۔ملک صاحب نے باڑے کے باہر، دوکنال کے رقبے میں جانوروں کا گوبر اکٹھا کروایا ہوا تھا۔دوکنال میں گوبر ہی گوبر تھا۔الیاس کو، اپنے کلینک جاتے ہوئے، عاشر کو ٹھکانے لگانے کا بہترین موقع یہی لگا کہ اُس کے ٹکڑے، اس گوبر میں دبا دیں تاکہ، ان ٹکڑوں سے اٹھنے والی بدبو باہر نہ آسکے۔الیاس نے رات کی تاریکی میں گوبر میں گہرا گڑھا کھودا اور ٹکڑوں سے بھرا شاپر گڑھے میں دبا دیا۔اپنی طرف سے تسلی کرتے ہوئے ،کلینک کی طرف چلا گیا۔

☆☆......☆☆......☆

انعم تفتیشی روم میں گئی تو اُس کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔اور کہتے ہیں عورت کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو اپنے سینے میں راز نہیں چھپا سکتی۔عورت اِس معاملے میں کمزور ٹھہری ہے۔

اور۔پھر۔یہ خبر صبح جنگل میں آگ کی طرح پھیل چکی ہوگی۔انعم نے تو ابھی دُنیا دیکھی ہی نہیں تھی۔پہلی ہی دھمکی میں سب کچھ اُگل دیا۔تفتیشی آفیسر کے ساتھ تھانیدار حیران ویریسلمان بیٹھا تھا،کوئی اس طرح سفاک قتل بھی کرسکتا ہے۔

انعم نے ساری کہانی سنا دی تھی،اور اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی،اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت،اُسی شام،رات کے اندھیرے میں ڈاکٹر الیاس کو کلینک سے گرفتار کرلیا گیا۔وہ کہیں روپوش نہیں ہوا تھا۔اگر وہ فرار ہو جاتا تو لوگ اُسی پہ شک کرتے،یہی سوچ کر معاملے کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنے لگا تھا۔بے گناہ قتل زیادہ دیر نہیں چھپ سکتا۔سو الیاس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

تھانے میں الیاس کی چھترول ہوئی تو اُس نے بھی زبان کھول دی۔صبح ہوتے ہی الیاس،اُسی گوبر کے ڈھیر پر لے گیا۔جہاں عاشر کو دفن کیا تھا۔عاشر کے قتل کی خبر پل بھر میں پورے محلے میں پھیل گئی،اور محلے والے آگ بگولہ ہوگئے۔اپنے مسیحا کو پتھروں سے مارنے پر تُل گئے۔تھانیدار کی ہمت تھی،جس نے عوام پر قابو پایا اور الیاس کو تھانے لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔

عاشر کے بقایاجات کو نہلا کر جنازہ کرکے منوں مٹی تلے دفن کردیا گیا۔جہاں آراء بیگم نے عاشر کے بے رحمانہ قتل کے بارے سنا تو وہی ڈھیر ہوگئیں،شاید ہارٹ اٹیک ہوا تھا،ایک ماں،ایسی خبر کب برداشت کرسکتی تھی۔اور سلمان دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر دماغی توازن کھو بیٹھا۔ہوس کی آگ نے خوشیوں بھرے گھر کو جلا کر بھسم کرڈالا تھا،خوشیاں لٹ گئی تھیں اور گھر،اپنے ہی مکینوں سے برباد ہوگیا تھا۔اب وہ گھر ویران کھنڈر بن چکا ہے۔

کہتے ہیں جب انسان گناہ پہ گناہ کرتا جائے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھودیتا ہے۔انسان اندھا ہو جاتا ہے،عقل سے عاری۔یہی کچھ انعم کے ساتھ بھی ہوا تھا۔اب الیاس،اور انعم جیل کی کال کوٹھری میں زندگی کے بقیا ایام گزار رہے ہیں۔پچھتاوے کی آگ میں روز جلتے ہیں روز مرتے ہیں۔مرنا چاہتے ہیں مگر موت نہیں آتی۔شاید رب رحمان دُنیا میں ہی سزا دینا چاہتا ہے۔ایسا سفاک قتل!لوگ بھول نہیں پائے۔اور شاید رہتی دنیا تک دنیا ایسے مکروہ چہروں کو یاد رکھے گی۔

☆☆......☆☆

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں........
جن میں جدائی اور ملن کی وصل بھی شامل ہے

ممتاز احمد

اُس عیاش نوجوان کی کتھا، جو آج بھی ایک پلیٹ فارم پر عبرت کا نشان بن کر بیٹھا ہے

آج بھی وہ حسب معمول پلیٹ فارم پر موجود تھی اور ٹرین کی منتظر تھی۔ تھوڑی دیر تک ٹرین آنے والی تھی۔ وہ گزشتہ پندرہ بیس روز سے روزانہ صبح اسی وقت پلیٹ فارم پر نظر آتی۔ اب تک ہماری ایک دوسرے کو دیکھنے کی حد تک شناسائی تھی۔ اُس کے روزانہ پلیٹ فارم پر آنے اور ٹرین میں سوار ہونے سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کہیں جاب کرتی ہے۔ چند منٹوں کے بعد ٹرین آگئی اور اتفاق سے آج ہم دونوں ایک ہی ڈبے میں سوار ہوئے۔ اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ہمیں دو سنگل سیٹیں آمنے سامنے والی خالی مل گئیں اور ہم بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین چل پڑی۔ ہم دونوں خاموش تھے اور چوری چوری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جب اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آیا تو میں نے اُسے سلام کیا اور رسمی باتیں شروع کر دیں پھر تعارف کا مرحلہ آیا تو اُس نے اپنا نام طاہرہ بتایا۔ طاہرہ کے والد وفات پاچکے تھے۔ وہ تین بہنیں تھیں۔ طاہرہ سب سے بڑی تھی، اُس نے B.A, BED کیا ہوا تھا اور دوسرے شہر میں جاب کرتی تھی۔ اُس کی باقی چھوٹی دو بہنیں پڑھ رہی تھیں، والدہ جوڑوں کے درد میں مبتلا تھیں۔ والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد اُن کا کوئی ذریعہ روزگار نہ تھا تو طاہرہ کو تھوڑی سی کوشش اور بھاگ دوڑ کے بعد دوسرے شہر میں یہ جاب ملی تھی۔ وہ اپنی ماں اور بہنوں کی کفالت کر رہی تھی۔ چونکہ اُس کا گھر ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ایک بستی میں تھا تو اُس نے ڈیوٹی پر آنے جانے کے لیے ٹرین کا انتخاب کیا تھا جس کی وجہ سے وہ ٹائم پر پہنچ جاتی تھی۔ گھر سے اسٹیشن آنے جانے کے لیے کسی سواری کی ضرورت نہ پڑتی۔ ایک تو ٹرین کا سفر محفوظ تھا، دوسرا کرائے کی مد میں کچھ بچت ہو جاتی کیونکہ وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو منتھلی ٹکٹ یعنی سفری ماہانہ پاس بنوا لیتی اور تیسرا ٹرین اُسے بروقت منزل پر پہنچا دیتی تھی جس کی وجہ سے بسوں ویگنوں کے دھکے کھانے سے بچ جاتی۔

طاہرہ کا رنگ گندمی تھا بڑی بڑی آنکھیں ستواں ناک پُرکشش نین نقش اور سڈول جسم تھا۔ طاہرہ کی آواز بھی بہت پیاری تھی کالے سیاہ لمبے اور گھنے بال تھے۔ بہر حال وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اُسے بولنے اور بات کرنے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا......

......☆☆☆......

میرا نام عاقب ہے اور میں نے جس گھر میں آنکھ کھولی تھی وہاں خوشحالی تو نہیں تھی بس گزر بسر ہو رہی تھی۔ کرائے کا مکان تھا والد صاحب کی ایک چھوٹی سی کریانے کی دوکان تھی اور وہ بھی کرائے کی۔ میرے والدین کی دو اولادیں ہیں مجھ سے بڑا بھائی ثاقب ہے۔ ہم دونوں بھائیوں کو پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گویا ہم دونوں بھائی انتہائی نالائق طالب علم تھے۔ بار بار امتحان دینے کے بعد بھی جب ثاقب بھائی میٹرک کا امتحان پاس نہ کرسکا تو ابا نے اُسے ایک الیکٹریشن کے ساتھ کام سیکھنے پر لگا دیا۔ جبکہ میں اسکول جاتا رہا اور کچھ آوارہ لفنگے لڑکوں کے ساتھ دوستی لگالی۔ ہم اکثر اپنا اپنا بستہ اسکول میں رکھ کر اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتے رہتے۔ اُن دنوں نیا نیا وی، سی، آر (VCR) آیا تھا تو ہمارے اسکول سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک ہوٹل اور پچھلی جانب ایک کمرے میں رنگین ٹی وی اور وی، سی، آر رکھا تھا تو وہ پانچ روپے کے عوض ہم کو مختلف فلمیں دکھاتا۔ ہم سب لڑکے اپنے اپنے گھر سے مختلف حیلوں بہانوں سے پیسے لے کر آتے اور اسکول ٹائم میں فلمیں دیکھتے۔ پہلے پہل تو انڈین فلمیں دیکھتے پھر انگلش اور پھر آہستہ آہستہ غیر اخلاقی فلمیں بھی دیکھنے لگ گئے جس کے لیے ہوٹل والا ہم سے ڈبل پیسے لیتا۔ شام کو میں اکثر پہلوانوں کے اکھاڑے میں اُن کی کشتی دیکھنے چلا جاتا اور اُن کی دیکھا دیکھی میں بھی ڈنڈ بیٹھکیں نکالتا۔ ایک تو میرا جسم کسرتی تھا دوسرا ڈنڈ بیٹھکیں نکالنے اور ہر روز صبح مکھن کے پراٹھے کھانے کی وجہ سے میں اپنی عمر سے زیادہ بڑا لگنے لگا۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ بُری صحبت اور غیر اخلاقی فلمیں دیکھنے کی وجہ سے میں وقت سے پہلے بالغ ہوگیا تھا۔ میری عُمر اُس وقت سولہ سال تھی اور اس عُمر میں مجھے میٹرک کر لینا چاہیے تھا۔ مگر آوارہ گردی اور تین سال فیل ہونے کی وجہ سے میں ابھی تک آٹھویں کلاس میں تھا۔

جس محلّے میں ہماری رہائش تھی، وہاں ہمارے گھر کے سامنے ایک آنٹی رہتی تھی، آنٹی کا نام عظمیٰ

تھا اور اُن کی عمر تیس یا بتیس سال کی تھی دو چھوٹے بچے تھے بڑا کلاس 4th میں تھا اور دوسرا کلاس 2nd میں تھا۔

آنٹی عظمیٰ کے شوہر گزشتہ دو سال سے بیرون ملک میں تھے جو کہ ہر مہینے ایک معقول رقم آنٹی عظمیٰ کو بھیج دیتے، جس سے اُن کی گزر بسر بہت اچھی ہو رہی تھی۔ جس مکان میں آنٹی رہتی تھیں وہ بھی کرائے پر تھا۔

آنٹی عظمیٰ اپنے دو بچوں اور بوڑھی ساس کے ساتھ رہتی تھی۔ آنٹی عظمیٰ ایک خوبصورت شوخ، و چنچل انتہائی پرکشش جسم کے ساتھ بہت نٹ کھٹ بھی تھی۔ آنٹی عظمیٰ بہت ہنس مکھ اور تھوڑی سی آزاد خیال اور ماڈرن تھی۔ آنٹی کا ہمارے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ مجھے آنٹی عظمیٰ بہت اچھی اور پیاری لگتی تھی۔ میں نے اُس کا نام آنٹی نٹ کھٹ رکھا ہوا تھا۔ آنٹی کو جب بھی کوئی کام ہوتا تو وہ مجھے آواز دے کر بُلا لیتیں تو میں اُسی لمحے دوڑا دوڑا اُن کے گھر چلا جاتا کیونکہ میں آنٹی کو اپنے ساتھ سیٹ کرنے کے چکر میں تھا۔ پورے محلّے میں کوئی لڑکی نہ تھی، سب لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور سب اپنے اپنے سسرال میں تھیں۔ محلّے میں آ جا کر ایک واحد آنٹی عظمیٰ تھیں جو کہ جوان اور خوبصورت تھیں اوپر سے وہ پردہ بھی نہ کرتی تھیں مزید اُن کو ہنسی مذاق کی بہت عادت تھی۔

اب یہ غلط صحبت اور غیر اخلاقی فلمیں دیکھنے کا نتیجہ تھا کہ آنٹی عظمیٰ مجھے حور پری اور دنیا کی سب سے خوبصورت عورت لگتی تھی۔ آنٹی کو دیکھ دیکھ کر میرے جذبات خوب مچلتے اور میں اس کوشش میں لگا رہتا کہ میں آنٹی کا ہر کام مثلاً بازار سے سبزی، گوشت سودا سلف لا دینا، بجلی کا بل بینک میں جمع کروا دینا، سلنڈر میں گیس بھروا دینا، آنٹی کی ساس کی دوا لا دینا، کبھی کبھی ان کے بچوں کو اسکول سے لے آنا وغیرہ وغیرہ اگر خریداری کے بعد کچھ پیسے بچ جاتے تو آنٹی مجھ سے نہیں لیتی تھیں اور میں وہ پیسے فلمیں دیکھنے میں اُڑا دیتا۔ بڑا بھائی ثاقب صبح صبح ناشتا کر کے کام پر نکل جاتا جبکہ میں بستہ اُٹھا کر اسکول کے لیے گھر سے نکل جاتا اور دوپہر ساڑھے بارہ یا ایک بجے گھر آ جاتا اگر آنٹی عظمیٰ مجھے نہ بھی بلاتی تو میں خود ہی اُن کے گھر چلا جاتا اور پوچھ لیتا کہ کوئی کام ہے تو بتا دیں۔

میرا آنٹی کے گھر بہت آنا جانا ہو گیا اور آہستہ آہستہ میں آنٹی عظمیٰ کے ساتھ فری ہوتا گیا۔ ایک دن میری امی اور آنٹی عظمیٰ کی ساس محلّے کی ایک عورت کو دیکھنے گئے جو بہت بیمار تھی اور ہسپتال میں داخل تھی۔ تو اُس کی عیادت کے لیے چلی گئیں اُس دن میں اسکول نہیں گیا تھا۔ آنٹی عظمیٰ گھر میں اکیلی تھیں تو اُنہوں نے مجھے آواز دے کر بلایا۔

جب میں آنٹی عظمیٰ کے گھر گیا تو اُس نے کہا کہ واشنگ مشین کا سوئچ ٹوٹ گیا ہے تو بازار سے نیا لا کر لگا دو کیونکہ کپڑے دھونے ہیں۔ میں فوراً اُسی وقت بازار گیا اور نیا سوئچ لا کر پندرہ منٹ کے اندر واشنگ مشین کو لگا دیا۔ جب آنٹی عظمیٰ نے واشنگ مشین میں کپڑے ڈال کر مشین چلائی تو دو منٹ کے بعد بجلی چلی گئی۔

آنٹی نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور کچن سے دو کپ چائے بنا کر لے آئی۔ ہم دونوں بیٹھ کر چائے پینے لگے اور اِدھر اُدھر کی ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگے۔ آنٹی نے اُس دن چُست اور باریک کپڑے پہنے تھے کھلے گلے والی قمیض بغیر دوپٹے کے میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ اُن کا گورا بدن خوب چھلک رہا تھا اور میرے سامنے دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ میرا دل اُچھل کود ہو رہا تھا اور میں آنٹی کو یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ تو آنٹی نے ہنستے ہوئے پوچھا کہ عاقب اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو"؟ تو میں نے دل میں سوچا کہ آج سنہری موقع ہے چانس مل رہا ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے فوراً کہا

"آنٹی آپ کو دیکھ رہا ہوں آپ بہت خوبصورت اور پیاری ہو مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" اس پر آنٹی ہنسنے لگی اور کہنے لگی

"کہ میں کب سے تمہیں پیاری لگنے لگی ہوں؟ میں نے کہا کہ پہلے دن سے آپ مجھے پیاری اور اچھی لگتی ہو۔" پھر میں نے دو چار انڈین فلموں کے

ڈائیلاگ بولے اور ساتھ ہی کہا کہ میں نے آپ کا نام آنٹی نٹ کھٹ رکھا ہوا ہے تو آنٹی نے قہقہہ لگایا اور اٹھ کر گھر کا مین دروازہ لاک کر دیا اور چائے کے خالی کپ اُٹھانے کے لیے جان بوجھ کر میرے سامنے جھک گئی۔ اُن کے ہونٹوں اور چہرے پر شرارت رقص کر رہی تھی اور ہنستے ہنستے کہنے لگی

''لو جی مجھے تو پتا ہی نہیں تھا عاقب کب سے میرے دیوانے بنے ہوئے ہیں۔'' آنٹی جب کپ اُٹھانے لگی تو میں نے اُن کے ہاتھ پکڑ لیے اور چومنے لگا۔ آنٹی اپنے ہاتھ چھڑا کر بیڈروم کی طرف گئی تو میں بھی فوراً اُن کے پیچھے چلا گیا پھر ہم دونوں گناہوں کی دلدل میں گر گئے۔ ہمارے درمیان شرم وحیا کی تمام دیواریں گر گئیں۔ پھر اُس دن کے بعد سے ہمارے درمیان کوئی پردہ، کوئی جھجک نہ رہی۔ ہمیں جب بھی موقع ملتا ہم یہ قبیح فعل کرتے اب تو اکثر راتوں کو بھی آنٹی عظمیٰ مجھے اپنے گھر بلانے لگیں وہ اپنی بوڑھی ساس کو نیند کی گولیاں کھلا دیتی۔ اُس کے بچے بھی جلد سو جاتے اسی طرح میرے امی ابا اور بھائی ثاقب بھی جب گہری نیند سو جاتے تو میں آنٹی کے پاس رات کو چلا جاتا۔ اور اس طرح یہ شیطانی کھیل کھیلتے ہوئے ایک سال گزر گیا۔ میں گرتے پڑتے کلاس 9th میں پہنچ چکا تھا میری دیگر سرگرمیاں بھی بدستور جاری تھیں اب تو آنٹی عظمیٰ بھی مجھے کافی پیسے دے دیتی تھی۔ کچھ دن گزرے تو آنٹی کے شوہر خلیل صاحب بھی تین ماہ کی چھٹیوں پر گھر آگئے جس کی وجہ سے میرا آنٹی عظمیٰ کے گھر آنا جانا بالکل ختم ہو گیا تھا۔ ایک دن ابا جلدی گھر آگئے کیوں کہ اُن کی طبیعت خراب تھی اور وہ نڈھال تھے۔ محلّے کے ڈاکٹر سے دوائی لی جس سے وقتی آرام آیا تھوڑی دیر کے لیے مگر طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ اگلے دن سرکاری ہسپتال گئے تین گھنٹے کے انتظار کے بعد جب باری آئی تو ڈاکٹر نے سرسری طور پر ابا کو دیکھا اور دوائیوں کا نسخہ پکڑا دیا۔

دوائیاں لے کر گھر آگئے اور علاج شروع ہو گیا۔ جب تک دوائی کا اثر رہتا ابا کو آرام رہتا جیسے ہی دوائی کا اثر ختم ہوتا ابا کی طبیعت بگڑ جاتی۔ ابا کے پیٹ میں شدید درد اُٹھتا تھا جس سے وہ لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ابا دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ اُن کا رنگ بھی پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے زیادہ چل پھر نہیں سکتے تھے جس کی وجہ سے گزشتہ ایک ماہ سے دوکان بھی بند تھی۔ دو تین دفعہ ابا کا چیک اپ کروایا مگر وہی روٹین جو سرکاری ہسپتالوں میں ہوتی ہے۔ ایک رات ابا کو شدید درد کا دورہ پڑا دوائی بھی کھلائی مگر درد کم نہ ہوا پھر درد ختم کرنے والے انجکشن بھی لگے مگر درد ختم نہ ہوا۔ ابا کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ درد سے تڑپ رہے تھے ہم ابا کو فوراً ایک ٹیکسی میں بٹھا کر ہسپتال ایمرجنسی میں لے گئے جہاں پر موجود ڈاکٹر نے چیک اپ کیا، ڈرپ لگائی اور کچھ ٹیسٹ کروانے کو کہا۔ ابا کو ہسپتال میں داخل کر لیا گیا اور علاج شروع ہو گیا مگر آرام بالکل بھی نہیں آتا۔ دو دن بعد جب رپورٹیں آئیں تو پتا چلا کہ ابا کو انتڑیوں کا کینسر ہے۔ اس سے پہلے کہ کینسر کا علاج شروع ہوتا اُسی رات ابا درد کی شدت سے تڑپتے تڑپتے فوت ہو گئے۔

ابا کی موت کے بعد ہمارے گھر کے حالات بہت خراب ہو گئے۔ دوکان کرائے کی تھی، دو ماہ سے کرایہ ادا نہیں کیا تھا تو دوکان کے مالک نے دوکان میں موجود کریانے کا سامان کرائے کی مد میں ضبط کر لیا۔ بھائی ثاقب کچھ تھوڑے بہت پیسے لے کر آتا تھا جس سے بمشکل گزر بسر ہو رہی تھی۔ جس مکان میں ہم رہتے تھے وہ بھی کرائے کا تھا اُس کا کرایہ بھی ادا نہ کر سکے تھے اور تین ماہ کا کرایہ دینا تھا کیونکہ جو کچھ جمع پونجی تھی وہ ساری کی ساری ابا کے علاج پر خرچ ہو گئی تھی۔ مالک مکان نے ہمیں ایک ماہ کا نوٹس دیا کہ تمام کرایہ ادا کرو ورنہ مکان خالی کر دو۔ بھائی ثاقب نے اِدھر اُدھر سے کچھ قرض پکڑ کر مکان کا پچھلا کرایہ ادا کیا پھر فیصلہ یہ ہوا کہ یہ مکان چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ ابا تو کسی نہ کسی طرح باقاعدگی سے کرایہ ادا کر دیتے تھے مگر اتنا زیادہ کرایہ دینا ہمارے بس کی بات نہ تھی لہٰذا ایک اور آبادی میں ایک کمرے پر مشتمل اچھا سا گھر کرائے پر

لے لیا جس کا کرایہ بہت کم تھا۔

آنٹی عظمٰی کا خاوند خلیل چھٹیاں گزار کر واپس بیرون ملک چلا گیا تھا اب آنٹی کو پھر میری ضرورت تھی۔ مجھے ایک بات کی بہت ہنسی آتی ہے وہ یہ کہ جب تک آنٹی کا خاوند چھٹیوں پر گھر رہا تو آنٹی عظمٰی اس طرح نیک پروین بن گئی جیسے اس سے زیادہ پردے دار شریف اور خاوند پرست عورت کوئی ہے ہی نہیں اور پھر جیسے ہی اُس کا خاوند چلا گیا تو آنٹی نے سب پردے اور شرافت اُتار دی۔ جب میں آنٹی عظمٰی سے ملتا تو مجھے لگتا کہ اس سے بڑی فاحشہ، بے حیا اور رنڈی عورت دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اِس کا خاوند اس کے اور بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے پردیس میں محنت مشقت کر رہا ہے اور یہ صرف عیش کر رہی ہے بلکہ اپنے خاوند کی عزت کی دھجیاں اُڑا رہی ہے۔ مجھے عورت کے دوغلے پن اور مکروفریب کا اندازہ آنٹی عظمٰی کے کردار اور طور طریقوں سے خوب ہو گیا۔ مگر مجھے اِن باتوں سے کیا لینا دینا، تھا مجھ پر تو جوانی آ رہی تھی آنٹی عظمٰی مفت میں مجھے عیش کروا رہی تھی،

☆☆☆

چند روز کے بعد ہم نے وہ مکان خالی کر دیا اور نئے گھر میں شفٹ ہو گئے جو کہ پُرانے گھر سے کافی دور تھا۔ پُرانا گھر چھوڑنے کا مجھے صرف ایک ہی دکھ تھا اور وہ یہ کہ آنٹی عظمٰی سے دور ہو گیا تھا۔ مگر آنٹی مجھے کافی پیسے دیتی تھی تو میں مہینے میں آٹھ چکر آنٹی کی طرف لگا لیتا تھا۔ بھائی ثاقب الیکٹریشن کا کام مکمل طور پر سیکھ چکا تھا اور اُس نے ایک ادارے سے ڈپلومہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ ایک مکمل بہترین الیکٹریشن تھا۔ بھائی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا وہ گھروں، فیکٹریوں دوکانوں وغیرہ میں بجلی کی وائرنگ کرتا تھا۔ اب یہ ہوائی روزی تھی جب کوئی کام ملتا تو چار پیسے آ جاتے ورنہ فارغ۔ بھائی کو کسی نے مشورہ دیا کہ باہر کے ملک میں الیکٹریشن کی بہت ڈیمانڈ ہے تو وہاں چلے جاؤ اُدھر بہت پیسا۔ چنانچہ بھائی نے باہر جانے کی کوشش شروع کر دیں اور تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد بھائی کو ویزا مل گیا۔ بھائی نے اپنے کچھ دوستوں سے قرض لیا تھا جس کی وجہ سے اُس کا باہر جانے کا بندوبست ہوا تھا۔ لہٰذا کچھ دنوں کے بعد بھائی ثاقب باہر کے ملک چلا گیا اور ہم ماں بیٹا اکیلے رہ گئے۔ بھائی جاتے وقت کچھ پیسے امی کو دے گیا کہ تین چار ماہ ہمارے گزر جائیں پھر وہ باہر سے ہمیں پیسے بھیجتا رہتا۔

میں 9th کلاس کے امتحان میں تمام مضامین میں بُری طرح فیل ہو گیا تھا ہر مضمون میں زیرو نمبر تھے تو مجھے اسکول سے نکال دیا گیا تھا مگر مجھے اس کا کوئی دکھ یا غم نہیں تھا میری وہی روٹین جاری رہی۔ آوارہ گردی کرنا اور غیر اخلاقی فلمیں دیکھنا اور آنٹی عظمٰی کی قربت سے لطف اندوز ہونا۔ بھائی ثاقب کے مہینے میں دو تین خط آتے تھے۔ وہ خیریت سے پہنچ گیا تھا مگر ابھی تک وہ کام پر نہیں لگ سکا تھا۔ جو پیسے بھائی نے امی کو دے کر گیا تھا وہ دو ماہ میں خرچ ہو گئے تھے اب ہمارے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ جب فاقے کی نوبت آئی تو امی نے کہا کہ وہ لوگوں کے گھروں میں ماسی کا کام کریں گی'' تو میری غیرت نے گوارا نہ کیا اور خود کسی کام کی تلاش میں نکل پڑا ایک زیر تعمیر مکان پر مجھے اینٹیں ڈھونے کی مزدوری مل گئی۔ چونکہ زندگی میں کبھی کوئی بھاری کام نہیں کیا تھا تو ایک ہفتے کے بعد میری ہمت جواب دے گئی۔ پھر میں ایک رنگ روغن والے کاریگر کے ساتھ کچھ دن کام کیا تو یہ کام بھی پسند نہ آیا۔ مختلف کام کرتا رہا مگر کوئی بھی کام دلجمعی سے نہ کرتا تھا، بہرحال اتنا ضرور تھا کہ شام کو کچھ نہ کچھ پیسے مِل جاتے تھے۔ پھر ایک بندے کی معرفت مجھے ایک فیکٹری میں ورکر کی جاب مِل گئی وہاں ایک مہینہ کام کیا مگر جلد ہی اُکتا گیا تو فیکٹری کے سیلز منیجر نے مجھے سیل مین کی نوکری پر رکھ لیا پہلے دو ہفتے ٹریننگ ہوئی اور اس کے بعد فیکٹری کی مختلف مصنوعات کے سیمپل اور دیگر مال لے کر دوسرے شہروں میں سپلائی کرنے کی ڈیوٹی لگا دی۔ چونکہ میں آوارہ گردی کا عادی تھا، دوسرا اس کام میں کوئی محنت مشقت نہ تھی، تیسرا معقول تنخواہ اور کمیشن تھا مجھے یہ جاب بہت اچھی لگی۔ مجھے آنٹی عظمٰی کی طرف گئے دو تین مہینے ہو چکے تھے۔

اُس کی یاد بہت ستا رہی تھی تو اگلے دن اُن کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ آنٹی عظمیٰ کو اُس کے شوہر نے اپنے پاس بُلا لیا تھا۔ وہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ بیرون ملک اپنے خاوند کے پاس ایک ماہ میں چلی گئی تھی۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ مجھے آنٹی عظمیٰ اپنی قربت سے خوب نوازتی تھی اور میں اُس کا عادی ہو گیا تھا۔ اب میں کسی اور شکار کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا۔

فیکٹری مصنوعات کو دوسرے شہروں میں بھیجنے کے لیے ٹرک اڈے پر بُک کروا دیا جاتا تھا کچھ مال ریلوے کی مال گاڑی میں بُک ہو جاتا اور ہم سیل مین مصنوعات کے سیمپل بیگ میں ڈال کر مختلف شہروں کے لیے روانہ ہو جاتے جن شہروں میں میری ڈیوٹی لگی تھی وہاں جانے کے لیے میں نے ٹرین کا سفر اختیار کیا۔

ہمیں فیکٹری کی طرف سے سخت ہدایت تھیں کہ روزانہ بہترین صاف ستھرے کپڑے بلکہ پینٹ شرٹ اور ٹائی لگا کر جانا ہے، جوتے پالش ہوں اور روزانہ شیو بنا کر جائیں۔ ہر حال میں حُلیہ بہت اچھا ہونا چاہیے تھا۔ تمام سیل مین مختلف دوکانوں اور بڑے اسٹورز میں اپنی فیکٹری کی مصنوعات کے سیمپل پہنچاتے اور اُن سے آرڈر لے کر مال کی ترسیل کرتے ۔ چونکہ فیکٹری کی ہدایات پر روزانہ اچھا لباس پہننا پڑتا تھا تو اس وجہ سے میری پرسنیلٹی بہت اچھی ہو گئی تھی اور ٹریننگ کے نتیجہ میں بول چال میں رکھ رکھاؤ اور سلیقہ آ گیا تھا۔ دیکھنے والوں کی نظر میں، میں کوئی افسر لگتا تھا۔ اب میں روزانہ علی الصبح ناشتا کر کے سیدھا فیکٹری جاتا اور وہاں سے حاضری لگوا کر سیمپلز کا بیگ اُٹھا کر ریلوے اسٹیشن آ جاتا تھا یہاں سے مجھے ٹرین مِل جاتی تھی جس کے ذریعے میں مختلف شہروں میں گھومتا رہتا۔

آنٹی عظمیٰ کے جانے کے بعد مجھے اُس کی بہت یاد ستاتی تھی اور ہوس کی جو عادت پڑ چکی تھی اُس کی تکمیل کے لیے میں کسی شکار کی مسلسل تلاش میں تھا مگر ابھی تک کوئی کامیابی نہ مِلی تھی۔ پچھلے پندرہ بیس روز سے میں روزانہ طاہرہ کو پلیٹ فارم پر دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں بھی پسندیدگی نظر آ رہی تھی مگر ابھی تک اُس سے بات کرنے کی نوبت نہ آ سکی تھی۔

☆☆☆

میں نے طاہرہ کو اپنے بارے میں سب کچھ غلط بتایا۔ اپنا اصل نام عاقب کی بجائے ارسلان بتایا اور اپنے آپ کو بی، اے پاس سیلز آفیسر کے طور پر متعارف کرایا۔ گویا اُس وقت میری عمر صرف اٹھارہ سال کے اریب قریب تھی مگر میرے مضبوط لمبے قد کاٹھ کی وجہ سے میں بائیس تیئس سال کا لگتا تھا۔ طاہرہ کو میں نے اپنے آپ کو ایک امیر انسان ظاہر کیا اور یہ بھی بتایا کہ دنیا میں اکیلا ہوں اور بڑا سا اپنا ذاتی گھر ہے۔ تو اس وجہ سے طاہرہ، مجھ سے کافی امپریس ہوئی اور جب ہمیں ٹرین نے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچایا تو ہم دوست بن چکے تھے۔

اب ہماری روزانہ ملاقات ہوتی ہم دونوں اکٹھے ٹرین میں بیٹھتے خوب باتیں ہوتیں۔ طاہرہ اپنی اور اپنے گھر کی ہر بات مجھ سے شیئر کرتی جسے میں بے زاری سے سُنتا کیونکہ مجھے اُن سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں جلد از جلد اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ طاہرہ بہت سادہ، معصوم اور پُر خلوص لڑکی تھی۔ وہ بہت جلد مجھ پر اعتماد کر بیٹھی۔

کچھ دن گزرے تو اُس نے مجھے ٹرین سے اُترتے وقت ایک چھوٹا سا لفافہ دیا جسے میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ رات کو گھر آ کر میں نے وہ لفافہ کھولا تو اُس میں ایک مختصر سا خط تھا جس میں طاہرہ نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اُس نے لکھا کہ وہ مجھے بہت چاہنے لگی ہے، بہت پیار کرنے لگی ہے۔'' میں وہ خط پڑھ کر پُرزے پُرزے کر دیا اور پھینک دیا۔ اگلے دن میں نے بھی اپنی جھوٹی محبت کا اقرار کر دیا جسے سُن کر طاہرہ بہت خوش ہوئی اور ہواؤں میں اُڑنے لگی۔ اب میں نے اپنا مقصد حاصل کرنے لیے ایک اسکیم بنائی اور اپنی تاریخ پیدائش غلط بتائی اور وہ تاریخ چار دن کے بعد آ رہی تھی۔ دوسرے شہر میں پہنچ کر میں نے ایک

ہوٹل میں کمرہ بُک کروایا اور طاہرہ سے کہا کہ یہ سال گرہ میں اس بار صرف تمہارے ساتھ مناؤں گا۔
جسے سن کر وہ بہت خوش ہوئی چنانچہ مقررہ دن کو طاہرہ نے اپنے آفس سے آدھی چھٹی لی اور میرے لیے ایک پرفیوم کا تحفہ خوبصورت گفٹ پیک میں لے کر آئی۔ ہم نے ہوٹل میں لنچ کیا اور طاہرہ کو لے کر کمرے میں آ گیا، جہاں چھوٹا سا کیک میں نے بنوا کر رکھا تھا۔ جب میں نے کیک کاٹا تو طاہرہ نے تالیاں بجا کر مجھے وش کیا۔ پھر اُس نے کیک کا چھوٹا سا ٹکڑا میرے مُنہ میں ڈالا اور اسی طرح میں نے بھی کیک کا ٹکڑا طاہرہ کے مُنہ میں ڈالا اور آگے بڑھ کر طاہرہ کو اپنی بانہوں میں لے کر خوب پیار کرنے لگا اور ساتھ ساتھ انڈین فلموں کے رٹے رٹائے ڈائیلاگ بولنے لگا کہ طاہرہ تم میری جان ہو، میری زندگی ہو۔ بہت پیار کرتا ہوں تم سے۔ اب تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔

" طاہرہ نے بہت مزاحمت کی بہت روکا مگر میں کہاں رکنے والا تھا اور میں نے ایک معصوم یتیم لڑکی جو کہ مجھ سے سچا پیار کرتی تھی اس کی عزت کو روند ڈالا۔ جب میری ہوس پوری ہوگئی۔ طوفان تھم گیا تو طاہرہ رونے لگی اور کہنے لگی کہ ارسلان یہ کیا کر دیا"؟ تو میں نے اُسے تسلی دی کہ پریشان مت ہو۔ تم صرف میری ہو۔ میں بہت جلد تم سے شادی کرلوں گا۔ تمہاری ماں میری ماں ہے اب تم اور تمہاری ماں بہنیں میری ذمہ داری ہیں۔" الغرض طاہرہ کو جھوٹی تسلیاں اور مستقبل کے جھوٹے سپنے اور خواب دکھائے اور پھر ہر تیسرے چوتھے دن میں طاہرہ کی عزت لوٹتا۔ وہ بے چاری میری جھوٹی محبت کے چکر میں اپنی عزت لٹا رہی تھی۔
چند مہینے گزرے تو طاہرہ نے مجھ پر شادی کا زور دینا شروع کر دیا۔ روز بروز اُس کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا اور میں ہمیشہ کی طرح اُسے جھوٹے وعدہ پر ٹرخاتا رہا پھر ایک دن طاہرہ نے بہت بڑی قسم اٹھائی کہ جب تک میں اُس سے شادی نہیں کرتا وہ مجھے اپنے جسم کو چھونے بھی نہیں دے گی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ اپنی قسم پر قائم رہی اور میں اپنے اِرادے اور کوشش میں ناکام رہا۔
اب چونکہ وہ اپنی قسم اور ارادے پر ثابت قدم تھی اور مجھے بار بار واسطے دیتی، منتیں کرتی کہ مجھ سے نکاح کرلو اور میں حسبِ معمول جھوٹے وعدے کرتا رہا اب مجھے پکا یقین ہوگیا تھا کہ اب یہ مجھے اپنے اِرادے میں کامیاب نہیں ہونے دے گی تو میں نے چپکے سے اُس سے جان چھڑانے کا فیصلہ کیا اور اگلے روز اپنے سیلز مینجر سے درخواست کر کے اور بہانہ بنا کر اپنا سیل مین کا روٹ تبدیل کروالیا اور اپنے شہر سے مخالف سمت والے شہروں میں آنا جانا شروع کر دیا اور سفر کے لیے بس ویگن کا ذریعہ بنایا یہ تو شکر ہے میں نے اپنے بارے میں کوئی بھی بات اور معلومات طاہرہ کو درست نہیں بتائی تھیں ورنہ وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھ تک پہنچ جاتی۔ اب مجھے معقول تنخواہ اور کمیشن مل رہی تھی جس سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ میں اپنی پوری تنخواہ اپنی امی کے ہاتھ میں رکھ دیتا اور کمیشن کے پیسے اپنے پاس رکھتا، جس سے موج مستی کرتا۔ بھائی ثاقب خیریت سے باہر کے ملک پہنچ تو گیا تھا مگر اُسے وہاں ابھی تک کوئی معقول کام نہ مل سکا تھا، وجہ یہ تھی کہ بھائی وزٹ ویزے پر وہاں گیا تھا۔ وہاں رہنے لے لیے پکّے کاغذات، اقامہ اور کفیل کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ اُسے وہاں چوری چھپے اتنا کام مل جاتا۔ جس سے وہ بمشکل اپنی گزر بسر کر رہا تھا وہ ہمیں ایک روپیہ بھی بھیجنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ امی کو اب ہر وقت ثاقب بھائی کی فکر رہتی اور اسی فکر میں وہ بیمار رہنے لگیں۔ اُن کا ہلکا پھلکا علاج چلتا رہا۔ میں صبح کا گھر سے گیا رات گئے واپس لوٹتا تھا امی بے چاری سارا دن گھر میں اکیلی رہتی تھیں۔ آہستہ آہستہ اُن کو کئی بیماریوں نے گھیر لیا تھا جبکہ میں اپنی ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ اپنی دیگر سرگرمیوں میں مشغول رہا۔
طاہرہ کے بعد مجھے اب نئے شکار کی تلاش اور ضرورت تھی مگر مجھے کوئی ایسی عورت یا لڑکی نہیں مل رہی تھی چونکہ شروع سے ہی غلط صحبت میں رہتا تھا تو میرے آوارہ اور لفنگے دوستوں نے مجھے بازارِ حسن کا

راستہ دکھایا۔ ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد اب میری راتیں طوائفوں کے کوٹھوں پر گزرنے لگیں جہاں مجھے پیسوں کے عوض اُن کے جسم ملنے لگے اور میں دل کھول کر پیسہ لٹاتا اور جیب خالی کر کے رات کے گیارہ بارہ بجے گھر آتا امی میری راہ تکتے تکتے سو چکی ہوتیں وہ جب مجھ سے اتنا لیٹ اور دیر سے آنے کا پوچھتیں تو میں نوکری کا بہانہ کر دیا کرتا تھا۔ حالانکہ نوکری سے میں شام پانچ بجے فارغ ہو جاتا تھا۔ باقی کا ٹائم اپنے بدقماش دوستوں اور طوائف کے کوٹھے پر گزارتا۔ امی کی طبیعت اور صحت دن بدن گر رہی تھی تو ایک دن اُن کو اپنے ساتھ ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ان کو سپشلسٹ ڈاکٹر کے پاس لے جائیں جب سپشلسٹ ڈاکٹر کے پاس گئے تو اُس نے معائنہ کیا اور کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے۔

جب رپورٹس ملیں تو ڈاکٹر نے کہا ان کا مرض بہت پرانا ہے اور کافی بگڑ چکا ہے تو اس کے لیے لمبے اور مہنگے علاج کی ضرورت ہے۔ سر دست ہمارے پاس کوئی رقم نہ تھی چنانچہ امی کو لے کر گھر آ گیا۔ امی کو بہت زیادہ خون کی کمی بھی تھی تو ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کو کم از کم تین بوتلیں خون بھی لگے گا۔ ڈاکٹر کا نسخہ لے کر میڈیکل اسٹور پر گیا تو اُنہوں نے بتایا کہ ایک مہینے کی میڈیسن کم از کم پانچ یا چھ ہزار روپے کی آئے گی اس کے علاوہ خون کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ مہینے کی بائیس تاریخ تھی تو میں نے فیکٹری سے ایڈوانس تنخواہ مانگی تو اُنہوں نے کہا دو یا تین دن تک مل جائے گی۔ اس کے بعد میں اپنی ڈیوٹی پر جاتا رہا اور کمیشن کے پیسے بھی جمع کرنے لگا میرے پاس چار ہزار روپے جمع ہو چکے تھے جو کہ کمیشن کے طور پر ایڈوانس لیے تھے ابھی ایڈوانس تنخواہ بھی ملنی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک دوائی لکھ کر دی ہوئی تھی جس سے وقتی طور پر امی کو آرام اور سکون تو مل جاتا مگر یہ علاج نہیں تھا مکمل علاج کی الگ میڈیسن تھی جو کہ ابھی لینی تھی۔

اُس دن میں ڈیوٹی سے جلدی آ گیا تھا امی کو دوائی کھلائی اور وہ سو گئیں پھر میں گھر سے اپنے دوستوں کے پاس آ گیا تو ہم سب بازار حسن چلے گئے جہاں زندگی میں پہلی بار شراب پی اور آدھی رات تک بدکاری کرتا رہا اور جب میری جیب بالکل خالی ہو گئی تو

انہوں نے اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ گرتا پڑتا گھر پہنچا گھر
کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے کنڈی نہیں لگی تھی۔ جب
کمرے کی لائٹ آن کی تو دیکھا امی اوندھے منہ پڑی
ہوئی تھیں اور فرش پر خون بھی بکھرا ہوا تھا جس سے پتا
چل رہا تھا کہ اُنہوں نے خون کی اُلٹی (قے) کی ہے
۔ میں نے اُن کو فرش سے اُٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ اُن
کا جسم سرد ہو چکا تھا۔ فوراً بھاگتا ہوا قریبی ہسپتال گیا
اور ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور بتایا کہ
ان کا انتقال ہوئے کم از کم چار یا پانچ گھنٹے ہو چکے ہیں
اور ظاہری طور پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ شدید تکلیف
اور کرب میں اِن کا آخری وقت گزرا ہے اور خون کی
قے اور تکلیف ان کی موت کا باعث بنی ہے۔ اگر
انہیں بروقت ہسپتال لے جایا جاتا تو یہ بچ جاتیں۔

ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا مگر میری جو حالت اُس
وقت ہوئی وہ بتا نہیں سکتا میں۔ دھاڑیں مار مار کر
رونے لگا کیونکہ امی کی موت کا ذمے دار میں ہی
تھا۔ اگر اُن کا علاج شروع کروا دیتا تو یقیناً امی بچ
جاتیں مگر میں نے سارے پیسے طوائف کے کوٹھے پر
لٹا دیے۔ شراب پی کر بدکاری کرتا رہا اور میری
ماں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تنہا مر گئی۔ میرے رونے کی
آواز سن کر محلے والے آ گئے دلاسے تسلیاں دینے
لگے مگر مجھ پر کوئی تسلی دلاسہ اثر نہیں کر رہا تھا۔ پھر
فیکٹری سے کچھ ورکر آ گئے۔ فیکٹری مالکان نے دس
ہزار روپے بھیجے جن سے امی کا کفن دفن ہوا۔ اُس
کے بعد میرا سکون ختم ہو گیا۔ عجیب سی بے قراری
بے چینی رہنے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد فیکٹری جانا
شروع کر دیا۔ اب میں نے سیل ڈپارٹمنٹ سے
دوسرے شعبے میں ڈیوٹی لگوالی جہاں بطور ورکر میں
کام کرنے لگا۔ کوئی تین مہینے گزرے تو میرے جسم
میں ہلکی ہلکی خارش شروع ہو گئی جو آہستہ آہستہ
بڑھنے لگی۔ ساری ساری رات اپنے پورے جسم
کو کھجاتا رہتا ساتھ ساتھ دوائی بھی کھا رہا تھا۔ مہنگی
مہنگی کریمیں لوشن لگاتا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں
دوا کی۔ کھجلی کی وجہ سے پورے جسم میں زخم ہو گئے
اور پھر ان زخموں میں پیپ پڑنی شروع ہو گئی۔
سکن سپشلسٹ (جلد کے ماہر) ڈاکٹروں کو دکھایا،
خون کے ٹیسٹ کے علاوہ اور کئی دیگر ٹیسٹ بھی
کروائے۔ علاج بھی جاری رکھا مگر افاقہ نہیں ہو رہا
تھا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے میری پچھلی ہسٹری پوچھی تو
میں نے اُسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ میں جسم فروش
عورتوں کے پاس جاتا رہا ہوں تو بلڈ ٹیسٹ اور دیگر
ٹیسٹوں کی رپورٹس سے یہ بات سامنے آئی کہ یہ
مرض کسی جسم فروش عورت سے مجھے لگا ہے۔ یقیناً وہ
عورت جس کے پاس ہر روز کئی طرح کے بد قماش
مرد عیاشی اور بدکاری کے لیے آتے ہیں تو اُس سے
یہ مرض مجھے لگا تھا اور دن بدن بگڑتا جا رہا تھا۔ اب
تو پورے جسم میں سر سے پاؤں تک چنبل کی طرح
کے کھرنڈ نما زخم بن گئے تھے جن سے پیپ بہتی اور
انتہائی گندی بدبو اور سڑاند اُٹھتی تھی۔ کوئی بندہ بھی
دو منٹ کے لیے میرے پاس نہیں بیٹھ سکتا تھا، جہاں
جا کر بیٹھتا شدید بدبو کے بھبکے اُڑتے اور لوگ مجھ
سے دور ہو جاتے۔ مجھے فیکٹری سے بھی نکال دیا گیا
تھا۔ ان چنبل نما کھنڈر کے پیپ سے بھرے زخموں
نے آہستہ آہستہ انگور کے چھوٹے چھوٹے دانوں کی
طرح گچھوں کی شکل اختیار کر لی ہے میری شکل اور
جسم کے اعضا اس حد تک بدہیئت ہو گئے ہیں کہ جو
بھی ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھتا اُسے کراہیت
آ جاتی اور وہ ناک مُنہ چڑھا کر فرش پر تھوک دیتا۔
مکان کے مالک نے بھی مجھے اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔
اب میں سارا دن اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن کے
اُسی پلیٹ فارم پر پڑا رہتا ہوں جہاں کبھی طاہرہ
سے ملاقات ہوئی تھی۔ گزرتے ہوئے مسافر دور
سے ہی بھیک کے چند سکے پھینک کر اپنی راہ لیتے ہیں
اور میں بے بسی سے اُن کے چہروں کی طرف دیکھتا
رہتا ہوں آج میں لوگوں کے لیے عبرت کا نشان
ہوں ہر کوئی مجھے دیکھ کر توبہ توبہ کر کے کانوں کو ہاتھ
لگاتا ہے۔

☆☆☆

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک
ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ
یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 11

سلمان کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ہی نورانی چہرے والے بزرگ اس کے سامنے کھڑے ہیں۔ جنھیں اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ جو اسے آسمانوں کی سیر کرا رہے تھے۔ ایک ہی پل میں وہ اپنے اس کرب اس دکھ کو فراموش کر بیٹھا جس کی وجہ سے وہ خودکشی کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔

''تو کیا مجھے آپ نے مرنے سے بچایا؟'' بمشکل اس کے منھ سے یہ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کرادا ہوئے۔ بزرگ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ سب اس مالک کی وجہ سے ہے۔ میں نہ ہی کوئی کام اس کی مرضی کے بنا کرسکتا ہوں اور نہ ہی اس کی رضا کے بغیر۔ مجھے حیرت ہے کہ جب تم مجھ سے ملے اور میں نے تمھیں ایسے لوگوں سے ملایا جو کائنات کی بہترین جگہ پر تھے۔ جن کے چہروں سے نور اور طمانیت جھانک رہی تھی۔ جنھیں دیکھتے ہی تمہارا اپنا دل بھی مچل اٹھا اور تم اس دروازے سے گزرنے کو بے چین ہوگئے۔ جس سے ایسے سب لوگ گزر کر اندر جا رہے تھے۔ تم نے پوچھا تھا یہ کون لوگ ہیں تو میں نے تمھیں بتایا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا میں رہ کر محبتوں کے دکھ اور صدمے جھیلے اور ثابت قدم رہے۔ اسی لیے انھیں ان کو دکھوں اور محرومیوں کا بدلہ ایسے شاندار انداز میں دیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد بھی تم نے محبت میں ملی ہوئی ناکامی کے ایک ہی وار میں خود کو ختم کر دینا چاہا۔''

سلمان کے چہرے پر شرمندگی امنڈ آئی۔

''جانتے ہو ایسا کرکے تم کہاں جاتے؟ ایسی جگہ جہاں کوئی جانا پسند نہیں کرتا۔ جو دوزخ سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ جہاں پہنچنے کے بعد کوئی بھی اندر جانے پر راضی نہیں ہوتا تو اسے زبردستی دھکیلا جاتا ہے۔ وہ چیختے ہیں، چلاتے ہیں، فریاد کرتے ہیں۔ ان کی آہ و فغاں سے ایک عالم کانپ جاتا ہے مگر انھیں پناہ نہیں ملتی۔ کیونکہ انھوں نے محبت میں ناکام ہو کر یا تو بے ایمانی کی اپنی ناکامی کا بدلہ لیا اور دنیا میں رہ کر خود کو شانت کرنے کی بھول کی یا پھر انھوں نے تمہاری طرح اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔'' یہ کہہ کر نورانی صورت والے بزرگ خاموش ہوگئے، اور سلمان کا ہاتھ پکڑ کر پاس ہی ایک بنچ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''جاننا نہیں چاہتے صحیح کیا ہے؟''

''چاہتا ہوں!'' سلمان کے حلق سے بہت مختصر اور ہلکے سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔

''تو خود سے کیوں نہیں پوچھا، میرے پوچھنے کا انتظار کیوں کیا۔ یاد رکھو جو صحیح ہے اسے جاننے کی جستجو ہی انسان کا اصل مقصد حیات ہے۔ اور صحیح کو جاننے میں تردد نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی دیر کرنا چاہیے۔ کبھی بھی صحیح کو جاننے میں کی جانے والی دیر کی وجہ سے غلط اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ کیونکہ غلط ہمیشہ صحیح کے پیچھے لگا رہتا ہے اور جیسے ہی اسے موقع ملتا ہے وہ صحیح بن کر انسان کو دھوکا دیتا ہے اور انسان اکثر اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ اس لیے صحیح کو جاننے میں کبھی دیر نہیں کرنا چاہیے۔''

''صحیح کیا ہے بزرگ محترم؟'' اس بار سلمان کے لہجے میں جاننے کی جو جستجو تھی اسے بزرگ نے صاف طور پر محسوس کر لیا تھا۔

''صحیح یہ ہے کہ اپنی محبت کو اس وقت تک دل میں سلگنے والی آگ میں جلنے دو جب تک وہ جل کر راکھ نہیں ہو جاتی۔ یہ راکھ ہی ہے جس میں چھپی چنگاری ایک اور آگ کو جنم دیتی ہے۔ انسان دکھوں سے ہار جائیں تو یہ راکھ سرد ہو جاتی ہے اور پھر کوئی نیا جنم نہیں ہوتا۔ نیا جنم نہ ہو تو سمجھو انسان کی زندگی کا مقصد ختم ہو گیا اور یہ مالک نہیں چاہتے۔ جب وہ ایسا چاہیں گے تو انسان اور جنات دونوں کے ہاں جنم دینے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ دکھ کو، چنگاری کو اور زندگی کو۔''

سلمان کو ایسا لگا جیسے اس کی سمجھ میں وہ بات بھی آگئی ہے جو اس نے جاننا بھی نہیں چاہی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے جانکاری سے اس کا سینہ ایسے روشن ہو گیا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں خدا کی کیا مرضی ہے وہ اس سے کیا کام لینا چاہتا ہے لیکن ایک بات طے تھی کہ خدا جو بھی چاہتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں چاہتا کہ اس کی مخلوق اس کی دی ہوئی زندگی کو کسی بھی کارن اس کی مرضی کے بغیر ختم کرنے کی غلطی کریں۔

''بزرگ محترم مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے سارے سوالوں کے جواب مل گئے ہیں۔ کیا آپ مجھے میرے ایک اور سوال کا جواب دے سکتے ہیں؟'' سلمان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''پوچھو'' انھوں نے بہت ہی مختصر کہا۔

''کیا جنات اور انسان دونوں میں کبھی محبت ہو سکتی ہے؟ کیا انسان اور جنات دونوں کا مقصد ایک ہے؟'' سلمان نے اس طرح پوچھا جیسے وہ اس ایک سوال میں سب کچھ پوچھ لینا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ وہ انسان اور جنات کے بیچ میں پھنس کر الجھ سا گیا تھا۔

''تمہارا سوال ایک نہیں ہے، تم نے اسے ایک بنا دیا ہے۔ یہ لالچ ہے۔ جو کچھ تم جاننا چاہتے ہو اسے جینے کی خواہش کرو جان جاؤ گے۔'' اتنا کہہ کر بزرگ محترم خاموش ہو گئے۔

سلمان کی سمجھ میں نہیں آیا اسے شاید اپنے سوال کا ٹھیک اور واضح جواب ملا بھی نہیں تھا۔ لیکن اسے لگا جیسے اب اسے مزید کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چپ رہا۔ بزرگ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سلمان کو لگا جیسے اسے اب اور کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی، جیسے کسی نے اسے اندر سے روک رکھا تھا۔ کافی دیر بعد بزرگ نے سلمان سے کہا۔

''ہمیں پیاس لگ رہی ہے'' سلمان نے یہ سنتے ہی جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا مگر اسے دور دور تک کہیں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں سے پانی مل سکتا ہو۔ پھر بھی وہ اٹھا اور پانی کی تلاش میں چل دیا۔ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اسے کسی خدا ترس آدمی کی اس ویرانے میں بنوائی ہوئی ایک سبیل نظر آئی جہاں دو مٹکے رکھے تھے۔ سلمان یہ دیکھ کر خوشی اور طمانیت سے سرشار ہو گیا۔ وہ دوڑ کر اس سبیل کے قریب پہنچا اور اس نے مٹکے کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تو وہ پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اسے خوشی کے مارے یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملی کہ اس ویرانے میں، وہ بھی رات کے اس وقت کس نے ان مٹکوں کو پانی سے بھرا ہے، کون ہے جو مسافروں کی پیاس کو بجھانے پر مامور ہے۔ سلمان نے جلدی سے پیالے میں پانی ڈالا اور اسے سنبھال کر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور جہاں بزرگ بیٹھے ہوئے تھے

اس طرف چل دیا۔ اپنے اندازے سے وہ جس جگہ پہنچی وہاں نہ بزرگ تھے اور نہ ہی وہ بیچ تھی جس پر وہ بزرگ بیٹھا چھوڑ کر گیا تھا۔ جو خیال اسے سب سے پہلے آیا وہ یہی تھا کہ وہ غلط جگہ پر آ گیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں شاید بھٹک گیا ہے۔ اس لیے وہ جلدی سے لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا مخالف سمت میں چل دیا لیکن دیر تک بھی اس سمت میں بھی دوسری سمت میں وہ تلاش کرتا رہا لیکن اسے وہ جگہ نہیں ملی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ جگہ جہاں پہنچی تھی۔ یہ کوئی زیادہ دور بھی نہیں تھی کہ وہ اس طرح بھٹک سکتا کہ کہیں اور نکل جاتا۔ وہ جگہ یہیں کہیں تھی لیکن اب اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ جب وہ کافی دیر کی تلاش کے بعد بھی مطلوبہ جگہ کو تلاش کرنے میں ناکام ہو گیا تو اس نے سوچا شاید یہ بھی اس کا اسی طرح کا خواب تھا جیسے اس نے پہلے ان بزرگ کو خواب میں دیکھا تھا۔ لیکن اسے اپنی ہی اس بات پر اس لیے یقین نہیں آیا کہ مٹی کا جو آبخورہ اس کے ہاتھوں میں تھا وہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے خواب نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر کی مزید تلاش کے بعد اس نے واپس آبخورے کو اس کی اپنی جگہ پر رکھنے کی غرض سے اس طرف قدم بڑھا دیے جہاں وہ سبیل ایستادہ تھی۔ اور یہ دیکھ کر اس کا یقین مزید پختہ ہو گیا کہ سبیل اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اس نے آبخورے کو اس کی جگہ پر رکھا اور واپسی کے لیے قدم اٹھائے جانے کیوں اس کے دل میں کوئی خیال آیا اس نے پلٹ کر دیکھا تو سبیل بھی اپنی جگہ سے غائب ہو چکی تھی اور دور دور تک لق و دق ویرانہ لیٹا ہوا تھا جہاں چاند کی چاندنی نے ایسا اجالا کیا ہوا تھا کہ دن کا گمان ہوتا تھا۔ سلمان کچھ لمحوں کے لیے الجھ کر رہ گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا تھا۔ اگر بزرگ سے ملاقات اس کا خواب تھا تو پھر وہ سبیل!!! کیا وہ بھی اس کا خواب تھا؟ نہیں... نہیں... اس نے خود سے کہا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے خود اس سبیل پر دھرے مٹکوں سے پانی نکالا تھا اور اس پانی کو آبخورے میں بھر کر وہ کتنی ہی دیر اس ویرانے میں بزرگ وار کو تلاش کرتا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ کوئی خواب نہیں تھا یہ سب حقیقت تھی اور حقیقت بھی کبھی کبھی اپنا جلوہ دکھا کر آنکھوں سے اوجھل ہو جایا کرتی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو ایسی باتوں سے یقین دلایا اور پھر ایک طرف کو چل دیا۔ یہ سارا منظر خواب تھا یا حقیقت لیکن ایک بات وہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ اسے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے اور خودکشی کرنے کا حق نہیں ہے کہ یہ مالک کی مرضی کے خلاف ہے اور وہ مالک کی مرضی کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ مالک کی مرضی کے خلاف جو بھی کام کیا جاتا ہے اس کی سزا کبھی ختم نہیں ہوتی اور ایسی سب ہی مخلوقات بہت بدنصیب ہیں جو مالک کی مرضی کو جان کر بھی اس کی خلاف ورزی کرتی ہیں۔ اب وہ بھی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گا جو اس کے مالک کی مرضی نہ ہو۔ اسے بزرگ نے جو کچھ بھی سمجھایا تھا اس میں سے یہ ایک بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ وہ ایسی باتوں پر غور کرتا ہوا اپنے مدرسے لوٹ آیا۔

☆......☆......☆

سلمان کریم کو اپنے دوست فارس رحمان کی بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کیونکہ اس بات کو سمجھنے میں خود اس کا بھی فائدہ تھا اور جس بات میں انسان کا اپنا فائدہ ہوتا ہے وہ بات اسے سب سے پہلے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ فائدہ یہ تھا کہ ایسے بہت سے گناہ خود سلمان کریم نے بھی کیے تھے جن کی وجہ سے صنوبر جیسی کوئی بھی لڑکی انھیں جواز بنا کر اس سے بھی شادی سے انکار کر سکتی ہے۔ تو کیا فارس سے یا اس کے دوستوں سے بھی کوئی لڑکی شادی کے لیے ہاں نہیں کہے گی؟ ظاہر ہے شادی سے پہلے سب ہی مرد بچے ایسی حرکتیں کیا کرتے ہیں اور ان حرکتوں کی وجہ سے انھیں دنیا اور سماج سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی فارس خود اس کے باپ آصف کریم سے بھی زیادہ بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا۔ اس کے خاندان کے پاس اتنی دولت تھی کہ خود اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی دولت کا شمار کیا ہے۔ ایک ایسے رئیس زادے کو اتنا تو حق ہونا ہی چاہیے کہ وہ اپنی بے شمار دولت کو جیسے چاہے اڑائے، جیسے چاہے اس کا استعمال کرے۔ اگر رئیس زادے ایسا نہ کریں تو ان کی دولت کا فائدہ بھی کیا ہے۔ وہ تو ان کی بنکوں میں، ان کی گھریلو تجوریوں میں پڑی پڑی سڑتی رہے گی اور جو چیز سڑ جاتی ہے وہ قابل استعمال نہیں رہتی۔

سلمان کو فارس ہر طرح سے اپنی بہن صنوبر کے لیے موزوں اور درست انتخاب معلوم ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ صنوبر کو اپنے اسی دوست کی بیوی بنوائے گا کیونکہ اس میں اس کا بہت فائدہ تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اگر اس کے پاپا بھی جب یہ بات سنیں گے کہ ایک اتنے بڑے بزنس مین گھرانے سے صنوبر کا رشتا آیا ہے تو وہ اسے خوشی خوشی قبول کرلیں گے۔ کیونکہ دولت کو دولت سے ملاؤ تو وہ اور بڑھتی ہے اور جو چیز بڑھتی ہو وہ ہمیشہ خوشی دیتی ہے، طاقت دیتی ہے۔ کچھ دن سے ویسے بھی پاپا کے بزنس میں کچھ مندی کا رجحان آیا ہوا تھا یہ بات ایک دن انھوں نے خود اسے بتائی تھی ایسے میں اگر فارس کے والد پاپا کی کوئی مدد کردیں یا ہمارے شیئرز خرید لیں تو یقیناً پاپا کا بزنس سنبھل سکتا ہے اور پھر یہ تو کاروباری باتیں ہیں اصل بات تو یہ ہے کہ صنوبر اتنے امیر اور ناقابل بیان دولت مند خاندان کی بہو بن کر کس قدر مزے کی زندگی گزارے گی۔ ایک لڑکی کو اس سے زیادہ اور چاہیے بھی کیا ہوتا ہے۔

ایسی ہی باتیں سوچ کر سلمان کریم اپنے گھر پہنچا اور اس نے سیدھے بے صبری کے ساتھ اپنے باپ آصف کریم کے کمرے کا رخ کیا۔ اتنی عجلت کا تقاضا تو فارس نے بھی نہیں کیا تھا جتنی جلدی سلمان نے دکھانا شروع کردی تھی۔ اصل میں سلمان ہمیشہ کا اتاولا لڑکا تھا، جذبات سے بھرا ہوا۔ اسے لگتا تھا جو بھی بات ذہن کے دروازے پر دستک دے اسے فوراً عمل میں بھی آجانا چاہیے۔ ایسے لوگ یہ بات نہیں جانتے کہ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے اور کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ کم سے کم کوئی انسان انھیں اپنے جیون میں عملی جامہ پہنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے کتنے ہی ایسے انسان تھے جنھوں نے اڑن کھٹولے کے بارے میں سنا تھا لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں اڑن کھٹولا نہیں دیکھا تھا۔ جو آج کی دنیا کا ہوائی جہاز بن کے انسانوں کو اڑن کھٹولے سے بھی زیادہ برق رفتاری سے اور زیادہ بڑی تعداد میں لے کر اِدھر اُدھر پہنچا دیتا ہے۔ بعض باتوں کو انسان دیکھ نہیں پاتے عملی شکل میں مگر ان کا بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اور بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اتنی الل ٹپ ہوتی ہیں کہ ان کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ وہ ذہن میں پیدا ہونے والی خرافات ہوتی ہیں اور ان خرافات کو کبھی بھی حقیقت بننا نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن جس وقت کسی بھی انسان کے ذہن میں کوئی بات آتی ہے تو وہ پلک جھپکتے میں اس کی خواہش بن جاتی ہے اور سب ہی خواہشوں کے بارے انسان یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ہر خواہش ضرور پوری ہو۔ کم سے کم اس وقت یہی کیفیت سلمان کریم کی بھی تھی۔ اس نے فارس کو اپنا بہنوئی مان کر مستقبل کے بہت سے خواب دیکھنا شروع کردیے تھے۔ ایسے ہی سہانے سپنے لے کر وہ اپنے والد آصف کریم کے پاس پہنچا لیکن کمرا خالی تھا۔ اسے پتا چلا کہ اس کے والد اسٹڈی میں ہیں۔ اسے انتظار کرنے کی ویسے بھی عادت نہیں تھی اس لیے وہ فوراً اسٹڈی میں پہنچ گیا۔ کہیں نہ کہیں سلمان کریم کے دل میں یہ خیال بھی ضرور موجود تھا کہ اس کے والد کچھ دن پہلے اس کی اس رات والی حرکت سے جو ناراض ہو گئے تھے اس بات کو سن کر ان کی یہ ناراضگی بھی دور ہو جائے گی اور انھیں احساس ہوگا کہ اس دن فارس کو اس ہو ہا ہلا پارٹی میں فارس کا آنا اور اس کا صنوبر کو دیکھنا ہمارے فائدے میں ہی رہا۔

یہی سوچتا ہوا وہ اپنے باپ کے پاس پہنچا۔ آصف اس وقت پیانو بجانے میں منہمک تھا اور اسے سلمان کے آنے کی مطلق خبر نہیں ہوئی۔ وہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے تو سلمان کے لیے انھیں ڈسٹرب کرنا اور مطالعے سے روک کر اپنی بات کہنا کہیں آسان تھا لیکن پیانو تو وہ اس طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر اور آنکھیں بند کر کے بجایا کرتے تھے کہ انھیں ڈسٹرب کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ اور سلمان وہ انسان تو تھا ہی نہیں جس نے صبر کرنا سیکھا ہو۔ اس نے کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر سوچا کہ اسے کیسے اپنے باپ کو متوجہ کرنا چاہیے۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر اسے ایسی کوئی چیز نہیں نظر آئی جس کے ذریعے وہ اپنا مقصد پورا کرسکتا۔ اسی طرح بے چینی میں اسے کئی منٹ گزر گئے تو اس نے زور زور سے اپنے باپ کو پاپا..... پاپا کہہ کر پکارا مگر آصف پر اس کی پکار کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ بدستور اپنی

محویت میں مگن پیانو کے سُر چھیڑتا رہا۔ سلمان کی بے چینی حد سے سوا کر گئی اور اس نے اپنے پاپا کے عین کان کے قریب اپنا منھ لے جا کر زور سے چلا کر پاپا کہا تو... آصف کریم ایک دم سے چونک کر اچھل پڑے۔ انھوں نے پہلے تو اپنے اوسان بحال کیے اور... پھر غصے سے اپنے بدتہذیب اور نالائق بیٹے کی طرف دیکھا۔

''سوری پاپا مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی'' باپ کی جھاڑ اور دھاڑ سے پہلے سلمان نے ندامت سے کہا۔

''کہو'' آصف کریم نے اپنے غصے پر قابو کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اب سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنے آیا ہے اُس کس طرح کہے کیونکہ یہ بات اس طرح کے ماحول میں اور ایسی کیفیت کے ساتھ کہنے والی نہیں تھی۔ لیکن اب کہے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ بہت ہی بے ڈھنگے پن سے بولا۔

''پاپا میں صنوبر کے لیے ایک رشتہ لایا ہوں۔ بہت امیر اور بڑے بزنس مین کے بیٹے کا رشتہ۔'' سلمان کی بات سن کر آصف کریم نے اسے حیرت سے اس طرح دیکھا جیسے اس کا بیٹا کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا بیٹا پوری طرح اپنے حواسوں میں ہے تو وہ بولا۔

''اور اس بات کے لیے تم نے میرے کانوں کے پردے پھاڑ ڈالنے کی کوشش کی؟'' سلمان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔

''کیا یہ بات ہم بعد میں نہیں کر سکتے تھے۔ اور بائی دی وے یہ رشتے لانے کا کام تم نے کب سے شروع کیا؟ تمھیں کیا لگتا کہ ہم اس کے ماں باپ یہ کام کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔ کیا صنوبر کی عمر نکل چکی ہے یا کچھ ہی دیر بعد وہ کسی لڑکے کے ساتھ بھاگنے والی ہے جس کے لیے تم نے مجھے اس طرح ڈسٹرب کر کے یہ بہت اہم بات بتانا ضروری سمجھا'' باپ کا غصہ بڑھتا چلا گیا اور سلمان کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کی ان مدلل اور معقول باتوں کا جواب کیا کہہ کر دے اسے اپنا آپ بہت ہی بے وقوف معلوم ہونے لگا۔

''اچھا ہم بعد میں بات کرتے ہیں'' یہ کہہ کر اس نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی۔

''رکو......'' اس کے بڑھتے قدم تھم گئے۔'' یہ بات اچھی طرح سن لو صنو! بر ایک سمجھدار اور ذہین لڑکی ہے۔ وہ اپنی شادی کا فیصلہ خود کر سکتی ہے کیونکہ ہم نے اسے یہ اختیار دیا ہے۔ جب تک وہ خود اپنے منھ سے یہ نہیں کہہ دیتی کہ اس نے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہمیں دے دیا ہے تب تک ہم اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر نہیں سکتے اور یہی بات تم پر بھی صادق آتی ہے۔'' اپنے باپ کی بات سننے کے بعد سلمان کو اتنی بات ضرور سمجھ آ گئی تھی کہ غلط موقع پر اور غلط انداز میں کی جانے والی کوئی بھی بات اپنا اثر کھو دیتی ہے۔ اس وقت اگر اس نے اپنے باپ کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے بجائے اپنے اس غصے میں اس کا ستیاناس کر دیں گے جو انھیں پیانو بجانے سے روکنے سے آ چکا تھا۔ ویسے بھی باپ کو متوجہ کرنے کا یہ بہت ہی بھونڈا طریقہ تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور اپنا موڈ اچھا کرنے والے کاموں میں مشغول ہو گیا۔

......☆☆☆......

صنوبر کا دل آج کچھ عجیب سی اداسی کا شکار تھا یہ اداسی کس وجہ سے تھی اگر اس سے کوئی پوچھتا تو وہ کبھی نہ بتا پاتی کیونکہ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ بنا کسی معقول وجہ کے وہ کیوں اداس ہے۔ یہی بات کافی دیر سے شرجیل اس سے پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا اور شرجیل جیسا سائنٹفک سوچوں کا مالک انسان یہ بات کیسے سمجھ سکتا تھا کہ کبھی دل واقعی اداس ہوتا ہے اور بظاہر اس کی کوئی وجہ سامنے نہیں ہوتی دکھائی نہیں دیتی اس لیے سمجھ میں نہیں آتی۔ صنوبر کی بھی یہی کیفیت تھی لیکن یہ بات شرجیل کو چاہ کر بھی سمجھا نہیں سکتی تھی۔ اور وہ شرجیل ہی کیا جو بنا کسی وجہ کے اس کی بات کو تسلیم کر لیتا۔

''کائنات میں ایسا کوئی کام، ایسی کوئی کیفیت نہیں ہے جس کی کوئی وجہ نہ ہو۔ کائنات کی ہر ہر حرکت کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے'' شرجیل نے دلائل دیے۔

''میں مانتی ہوں... ایسا ہے مگر آج میں خود اس نئی کیفیت سے گزر رہی ہوں۔ تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ بعض اوقات بنا وجہ کے بھی دل اداس ہو سکتا ہے۔ جب تم میرے پاس نہیں تھے اور ایسا کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا تو میں اسے ہمیشہ تمہاری جدائی اور ناموجودگی سے تعبیر کر کے خود کو مطمئن کر لیا کرتی تھی لیکن اب تو تم میرے ساتھ ہو، میرے سامنے ہو اب ایسا کیوں ہو رہا ہے میں جان نہیں پا رہی۔'' صنوبر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''تم کہنا چاہ رہی ہو کہ میری غیر موجودگی میں بھی تم ایسی کیفیت سے گزرتی رہی ہو؟''

''ہاں... لیکن میں اس وقت خود کو یہ سمجھا لیا کرتی تھی کہ تم نہیں ہو اس لیے دل کی یہ حالت ہے۔''

''کیا مطلب ہے! کیا تم یہ کہنے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ کیفیت اس وقت بھی میری ناموجودگی کی وجہ سے نہیں تھی؟''

''شاید.........!!'' صنوبر نے اس طرح کہا جیسے وہ کہیں کھوئی ہوئی سی ہے۔ شرجیل اس کی بات سے لمحے بھر کو پریشان تو ضرور ہوا لیکن اس نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ اگر صنوبر کی بات کو زیادہ اہمیت دی گئی تو کہیں وہ اس کے اثر میں ڈوبتی نہ چلی جائے اور یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس لیے وہ اسے ٹک شاپ کی طرف لے کر چل دیا جہاں سے انھوں نے کوفی پی اور اِدھر اُدھر کی بہت سی باتوں کے درمیان صنوبر کی وہ کیفیت دور ہوگئی یا اس نے ایسا سمجھا کہ شاید وہ اس کیفیت سے نکل آئی ہے۔

''شرجیل ہمارا یہ لاسٹ ایئر ہے۔ اس کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' صنوبر نے اس کے کاندھے سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''ارادہ کیا ہے! ڈیڈی نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے مجھے پینٹنگ کی کلاسیں لینے کی اجازت تو ضرور دے دی تھی لیکن وہ اسے پروفیشن بنانے کی تو کبھی بھی اجازت نہیں دیں گے۔ تو سمجھ لو کہ بس ڈیڈی کا بزنس سیکھوں گا اور پھر اسے اپنے کچھ طریقوں سے چلاؤں گا۔'' شرجیل نے سوچتے ہوئے مزے لے لے کر کہا۔

''اور اس کے بعد...؟'' صنوبر کو جس جواب کی توقع تھی ظاہر وہ اسے نہیں مل سکا تھا۔

''جانتا ہوں تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو۔ جب ڈیڈی کے بزنس میں کوئی جگہ بنا لوں گا تو ان سے اپنی اور تمہاری بات کروں گا''

''تمہیں لگتا ہے وہ مان جائیں گے؟'' صنوبر نے جلدی سے کہا۔

''انھیں ماننا ہی ہوگا۔ وہ جانتے ہیں میں نے ان کی پہلے جو آفر ہے وہ اسی لیے ٹھکرائی تھی۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں یہاں اس پینٹنگ اسکول میں کس لیے آتا ہوں... پڑھنے سے زیادہ میں تمہارے ساتھ رہنے کے لیے آتا ہوں۔''

''جانتی ہوں.... مگر مجھے اب بھی ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے ڈیڈی اس رشتے کو آسانی سے قبول نہیں کریں گے'' صنوبر کو پھر جیسے اسی اداسی نے جکڑنا شروع کر دیا تھا۔

''مت پریشان ہو میں انھیں منا لوں گا۔ تمہارے علاوہ میں کسی اور سے شادی کرنے کا سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ اس لیے تم بھی ایسی باتیں مت سوچو۔ بس اتنا جان لو ہمیں کوئی بھی الگ نہیں کر سکتا۔ ہم ایک دوسرے کے لیے اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں''

شرجیل کے منہ سے ایسی باتیں سن کر صنوبر کو اچھا تو بہت لگا مگر اس کی ہنسی نکل گئی۔

''ہنس کیوں رہی ہو۔ کیا تمہیں میری باتیں کوئی لطیفہ لگ رہی ہیں؟'' شرجیل کو حیرت ہوئی مگر غصہ بالکل نہیں آیا۔

''اصل میں تمہاری باتوں میں پرانے زمانوں کے پیار کرنے والوں جیسا احساس ہے۔ آجکل ایسی باتیں نہ کوئی کرتا ہے اور نہ ہی لوگوں کو اب ان باتوں کا یقین ہے''

''تمہیں بھی نہیں ہے؟'' شرجیل کو اس وقت یہی بات پوچھنا ٹھیک معلوم ہوا یا پھر یہ اس کے منہ سے برجستہ نکلنے والا جملہ تھا۔

''مجھے تو تمہاری سب باتوں پر یقین ہے اور تمہیں شاید یہ جان کر اچھا لگے گا کہ میں ایسے ہی عشق، ایسی ہی محبت کی متلاشی رہی ہوں۔ میری روح کسی قدیم محبت کی بچھڑی ہوئی داستان کا حصہ لگتی ہے۔ مجھے اور شاید انسان کو اسی وقت اپنی محبت میں سکون اور راحت کا احساس ہوتا ہے جب وہ اسے ایسی ہی معلوم ہو جیسی وہ دل سے چاہتا ہے۔ اگر تم آج کل کے نوجوانوں کی طرح ہوتے جو محبت کو بس ٹائم پاس سمجھتے ہیں تو شاید میں تمہاری کمپنی میں کبھی ایسا سکون اور راحت محسوس نہ کرتی یا شاید مجھے تم سے محبت ہوتی ہی نا'' صنوبر کی بات سن کر شرجیل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے چومتے ہوئے بولا۔

''سچ کہا تم! انے دنیا میں بہت کچھ بدل چکا ہے مگر جس طرح سورج کا کام گرمی دینا ہے، روشنی دینا ہے۔ ہزاروں سال سے وہ اپنا یہی ایک کام کیے جا رہا ہے اسی طرح محبت بھی دلوں کو سکون اور راحت پہنچانے کا کام کرتی رہی ہے۔ جس محبت میں سکون اور راحت نہ ہو وہ محبت ... محبت نہیں ہوتی ٹائم پاس ہوتی ہے'' شرجیل کی باتوں نے اس کے پور پور میں جیسے امنگ اور مستی سی دوڑا دی۔ اسے ایسا احساس ہوا کہ وہ شرجیل سے دور رہ کر، اس کے بغیر مر جائے گی۔ اس کی زندگی کا شرجیل کے بغیر کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

''لوگ کہتے ہیں شادی کے بعد محبت وہ نہیں رہتی جو شادی سے پہلے ہوتی ہے۔ کیا تم بھی ایسا مانتے ہو؟''

صنوبر ان باتوں کے ختم ہونے کے خوف میں مبتلا ہو گئی۔ اسے لگنے لگا اس وقت کو، اس لمحے کو کبھی بھی ختم نہیں ہونا چاہیے... اسے زندگی سے جو چاہیے وہ یہی تو ہے اور یہ نہ ہو تو جینے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

''نہیں.... ایسا تو نہیں ہے... اصل میں شادی سے پہلے محبت ایک سپنے کی طرح ہوتی ہے اور شادی کے بعد اس سپنے کی تعبیر اور اس تعبیر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ جو محبتیں شادی کے بعد بدل جاتی ہیں یا ان میں پہلے جیسی حرارت نہیں رہتی وہ محبتیں سچی نہیں ہوتیں۔ اب دیکھو نا شاہ جہاں کا تاج محل ایک ایسی ہی محبت کی یادگار ہے جو اس نے اپنی محبوبہ کے لیے نہیں اپنی بیوی کے لیے بنوایا تھا۔''

''لیکن ارجمند پہلے اس کی محبوبہ ہی تھی بعد میں اس کی بیوی بن گئی'' صنوبر نے اس کی بات کو سیکنڈ کیا۔

''لیکن یہ ایک بادشاہ کی کہانی ہے اور ہم عام لوگ ہیں، عام لوگ... بدل جاتے ہیں۔ وہ شادی کے بعد پہلے جیسے نہیں رہتے۔''

''تمہیں لگتا ہے میں بدل سکتا ہوں؟'' صنوبر کے اندیشے کو شرجیل نے سوال میں بدل دیا۔

''نہیں.... مجھے لگتا ہے تم کبھی نہیں بدلو گے... بس تمہیں مجھ ایک وعدہ کرنا ہوگا'' صنوبر جیسے پھر ماضی میں اتر گئی۔

''کیسا وعدہ.... میں تم سے بنا جانے ہر قسم کا وعدہ کرنے کو تیار ہوں۔ بولو کیا وعدہ لینا چاہتی ہو؟''

شرجیل کا عزم اور حوصلہ دیکھ کر صنوبر کو اس پر ڈھیروں پیار آ گیا۔ وہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگی اور لمحے بھر کو اسے وہ سب کچھ بھول گیا جو وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔ اپنا وعدہ اسے شرجیل کی محبت اور محویت کے سامنے بہت ہی معمولی معلوم ہونے لگا۔ اس لیے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور وہ شرجیل کی توجہ کسی اور طرف لگانے کا سوچنے لگی۔ اسے چپ دیکھ کر شرجیل بولا۔

''کیا ہوا کیا؟ سوچنے لگیں۔ جو بھی وعدہ لینا چاہتی ہو مجھے منظور ہے اس لیے تم اپنی بات کو بدلنا مت۔ جو کہنا چاہتی تھیں ہی کہو پلیز صنوبر؟'' شرجیل جاننے کو بے چین ہو چکا تھا کہ آخر صنوبر کے دل میں کیا ہے وہ کیا وعدہ لینا چاہتی ہے وہ جانتا تھا کہ جب کوئی آپ سے وعدہ لینا چاہتا ہے۔ تو دراصل اس کا بھروسا آپ پر سے کمزور پڑ رہا ہوتا ہے اور اسی کمزوری کو وہ وعدے کی طاقت سے مضبوط بنانا چاہتا ہے اس وقت جب صنوبر نے اس سے یہ وعدے والی بات کہی تو وہ واقعی ماضی کے اس حصے میں جا پہنچی تھی جب شرجیل اسے بنا بتائے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور تین مہینے تک اس نے اس کی کوئی خبر نہیں لی تھی۔ یک لخت اسے خیال آیا کہ اگر اس وقت وہ بلا نہ ہوتا تو شاید وہ مر ہی جاتی اس بلے نے اس کی زندگی کو ایک نئی مصروفیت میں ڈال دیا تھا اور پتا نہیں اس کے ساتھ کیا کیا ہوا۔ ماما کہتی

ہیں مجھے دورے پڑا کرتے تھے۔ وہ کبھی نہیں جان سکی کہ یہ دورے کس قسم کے تھے اور اسے ہوا کیا تھا۔ سلمٰی اس کی ملازمہ نے تو اسے جنات سے بھی ملا دیا تھا بے وقوف کہیں کی... آج کے زمانے میں جنات کہاں ہوتے ہیں۔ اب تو سائنس کا دور ہے...

''کیا تمہیں جنات کے ہونے پر یقین ہے شرجیل؟'' صنوبر کے پوچھے گئے اس اچانک سوال پر شرجیل نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''میں تو یہ انتظار کر رہا تھا کہ تم جو مجھ سے وعدہ لینے والی ہو اس بارے میں سوچ رہی ہو۔ یہ تم کیا سوچنے لگیں۔ اور یہ کیسا سوال ہے۔ تمہارے ذہن میں اچانک کیوں آیا؟'' شرجیل نے کہا۔

''پہلے تم میری بات کا جواب دو پھر میں بتاؤں گی کہ یہ خیال میرے ذہن میں کیوں آیا'' صنوبر نے رسان سے کہا۔

''اور وعدہ وہ بھی.... بتاؤ گی'' شرجیل کو اس کے ذہن میں اس کے بارے میں جو بات تھی اسے جاننے میں سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔

''ہاں وہ بھی....'' صنوبر نے مختصر کہا۔

''کہتے ہیں قران مجید میں جو کچھ بھی لکھا ہوا ہے، وہ سب اس وقت تک کے لیے ہے جب تک دنیا قائم ہے اور روز آخرت نہیں آجاتا۔ اس لیے ہمیں اس بات پر ایمان رکھتے ہوئے اس بات کو بھی ماننا ہوگا کہ جنات ہوتے ہیں کیونکہ جنات کے بارے میں قران مجید میں لکھا گیا ہے اور وہ ہوتے ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے۔''

شرجیل کی بات سن کر صنوبر ایک دم ہی جیسے کسی نامعلوم فکر میں ڈوب گئی۔ وہ سوچنے لگی اس کا مطلب جنات ہوتے ہیں اور جیسا کہ شرجیل نے کہا یہ قران مجید سے ثابت ہے تو اسے ہمارے ایمان کا حصہ بھی ہونا چاہیے.... تو کیا سلمٰی صحیح کہتی ہے۔ اس کی سوچوں نے عجب دھارے پر بہنا شروع کر دیا۔

''میری بات سننے کے بعد تم اس طرح چپ کیوں ہو گئیں۔ صنوبر بولو کیا بات ہے۔ تم نے یہ سوال کیوں کیا تھا؟ کیا ہے تمہارے ذہن میں؟''

شرجیل مسلسل اس کی طرف دیکھے چلا گیا۔ صنوبر سوچ میں پڑ گئی کہ شرجیل کو سلمٰی والی بات بتائے یا نہیں۔ کیا شرجیل سے یہ بات چھپانا ٹھیک ہوگا یا اسے بتانا صحیح ہے۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے سوچتی رہی اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے شرجیل کو ساری بات بتا دینا چاہیے۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب تم یہاں نہیں تھے۔ میری حالت خراب ہوتی جا رہی تھی پھر پتا نہیں کیا ہوا میں اپنے ہوش حواس کھونے لگی۔ ماما اور پاپا کو بہت فکر ہوئی میری حالت کی وجہ سے۔ اس وقت ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں عجیب عجیب حرکتیں کیوں کرتی ہوں۔ مجھ پر ان عجیب حرکتوں کے دورے پڑا کرتے تھے اور ان دوروں میں سلمٰی بتاتی ہے۔ سلمٰی ہماری نوکرانی ہے۔ میں ایک وقت میں تین اور چار وقت کا کھانا کھا جایا کرتی تھی۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ میرے جسم میں اتنی طاقت آجاتی تھی کہ میں سلیمان اور پاپا دونوں کو دھکا دے کر گرا دیا کرتی تھی۔ میں ان دونوں کی مجموعی طاقت سے زیادہ شکتی شالی ہو جاتی تھی۔ اور پھر خود بخود نارمل بھی ہو جایا کرتی تھی۔ پاپا نے اسے کوئی نفسیاتی بیماری سمجھ کر کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ماما کا خیال تھا کہ اگر ایسا یہاں رہ کر کیا گیا اس ملک میں تو یہ بات کسی سے چھپی نہیں رہ سکے گی۔ میرا نفسیاتی علاج ہوا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اسکا سیدھا مطلب پاگل پن سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے پاپا نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھے کسی دوسرے ملک لے کر جائیں گے۔ اسی سلسلے میں وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے مشورہ بھی کر چکے تھے۔ امریکا میں ایک قابل ڈاکٹر سے اپائنٹ منٹ بھی لے لیا گیا تھا۔ تب ہی سلمٰی نے ماما سے کہا کہ یہ کوئی نفسیاتی بیماری نہیں بلکہ یہ کسی جن کا سایا ہے اور صنوبر کسی جن کے قبضے میں ہے۔ ماما تو شاید اس کی بات مان کر مجھے کسی جن اتارنے والے سائیں بابا کے پاس لے جانے

پر بھی مان گئی تھیں لیکن پاپا نے انھیں ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔ پھر جس دن مجھے امریکا جانا تھا اس سے ایک دن پہلے رات کو پتا نہیں کیا ہوا۔ صبح میں اٹھی تو بالکل نارمل ہو چکی تھی۔ میری حرکتوں کو پاپا، ماما اور سلمان نے بغور دیکھا تو مجھے ان کے رویوں پر حیرت ہوئی اور میں ان سے پوچھنے لگی کہ وہ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اور کہیں کسی اور سیارے سے آئی ہوں... اس وقت تو انھوں نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اصل میں میرے یوں یکا یک ٹھیک ہونے پر حیران ہو رہے تھے اور توقع کر رہے تھے کہ یہ بھی میری بیماری کا کوئی حصہ ہے۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے.... مجھ پر نہ تو کوئی دورہ پڑا اور نہ ہی میں نے کوئی ایب نارمل حرکت کی تو انھیں یقین آ گیا کہ میں واقعی بالکل نارمل ہو چکی ہوں۔ تب ہی مجھے ماما نے بتایا تھا ہنستے ہوئے کہ سلمٰی کا تو یہ خیال تھا کہ تم پر کسی جن نے قبضہ کر لیا ہے۔ یہ سن کر مجھے اتنی زور کا غصہ آیا کہ میں سلمٰی کی دشمن ہو گئی۔ ماما نے تو بات مذاق سمجھ کر کہی تھی مگر وہ بات میرے لیے کسی اندوہ ناک تکلیف سے کم نہیں تھی۔ یہ تصور ہی میرے لیے سوہان روح تھا کہ میں کسی جن کی قید میں رہ چکی ہوں۔ مجھے سلمٰی پر شدید غصہ تھا اس لیے سلمٰی کئی دن تک کام پر نہیں آئی پھر میں نے اسے معاف کر دیا اور سب کچھ نارمل ہو گیا۔

صنوبر جس میسمیریزم کے سے انداز میں بولتی رہی تھی۔ شرجیل کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا اسے بھی ان باتوں نے ہپناٹائز کر لیا ہو۔ وہ ایسے صنوبر کی باتیں سن رہا تھا جیسے کسی دوا کے اثر میں اس کی صرف قوت سماعت ہی بحال رہ گئی تھی باقی کے حواس خمسہ جواب دے چکے تھے۔ صنوبر کی باتیں ختم ہوئیں تو وہ خود بھی ان باتوں کے اثر سے فوری طور پر نہیں نکل سکی اور دیر تک جانے کیوں گم صم سی بیٹھی رہی۔ شرجیل کے حواس بحال ہوئے تو اس نے صنوبر کی طرف دیکھا اور بولا۔

''چلو اب گھر چلیں.... بہت دیر ہو چکی ہے'' صنوبر نے کوئی اختلاف نہیں کیا اور وہ دونوں کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

سلمان ابراہیم نے جو کچھ جاگتے ہوئے اور جو کچھ سوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اب تک ان مناظر نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ابوریحان اس امتحانی سیشن کے بعد سے اس کی ایسی غیر معمولی صلاحیتوں کے بارے میں مسلسل سوچے جا رہے تھے جن کے بارے میں انھیں خود بھی پہلے یقین نہیں تھا۔ اور یہ نظارہ انھوں نے اسی دن کمرۂ امتحان میں دیکھا تھا اس کے بعد سے وہ سلمان سے تفصیل سے ملنے کی جب بھی کوشش کرتے وہ کنی کترا جاتا تھا اور وہ اس کے اس رویے کو دیکھ کر مزید تجسس میں مبتلا ہو جاتے تھے کیونکہ سلمان ان کا بہت ہی فرمانبردار اور سعادت مند شاگرد تھا۔ جسے خود بھی ابوریحان کے پاس بیٹھنا، ان سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ پہلے جب بھی وہ مصروف ہوتے تھے تو سلمان ان سے ملنے کے لیے بار بار آیا کرتا تھا اور ان کی مصروفیت دیکھ کر واپس چلا جاتا اور پھر کچھ دیر بعد آ جاتا۔ ابوریحان کو اس باتیں کرنا خود بھی بہت اچھا لگتا ہے۔

جب کوئی سننے والا آپ کی بات کو توجہ اور دلچسپی سے سنتا ہے تو ایسے سامع سے کہنے والے کو ایک قسم کی انسیت ہو جاتی ہے اور اسے لگتا ہے کہ اس کی بات کو ٹھیک سے سننے والا ہی اس کی بات کا بہترین سمجھنے والا بھی ہے۔ یہی خیال ایک مدت تک ابوریحان کا سلمان ابراہیم کے بارے میں رہا تھا لیکن اب کچھ عرصے سے خصوصاً اس روز کمرۂ امتحان کے بعد سے سلمان کہاں رہتا تھا وہ نہیں جانتے تھے۔ ان کے بلانے پر اول تو وہ ملتا ہی نہیں تھا بل بھی جاتا تو بڑی مشکل سے آتا اور آتے ہی جانے کے بارے میں سوچنے لگتا۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ اس دن ابوریحان نے فیصلہ کر لیا کہ آج چاہے کتنی بھی دیر کیوں نہ ہو جائے وہ سلمان سے یہ بات پوچھ کر ہی رہیں گے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ سلمان کا دیر تک انتظار کرتے رہے اور جب سلمان اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے روم میٹ نے اسے سختی سے تاکید کرتے ہوئے بتایا کہ ابوریحان صاحب کا تمہارے لیے پیغام ہے کہ تم کسی بھی وقت آ کر ان سے لازمی ملو۔ اب سلمان کے پاس ابوریحان کے پاس جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

''جی استاد محترم کہیے آپ نے مجھے بلوایا تھا؟'' سلمان نے پہلے سلام کیا اور اس کے فوراً بعد یہ بات کہی۔
جواب میں ابوریحان نے گمبھیرتا سے اس کے سلام کا جواب دیا اور اس کی طرف گہری گہری آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ دیر تک دیکھنے کے بعد وہ بولے۔
''ایسا کیا ہے جو تم ہمیں بتانا نہیں چاہتے؟'' ابوریحان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''ایسا کیا ہے جو آپ مجھ سے پوچھنا چاہتے ہیں'' جانے کس خیال میں سلمان کے منہ سے نکل گیا۔ ابوریحان اس کی یہ بات سن کر کچھ شرمندہ سے اور کچھ ناراض سے ہو گئے۔ وہ سوچنے لگے کہ ویسے یہ لڑکا ٹھیک ہی کہہ رہا ہے میں اس سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اسے غیبی علم پر کتنی دسترس ہے اور یہ ہنر اس میں کیسے آیا۔ جب سے سلمان نے وہ مشکل اور ناقابل یقین سوالات حل کیے تھے تب سے ہی ابوریحان کو اس کے بارے میں تجسس نے گھیرا ہوا تھا۔ اسی دن سے سلمان ان سے کچھ الگ الگ بھی رہنے لگا تھا انھیں اس وقت سلمان کا جواب پسند تو نہیں آیا مگر وہ اپنے دل میں ہونے والی کھد بد کی وجہ سے مجبور تھے اس لیے کسی قسم کی سختی یا رویے کی درشتی کو انھوں نے اپنے لہجے میں آنے نہیں دیا اور اسی نرمی سے بولے۔
''تم ہم سے دور ہوتے جا رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے ہم ہمیشہ سے تمہارے حق میں اچھا ہی سوچتے رہے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اب تمہارا التفات پہلے جیسے نہیں رہا؟''
''نہیں استاد محترم ایسامت سوچیے میں آپ سے الگ نہیں ہوں۔ اور نہ ہی آپ سے دور ہونے کی کوئی بات میرے دل میں ہے۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے تنہا رہنے کی طرف طبیعت مائل ہے اور کوئی چیز ہے جو مجھے وہ بات کہنے سے بھی روک رہی ہے جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ میں خود کو اپنے اندر سے مجبور محسوس کرتا ہوں۔''
سلمان نے اس طرح کہا جیسے وہ سوچ کچھ اور رہا ہے اور بول کچھ اور رہا ہے۔ اس کے چہرے کے بدلتے خدوخال سے انھوں نے یہ اندازہ تو ضرور لگا لیا کہ اس کی کیفیت واقعی کچھ اجنبی سی ہے اور یہ حالت اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ وہ کسی روحانی تجربے سے گزر رہا ہے۔ اتنا وہ بھی جانتے تھے کہ روحانی تجربہ جب تک مکمل نہیں ہو جاتا تب تک انسان کی کیفیت ایسی ہی رہتی ہے اس کا کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا اور دنیا سے دل اچاٹ ہونے لگتا ہے۔ انھوں نے سلمان کی بات پر کامل یقین کر لیا اور اِدھر اُدھر کی دوسری باتوں کے ساتھ اس سے اپنے تعلق کی تجدید کرنے لگے۔
''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ایسا لگتا ہے تم بہت جلد کسی ایسے مقام پر فائز ہونے والے ہو جس کے لیے کسی بھی انسان کو بڑی طویل ریاضتیں اور عبادتیں کرنا پڑتی ہیں اور تمہارے معاملے میں قدرت کچھ اور ہی طرح سے پیش آ رہی ہے وہ تمہیں بنا کسی سخت مجاہدے کے وہ سب دینے کا ارادہ رکھتی ہے جس کی آرزو ہر انسان کرتا ہے۔ کیا پڑھائی میں بھی دل نہیں لگتا؟'' اپنی گفتگو کے آخر میں انھوں نے پوچھا۔
''پڑھائی میں دل اس لیے نہیں لگتا کہ کوئی بھی استاد جو کچھ بھی پڑھا رہا ہوتا ہے مجھے وہ سب پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے مجھ پر یہاں اس مدرسے کی تعلیم روشن ہو چکی ہے۔ میں وہ سب کچھ جان چکا ہوں جو یہاں پڑھایا جاتا ہے یا پڑھایا جانے والا ہے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد میری منزل کہاں ہے مجھے کہاں جانا ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ مجھے اس کے بعد تعلیم کے حصول کے لیے کس راستے کا سفر کرنا ہے۔ میرے پاس رہنے اور قیام کرنے کی کوئی اور جگہ ہوتی تو میں اب تک یہاں سے چلا گیا ہوتا۔''
اتنا کہہ کر سلمان خاموش ہو گیا اور ابوریحان اسے حیرت سے دیکھنے لگے یعنی اس انیس بیس سال کے لڑکے کو مدرسے کی تعلیم کے سارے رموز اور ابواب پہلے سے سکھا دیے گئے ہیں۔ واہ کیا قسمت ہے اس لڑکے کی وہ خود ایک طویل مدت سے جو کچھ نہیں جان سکے اس لڑکے کو قدرت نے اتنی جلدی سب کچھ بتا دیا ہے۔ خدا کہتا ہے، ہم

جو اور جتنا علم جسے چاہیں دینے پر قادر ہیں اور کوئی ایسا نہیں ہے جو خدا کے دیے ہوئے علم سے زیادہ جان لینے پر قادر ہو۔ انھوں نے سلمان کو بڑے پر جوش انداز سے گلے سے لگا لیا اور بولے۔

''ہم سے ایک وعدہ کرو۔''

''کیسا وعدہ؟'' سلمان کے لہجے میں کوئی شدید تاثر نہیں تھا۔

''یہی کہ جب تمہارا روحانی علم پورا ہو جائے تو تم ہمیں بھولو گے نہیں اور ہمیشہ ہم سے ملتے رہو گے۔'' ابو ریحان نے خلوص سے کہا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں استاد محترم میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گا اور ہمیشہ آپ سے ملنے کی کوشش برابر جاری رکھوں گا'' سلمان کو یہ وعدہ کرنے میں ذرا سی بھی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ وہ تو خود یہی چاہتا تھا۔ ابو ریحان ہمیشہ کسی بھی مشکل میں اس کے کام آئے تھے۔ اور انھوں نے اسے ہمیشہ دوسرے طالب علموں سے زیادہ اہمیت دی تھی جس شفقت سے وہ اس کے ساتھ شروع دن سے پیش آتے رہے تھے اس کے بدلے وہ ساری زندگی بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کو تیار تھا۔ یہ بات سلمان نے دانستہ ان سے جھوٹ کہی تھی کہ اس کی یہ کیفیت کسی روحانی علم کی پگڈنڈی پر چلنے کی وجہ سے تھی یہ تو عشق کا وہ زہر تھا جس نے اس کے سارے وجود کو زہریلا بنا دیا تھا اور ناکامی نے اس سے جینے کی امنگ تک چھین لی تھی اسے جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ صنوبر کسی اور سے محبت کرتی ہے اس کا جینے کا من نہیں کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی دنیا اجڑ چکی ہے اور اب اس کا دنیا میں جینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جس محبت کے لیے اس کے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ اب اس کی نہیں کسی اور کی تھی اس سے بھی زیادہ اذیت ناک بات یہ تھی کہ وہ اپنے کانوں سے سن چکا تھا کہ صنوبر شرجیل کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی یعنی کسی وجہ سے اگر شرجیل اس کی زندگی میں نہ رہا تو وہ جیتے جی مر جائے گی۔ اس خیال نے سلمان کو اتنا زیادہ پژمردہ بنا دیا تھا کہ اسے اپنی سانسیں بھی بار لگنے لگی تھیں۔ اگر اس دن وہ نورانی بزرگ اسے بچا نہ لیتے تو وہ اپنی زندگی ختم کر دینے کے درپہ تھا۔ اب وہ رات و دن بس یہی سوچتا رہتا تھا کہ اسے بزرگ محترم نے کیوں مرنے نہیں دیا۔ قدرت اس سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔ کیا صنوبر سے الگ رہ کر بھی اس کے جینے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ اس کی اس حالت کو ابو ریحان کسی روحانی علم کا ردعمل سمجھ رہے تھے۔ یقیناً ایسا تھا کہ مدرسے کا علم سلمان کے لیے بے معنی ہو چکا تھا۔ اور اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اسے پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی لیکن یہ بات تو اب تک اس نے سوچی بھی نہیں تھی کہ اسے پہلے سے پہلے سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔ اس دن بھی کمرۂ امتحان میں اس نے سارے سوالوں کے جواب ٹھیک ٹھیک دیے ایسے سوالوں کے جواب بھی جو اس نے پڑھے ہی نہیں تھے یا اس کے درجے کے لوگوں کو پڑھائے ہی نہیں گئے تھے اور نگراں کے دل میں پیدا ہونے والی بے ایمانی کی وجہ سے جو اسے ہر حال میں ناکام بنانا چاہتا تھا۔ اساتذہ نے ایسے سوالات بھی کیے تھے جو کسی ایسے طالب علم کو جس درجے میں سلمان تھا پڑھائے نہیں گئے تھے۔ پھر بھی نگراں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس لڑکے کو ان سوالوں کے جواب بھی معلوم ہیں جو اسے سکھائے نہیں گئے تھے۔ ہر طرح سے یہ ایک روحانی تجلی کا کرشمہ تھا اور اس پر قدرت نے ایسا کچھ کھول دیا تھا جو دوسروں پر بند تھا۔

ابو ریحان بھی اس کی اس گراں بہا صلاحیت کو دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے اور تب سے ہی وہ سلمان سے اس موضوع پر بات کرنے کو بے چین تھے۔ اتنا سب ہوا سلمان سرخرو ہو کر کمرۂ امتحان سے نکلا اس کے باوجود خود اسے اس بات کا کوئی کشف نہیں تھا کہ اس نے ایسے سوالوں کے جواب بھی دیے ہیں جو اسے آتے ہی نہ تھے۔ سمجھو تو ایسی کسی بھی بات پر حیران ہونے کے لیے اس کے شعور کا ادراک لازمی تھا اور وہ وپنے ہوش و حواس گنوا چکا تھا۔ اسے خود سے بیگانہ بنانے میں اس کے عشق کی ناکامی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ یہ بات اب بھی وہ چاہتے ہوئے ابو ریحان کو نہیں بتا سکا۔

ابوریحان اس سے پوچھنا چاہتے تھے کہ کشف کے اس تجربے کے وقت اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے وہ کیا محسوس کرتا ہے لیکن افسوس کہ ابوریحان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی کیونکہ سلمان کچھ بھی بتانے کی شعوری حالت میں نہیں تھا۔ پھر بھی ایک نامعلوم سی حسد یا رشک ابوریحان کو بے چین کیے ہوئے تھی۔ ایک کل کا لونڈا ان کے سامنے ان سے آگے نکل چکا تھا اور انھیں ان کی تپسیاؤں اور ریاضتوں کا ایسا صلہ اب تک نہیں ملا تھا جس کے وہ متلاشی تھے۔ ان کی جاگی ہوئی راتوں نے انھیں اب بھی اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ ایسا کیوں تھا اس بات کا انھیں اپنے اندر سے ایک ہی جواب ملتا تھا کہ خدا بے نیاز ہے۔ وہ کسے کب کیا دینے والا ہے کوئی انہیں جانتا اور کوئی نہیں جو اس کے کام میں دخل دینے والا ہو۔ کوئی نہیں جو اسے اس کے ارادے سے روک سکتا ہو۔ لیکن یہ کیفیت بڑی عجیب ہے کہ ایک انسان پر سارے جہاں کے رازوں کو کھول دیا گیا ہو اور اسے اس کی پرواہ ہو نہ شعور.....

''یہ بتاؤ تمہارا کسی سے رابطہ ہے؟'' کافی دل کڑا کر کے ابوریحان نے پوچھ ہی لیا۔ وہ خود کو روک نہیں پائے۔ جواب میں سلمان کھلی آنکھوں سے انھیں ایسے دیکھے چلا گیا جن میں صدیوں کی اداسی ہلکورے لے رہی تھی۔ ابوریحان شرمندہ ہونے لگے کیونکہ سلمان کی حالت ایسی تھی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پا رہا۔ اسی وقت ان کے حجرے میں نگراں داخل ہوا تو ابوریحان کو اچنبھا ہوا۔ ورنہ نگراں اپنے کروفر کا بڑا خیال رکھتا تھا اور ہمیشہ سارے ہی اساتذہ کو دفتر میں طلب کیا کرتا تھا۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے دفتر کے نظام الاوقات کو بھی بالائے طاق رکھ دیا کرتا تھا لیکن یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ ابوریحان کے پاس خود چل کر آیا تھا۔

ابوریحان اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت دوچند ہوگئی کہ سلمان بدستور اپنی مسند پر اسی طرح بیٹھا رہا جیسے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو۔ نگراں نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور ابوریحان سے بولا۔

''میں اکیلے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں'' یہ سن کر بھی سلمان کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور وہ اسی طرح ایک ٹک سامنے کی دیوار کو دیکھے جا رہا تھا۔ ابوریحان سمجھ گئے کہ سلمان کس کیفیت میں ہے۔ اسے خبر ہی نہیں ہے کہ اس کے گردوپیش میں کیا ہو رہا ہے۔ کون آیا ہے اور کون اس کی موجودگی سے برگشتہ ہے۔ اسے تو جیسے کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ ابوریحان نے معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے نگراں کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ نگراں کا غصہ مسلسل بڑھ رہا تھا اسے سلمان کا اسے دیکھ کر اپنی نشست پر بیٹھے رہنا اپنی توہین معلوم ہوا تھا اور اس کی قوت برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ ابوریحان نے ان کو اشارے سے سمجھایا کہ میں آپ کو بتاتا ہوں.....

ابوریحان نے سلمان کو واپس شعور کی دنیا میں لانے کے لیے اسے جھنجوڑ ہی ڈالا اور اسے جانے کو کہا۔ سلمان جیسے ہی ہوش و حواس میں واپس آیا اس نے اپنے سامنے نگراں کو دیکھا اور وہ جیسے ایک دم ہی بوکھلا سا گیا تاہم اسے نگراں کو سلام کرنا پھر بھی یاد رہا۔ نگراں اتنی سی دیر میں اس قدر ناراض ہو چکا تھا کہ اس نے سلمان کے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ابوریحان نے سلمان کو بھیج تو دیا لیکن اب انھیں نگراں کا سامنا کرنا تھا اور سلمان کی یہ گستاخی اسے مدرسے سے بے دخل کرانے کے لیے کافی تھی ابوریحان سوچ رہے تھے کہ سلمان کو کیسے نگراں کے قہر سے بچائیں!

☆☆☆

صنوبر جب سے اسکول سے آئی تھی چپ سی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایسا کیا ہوا ہے۔ شرجیل نے اس کی روداد سن کر کوئی ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے خاموش رہنا کیوں ضروری سمجھا اور جب اس کی بات ختم ہوئی تو وہ ایسے ہی چپ چاپ اٹھا اور گھر جانے کو کھڑا ہوگیا۔ راستے میں بھی اس نے کوئی بات نہیں کی۔ کیا شرجیل اس کی کسی بات سے ناراض ہو چکا ہے یا اس کے دل میں کسی ایسے خیال نے جگہ بنالی ہے کہ اس پر کسی جن کا سایا ہے۔ کیا شرجیل کو اس بات کا یقین آچکا ہے؟ اس قسم کی باتیں وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔ اسے شرجیل کے رویے نے بڑی الجھن میں ڈال دیا تھا اسی وجہ سے اس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا در شہوار اس کی حالت دیکھ کر یہ ضرور سمجھ چکی تھی کہ کوئی ایسی بات ہے جو صنوبر کو پریشان کیے ہوئے ہے مگر وہ صنوبر کی حالت دیکھنے کے بعد اس سے کچھ پوچھنے

کی ہمت نہیں جتا پائی۔

صنوبر اپنے کمرے میں آگئی اور اس نے شرجیل کو فون لگایا لیکن شرجیل کا فون آف تھا اب صنوبر کو اور بھی زیادہ پریشانی ہونے لگی کہ شرجیل آخر کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے اپنا فون کیوں بند کیا ہوا ہے؟ کوئی تو بات ہے... یہ سوچ کر صنوبر کو اور بھی بے چینی ہونے لگی۔ وہ جلد سے جلد جان لینا چاہتی تھی کہ شرجیل کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ کیا اس بات کے لیے وہ اسے پھر سے چھوڑ سکتا ہے؟ وہ سوچتی رہی اور پتا نہیں کب اس کا ذہن تھک گیا اسے نیند نے آلیا اور وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس کا موبائل بج رہا تھا۔ دوسری طرف شرجیل ہی تھا۔

ہیلو بولنے کے بعد اور اسکرین پر شرجیل کا نام دیکھنے کے بعد صنوبر فوراً ہی ہوش وحواس میں آچکی تھی۔

''تم میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔ کیا بات ہے؟'' صنوبر کا لہجہ اسی طرح کا تھا جیسے ہمیشہ ہوتا تھا۔ وہ شرجیل کے کسی بھی ردعمل سے پہلے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہنا چاہتی تھی کہ اسے شرجیل کے رویے سے کوئی پریشانی ہے۔

''میں آتے ہی سو گیا تھا'' شرجیل نے مختصر کہا۔

''لیکن تم ایسا تو کبھی نہیں کرتے۔'' صنوبر نے کہا

''ٹھیک کہتی ہو مجھے خود نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوا لیکن جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے اتنی زور کی نیند کا جھونکا آیا کہ میں نے کپڑے اور جوتے بھی نہیں تبدیل کیے اور میں بیڈ پر لیٹ کر سو گیا۔'' شرجیل کی باتوں سے عجیب قسم کا تاثر بن رہا تھا۔ یہ کوئی نارمل سچویشن نہیں تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اب کیا کہے۔

''کیا تم پریشان ہو؟'' شرجیل نے پوچھا۔

''کس لیے؟'' وہ دانستہ انجان بن گئی۔

''اسی لیے کہ میں نے تمہارے فون کو جواب جو نہیں دیا تھا'' شرجیل جیسے پوری طرح نارمل ہو چکا تھا۔

''ہاں میں تھوڑا سا فکر مند ہو گئی تھی کیونکہ تم ایسا کبھی نہیں کرتے۔'' صنوبر اب بھی اپنے دل میں اٹھنے والی اس بات کو اپنے منہ سے نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی روداد سن کر اس نے کوئی بات نہیں کی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا کیوں۔ وہ اسی کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

''صحیح کہتی ہو۔ میں خود سوچ رہا ہوں کہ میں اس قدر تھکن کیوں محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگتا ہے تم نے جو اپنی سرگزشت سنائی تھی اسے سن کر میں یکایک بہت تھک سا گیا تھا۔ سارے راستے میں تم سے کوئی بات نہیں کر سکا۔ کرنا چاہتا تھا لیکن تھکن نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔ اور جب گھر آیا تو نیند کا حملہ... یہ سب کچھ میرے لیے بھی بہت اچنبھی ہے۔''

شرجیل نے جو کچھ کہا اس نے صنوبر کو نئے سرے سے پریشان کر دیا تھا۔ اس کی کہانی سننے سے شرجیل کا تھک جانا اور اتنا زیادہ تھک جانا کہ اس کو کوئی بات تک کرنے کی ہمت بھی اس میں باقی نہ رہی ہو، اور پھر اس طرح سو جانا کہ خود پر اس کا کوئی اختیار نہ رہا ہو۔ یہ سب تو بڑی انہونی باتیں ہیں۔ کیا شرجیل واقعی سچ بول رہا ہے۔ وہ جھوٹ کیوں بولے گا۔ اس نے سوچا اور شرجیل کی ساری بات پر اسے فوراً ہی یقین آگیا۔ وہ اب بھی شرجیل کی طرف یہ سننے کی منتظر تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس پر گزرنے والے حالات کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے؟

''کیا ہوا تم ایک دم چپ کیوں ہو گئیں؟'' شرجیل نے کہا۔

''نہیں... میں تمہاری باتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کہ یہ سب کس قدر ناقابل یقین ہے''

''ہاں لیکن جو کچھ تم نے بتایا تھا اس سے زیادہ ناقابل یقین نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے تمہاری ساری باتیں کوئی الف لیلہ کی سو داستان معلوم ہو رہی تھیں۔ اب دیکھو نا تم میری ذرا سی روٹین ڈسٹرب ہونے پر یقین اور بے یقینی کے بیچ جھول رہی ہو۔ تم مسلسل یہ سوچ رہی ہو کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی انسان خود پر سے اپنا اختیار کیسے لوز کر سکتا ہے۔ تمہیں یقین نہیں آ رہا۔ جبکہ تمہاری تو پوری کہانی ہی اتنی زیادہ عجیب وغریب ہے کہ کوئی بھی اس پر

آسانی سے یقین نہیں کر سکتا۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو خود تمہیں بھی ان باتوں پر پورا یقین نہیں ہے۔ کیونکہ جن بھوتوں پر تمہارا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس دور کے انسان کا اعتبار ہو بھی نہیں سکتا۔ ان پر یقین کرنے کے بس دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید میں آیا ہے اس لیے ہمیں ان پر ایمان لانا ہی ہوگا اور دوسرا یہ کہ کوئی خود اس راستے سے گزرا ہوا ہو۔ بدقسمتی سے تم گزری ہو لیکن تمہیں شعوری طور پر اس کا کوئی ادراک نہیں ہے۔ تمہیں تمہاری ماما اور نوکرانی نے بتایا ہے۔ اسی لیے تم یقین اور بے یقینی میں گھری ہوئی ہو۔ مگر آج جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے مجھے اس کا شعوری ادراک ہے اس لیے مجھے اس بات پر یقین ہے کہ ایسا ہوا ہے، ایسا ہو سکتا ہے۔'' شرجیل کی باتوں نے اسے مزید الجھا دیا۔

''پتا نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ تم مجھے اور بھی الجھا رہے ہو۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ آج جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا یہ کسی جن کی کارستانی ہے؟'' صنوبر جھنجلانے لگی تھی۔

''نہیں میں ایسا نہیں کہہ رہا اور کہہ بھی نہیں سکتا کیونکہ ہم اس دور کے لوگ ہیں ہمیں جنوں بھوتوں کی بے سروپا باتوں پر یقین کرنا بھی نہیں چاہیے مگر میں یہ مانتا ہوں کہ دنیا میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے۔ جو عجیب ہے، جس پر مشکل سے یقین آتا ہے اور یہ کسی کے بھی ساتھ ہو سکتا ہے۔''

''یعنی تمہارا مطلب ہے کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس پر تمہیں یہ یقین ہے کہ وہ کسی جن ون کی وجہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ وہ جسٹ ایک عجیب واقعہ تھا''

''ہاں.... اور اس کی وجہ اس وقت کے وہ حالات تھے جن سے تم گزر رہی تھیں، تمہیں میری بے وفائی نے توڑ کے رکھا ہوا تھا۔ اور تم ایسی کسی وجہ سے اپنے نروس سسٹم کو لوز کر چکی تھیں جس سے تمہاری یہ حالت ہوئی اور تمہاری نوکرانی نے اسے جن کا سایا سمجھ لیا۔ البتہ تمہارے پاپا کا خیال ٹھیک تھا وہ کوئی فوری طور پر پیدا ہونے والی نفسیاتی پرابلم بھی اور اسے اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔'' شرجیل کی بات ختم ہوئی تو صنوبر نے سکون کا ایک طویل سانس لیا کہ شرجیل نے بھی اسی طرح سے سوچا ہے جیسے وہ سوچتی ہے۔

''اس کا مطلب ہے میں نے تمہیں جو کہانی سنائی تھی وہ چونکہ میری حقیقی کہانی تھی مجھ پر گزری ہوئی تو تمہارے اعصاب نے کام کرنے سے کچھ دیر کے لیے انکار کر دیا اور تم اس قسم کی کیفیت کا شکار ہو گئے اب اگر کوئی کم علم انسان یہ سب سنے گا تو وہ اسے کسی جناتی سائے وغیرہ سے تعبیر کرے گا۔ جو درست نہیں ہے۔'' صنوبر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

شرجیل کو اس کا خوش اور مطمئن ہونا اچھا لگا۔ مگر اس کا ذہن مسلسل یہ سوچے جا رہا تھا کہ اپنے ایمان کی رو سے ہم جنات کی موجودگی سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایک زمانے میں جب حضرت سلیمان کو اللہ کی طرف یہ بتایا گیا کہ ایسی خبیث ارواح جو اب تک پردہ غیب میں تھیں اب انھیں آزاد کیا جا رہا ہے۔ اور آزاد ہونے کے بعد وہ انسانوں کی دشمن بن جائیں گی اس لیے ان کے شر سے صرف وہ ہی محفوظ رہ سکے گا جو کامل ایمان والا ہوگا۔ ایسا شرجیل نے ایک فلم میں دیکھا تھا۔ جس کا مطلب ہے ایسے مخلوقات کا وجود ہے اور وہ آزاد بھی ہیں اور ان سے ایسے انسان متاثر بھی ہوتے ہیں جن کے ایمان کمزور ہوتے ہیں۔ تو کیا صنوبر پر واقعی کسی جن کا سایا ہے؟''

یہ سوچ کر اس کے رگ و پے میں ایک خوف، ایک سناٹا سا تیرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں اے سی چل رہا ہے اس کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینہ آ چکا ہے۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا وہ صنوبر کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنسنے والا ہے؟

☆......☆......☆

''اس لڑکے کے ساتھ آپ کے تعلقات اوروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہیں پوچھ سکتا ہوں کیوں؟'' نگراں نے لہجے کو مزید بھاری بناتے ہوئے کہا۔

''جی آپ نے درست کہا نگران اعظم لیکن یہ تو عام اور فطری بات ہے۔ سب ہی اساتذہ اپنے ذہین طالب

علموں سے خود کو قریب محسوس کرتے ہیں'' ابوریحان نے پوری طرح سنبھل کر جواب دیا۔
''لیکن کیا آپ نے نہیں دیکھا اس دن کے بعد سے اس کے رویے میں ایک نظر آنے والا تکبر آ چکا ہے۔ وہ نہ صرف دیگر طالب علموں سے میل ملاقات نہیں رکھتا۔ خود کو ان سے الگ تھلگ رکھتا ہے بلکہ آج تو اس نے حد ہی کر دی مجھے دیکھ کر بھی وہ اپنی نشست پر جما بیٹھا رہا!! کیا یہ حد ادب کی خلاف ورزی اور قابل سزا جرم نہیں ہے؟''
''میں مانتا ہوں ایسا ہوا۔ لیکن یہ بالکل ایسا نہیں ہے جیسا نظر آتا ہے'' ابوریحان نے اطمینان سے جواب دیا۔
''آپ اس کی حمایت میں اس حد تک اندھے ہو چکے ہیں کہ ایک قطعی سامنے کی کھلی سی بات کو بھی کوئی اور رنگ دے کر اس کی بے جا طرف داری کرنے پر جتے ہوئے ہیں۔ میں تو آپ سے اس کی یہ شکایت کرنے آیا تھا کہ اس کا رویہ مدرسے کے باقی طالب علموں کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ وہ ان سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا، انھیں دھتکارتا ہے اس لیے میں اس کا کوئی علاج کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہاں آ کر کیا دیکھتا ہوں آپ اس متکبر لڑکے کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کی گستاخی کو جو اس نے ابھی آپ کے سامنے کی مسلسل سپورٹ کر رہے ہیں۔ میں آپ کی اس بات کو کیا سمجھوں؟'' نگراں کی آواز میں غصہ اور جلال در آیا تھا جس کی وجہ سے وہ قریباً چیخنے لگا تھا۔
''بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو نظر آتی ہیں وہ نہیں ہوتیں۔ شاید آپ نہیں جانتے جس دن سے اس نے وہ مشکل امتحان پاس کیا ہے لڑکوں نے اس کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ وہ اسے کوئی جادوگر سمجھنے لگے ہیں جسے آنے والے وقت کی باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے یہ علم سیکھنا چاہتے ہیں اس لیے اسے تنگ کرتے ہیں۔ اور وہ اگر اس کے ردعمل میں، ان سے دور رہتا ہے یا ٹھیک سے ان سے بات نہیں کرتا تو میں سمجھتا ہوں یہ ردعمل عین فطری ہے۔ نگران اعظم'' ابوریحان نے اب بھی کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح نگراں کی سمجھ میں ان کی بات آ جائے۔
''تو آپ اس کو مدرسے سے بے دخل کرنے میں میرا ساتھ نہیں دیں گے؟'' نگراں حتمی طور پر اپنے مقصد پر آ گیا۔ ابوریحان نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے نگراں نے پھر کہا۔
''اس لڑکے کی وجہ سے مدرسے کا نظم و ضبط برباد ہو رہا ہے۔ طلباء میں بے چینی پھیل رہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں اسے مدرسے سے نکال دیا جائے۔ آپ اس سلسلے میں میرا ساتھ دیں گے یا نہیں! مجھے آپ کا صاف اور کھرا جواب چاہیے۔'' نگراں نے اپنی بات کہہ کر ابوریحان کی طرف ایسے دیکھا جیسے اگر انھوں نے انکار کیا تو انھیں بھی نتیجے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔
''اگر میں نہ کہوں تو؟'' ابوریحان نے کافی سوچنے کے بعد کہا۔
''تو پھر یہ معاملہ مجلس عاملہ کے سپرد کر دیا جائے گا اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں مجلس اس قسم کے معاملات میں کس قسم کے فیصلے دیا کرتی ہے'' نگراں کی بات سن کر ابوریحان اس کے عین سامنے آ کے کھڑے ہو گئے اور بولے۔
''ایسا مت کیجیے۔ ہو سکتا ہے آپ کو اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے''
''کیا آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟'' وہ چیخا۔
''نہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں''
''میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتا۔ اس لڑکے نے میرا سکون برباد کر دیا ہے اور میں اس کے ہاتھوں ہمیشہ اپنی بے عزتی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسے جانا ہی ہوگا۔ چاہے آپ میرا ساتھ دیں یا نہ دیں، میں اسے اب مزید برداشت نہیں کر سکتا۔'' نگراں یہ کہہ کر دروازے کی طرف جانے کے لیے بڑھ گیا۔
''جیسے آپ کی مرضی'' ابوریحان نے دھیرے سے کہا اور نگراں پھنکارتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔
(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ فروری میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے منسلک ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو حط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیز و! اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ ربیع الاول کا برکتوں والا ماہ ہمارے درمیان ہے۔ آقا کی ولادت باسعادت دنیا کے تمام انسانوں کے لیے خوش نصیبی کا پیغام ہے۔ دنیا میں موجود تمام آسائشیں اور خوشیاں آپ کی ہی مرہون منت ہیں۔ لہٰذا اپنے آقا کے قدموں کی پیروی کرتے ہوئے ہمیں تمام انسانوں سے محبت کرنی چاہیے اور جس کو ہماری مدد کی ضرورت ہے مدد کرنی چاہیے۔ بس دنیا سے جانے کے بعد یہی وہ عمل ہے جو کام آئے گا باقی سب اسی دنیا میں دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ صرف ایک دن یا ایک ماہ اپنے پیارے آقا کو یاد کرنا درست نہیں بلکہ ہر دن، ہر لمحے اُن کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ میں اپنے تمام بچوں سے گذارش کروں گا کہ اپنے دل نرم رکھیں کہ یہ مومن کی نشانی ہے۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں، اللہ کو دل سے یاد کریں۔ میں ان تمام لوگوں کے لیے دعا گو ہوں جو دنیا سے رخصت ہوئے۔ خاص طور سے آرمی پبلک اسکول کے ننھے شہداء کے لیے...... ان کے لواحقین کا صبر ہم سب کے لیے ایک مثال ہے۔ اللہ تمام ماؤں کے کلیجے ٹھنڈے رکھے۔ نماز ہرگز ترک نہ کریں اور درود شریف بہت پڑھیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

□ نیلم حسین۔ لاہور

○ بابا جی اللہ آپ کو اچھا رکھے اور آپ یونہی ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہیں۔ مجھے میری ایک جاننے والی نے آپ کے بارے میں بتایا پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ اس دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو اپنا آپ ظاہر کیے بنا کسی کی مدد کر دیں۔ یہاں تو لوگ مدد کم کرتے ہیں دکھاوا زیادہ کرتے ہیں۔ تماشا زیادہ لگاتے ہیں۔ بابا جی میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ تمام مسائل اور پریشانیاں وہی ہیں جو ہم جیسی عورتوں کی ہوتی ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں میں تعلیم یافتہ ہوں مگر معمولی سی نوکری کرنے پر مجبور ہوں۔ ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ کیونکہ ہم جیسی خواتین کے لیے اسکول کی نوکری سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ مگر بابا جی مسائل بہت ہیں اور تنخواہ برائے نام۔ کیا کروں، کہاں سے کروں سمجھ نہیں آتا۔ آپ سے دعا کی گذارش ہے کہ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ میرے لیے دعا کریں۔ رب العزت میری مشکلات کم کردے یا کم از کم اس سال لاہور میں سردی کم پڑے۔ بابا جی گرم کپڑے خریدنے کی حیثیت نہیں اور بچوں کو بھی اس موسم میں بہت بھوک لگتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کاش میرے بچے بھی پشاور آرمی پبلک اسکول میں پڑھتے تو کم از کم شہید تو ہوجاتے اور مجھے بھی سکون ملتا کہ جنت میں جو چاہتے ہوں گے مل رہا ہوگا۔ آپ مجھ سے اس بات پر ناراض مت ہوئیے گا مگر بابا جی میں اس وقت بھی رو رہی ہوں۔ یہ ربیع الاول کا بابرکت ماہ ہے آپ میرے اور میرے بچوں کے لیے دعا کریں کہ اللہ ہم پر بھی رحم فرمادے۔ میں ہاتھ نہیں پھیلا سکتی مگر بہت مجبور ہو کر آپ سے مدد مانگ رہی ہوں کیونکہ آپ عزت نفس کچلے بغیر امداد کرتے ہیں۔ جو آپ تک پہنچتا ہے آپ اسی کی مدد کرتے ہیں۔ میری بھی کردیں میں اور میرے بچے تا حیات آپ کو دعائیں دیں گے۔ بابا جی دو مہینے سے بچوں کی اسکول کی فیس بھی نہیں دی۔ گھر کا

کرایہ بھی نہیں دیا کہاں سے ہوگا یہ سب؟؟ بہت پریشان ہوں اوپر سے شدید سردی...... بابا جی مجھ پر اللہ رحم کردے پلیز آپ دعا کریں۔ اپنا نمبر آپ کو دے رہی ہوں پلیز کسی کو مت دیجیے گا۔

☆ بیٹی نیلم! ہمت سے کام لو، میں موسم کی سختی تو دور نہیں کرسکتا مگر یہ دعا ضرور کروں گا کہ لوگوں کے دلوں کی سختی دور ہو۔ چند ہی نیک لوگ ہیں جو پابندی سے کچھ گھرانوں کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہیں۔ میں تمہارے لیے انہی سے گذارش کروں گا کہ کچھ کریں۔ بیٹی الحمد شریف اور سورۃ یسین بہت پڑھا کرو۔ بھوک تم کو لگے گی اور رفتہ رفتہ مرجائے گی۔ باقی جو میں کرسکا، کروں گا۔ تم جانتی ہو میں بہت بوڑھا شخص ہوں۔ کہیں آتا جاتا بھی نہیں ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ جو ممکن ہو ضرورت مندوں میں تقسیم کردوں تم اطمینان رکھو۔ امداد کرنے والے مجھے رقوم ارسال کرتے ہیں۔ انہیں کسی کے نمبر یا پتے کی چاہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا تمہارا نمبر محفوظ ہے۔ جیسے ہی کچھ بندوبست ہوا تمہیں اطلاع دے دی جائے گی۔ بس بیٹی نماز مت ترک کرنا اور کبھی بچوں کے بارے میں الٹا سیدھا مت سوچنا۔

□ گل جان۔ حیدرآباد

☆ بیٹی گل! تمہارے بھائیوں کو اللہ عقل سلیم عطا فرمائے۔ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ جو رویہ انہوں نے بہن کے ساتھ روا رکھا ہے کل کوئی اور اُن کی اولاد کے ساتھ بھی رکھ سکتا ہے بہرحال تم مایوس مت ہو ورد جاری رکھو۔ میں ماہ ربیع الاول کے بابرکت ماہ میں تمہارے لیے خصوصی دعا کروں گا، انشاءاللہ کرم ہوگا۔

□ زیڈ۔ کوئٹہ

o بابا جی! میں آپ کے توسط سے اس نیک انسان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو میری پابندی سے امداد کرتے ہیں۔ میں صرف دعا ہی دے سکتی ہوں کہ اللہ انہیں مزید توفیق دے اور دنیا کی ساری خوشیاں دکھائے۔ وہ اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھیں۔

☆ بیٹی اللہ تمہاری مشکلات کم کرے۔ یقیناً سردی کے اس شدید موسم میں اپنی چھت بہت ضروری ہے جہاں تم بچوں کو لے کر بیٹھ سکو۔ مجھے مطلع کرو کہ کرایہ کتنا ہے۔ میں دعا کروں گا کہ اللہ تمہاری یہ مشکل جلد از جلد حل فرمائے اور کچھ بندوبست ماہانہ بنیادوں پر ہوجائے۔ بیٹی الحمد شریف پڑھتی رہو۔ نماز مت قضا ہونے دینا خیر ہوگی۔

□ ریحان علی۔ لاڑکانہ

o بابا سائیں! کچھ عرصہ قبل آپ کا کالم پڑھنا شروع کیا تو کچھ امید بندھی کہ شاید اب میری مصیبت بھی کم ہوگی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سے نوکری کی تلاش میں ہوں۔ چار بہنوں کا بھائی ہوں۔ بوڑھے والدین یہ سوچ کر خوش تھے کہ تعلیم پوری ہوگی تو نوکری ملے گی اور ان کے دکھ کم ہوں گے۔ مگر اب تو مجھے اپنا آپ گھر والوں پر بوجھ لگنے لگا ہے۔ کئی بار سوچا کہ اپنے آپ کو ختم کرلوں تو شاید لوگ ترس کھا کر میرے گھر والوں کی مدد کردیں۔ ابھی تو مجھ جیسے ہٹے کٹے آدمی کو دیکھ کر کوئی ہماری مجبوری نہیں سمجھتا۔ بابا سائیں کچھ کریں آپ کو نبی کا واسطہ مدد کریں۔

☆ بیٹے ریحان! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ ہمت مت ہارو۔ حالات تنگ ہیں، زندگی مشکل ہے مگر بیٹے زندگی ہے یہ سوچو۔ تم اپنے گھر والوں کے سامنے موجود ہو۔ آج مشکل ہے کل نہیں ہوگی، یقین رکھو۔ ہمت مومن نہیں ہارتا یہی تو پہچان ہے سچے مومن کی۔ ہجرت کرو ہجرت میں برکت ہے۔ اپنے والدین اور بہنوں کو اللہ کے حوالے کرو اور اپنے شہر سے نکلو۔ تعلیم یافتہ ہو کراچی میں تمہیں ضرور نوکری مل جائے گی، چلے آؤ۔ تمہارا دانہ پانی تمہارے شہر میں نہیں ہے۔ نماز پابندی سے ادا کرو درود شریف بہت پڑھو اور عہد کرو کہ جب اللہ تمہیں اس قابل کردے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوجاؤ تب کسی ایک کنبے کی ذمہ داری لے لینا۔ ہم میں سے اکثر لوگ خیرات بھی جان چھڑانے والے انداز میں کرتے ہیں، اگر رقم جمع کرکے کسی ایک خاندان کی مدد کردی جائے تو بہت ثواب ملے گا اور ملتا رہے گا کیونکہ وہ لوگ تاحیات دعائیں دیں گے۔ یارزاق کا ورد کرو اور مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ سمیرا۔ حیدرآباد

☆ بیٹی سمیرا! تم نے خود لکھا کہ تعویذ کے بعد حالات

کچھ بہتر ہیں تو بیٹی رفتہ رفتہ وہ سب بھی ہوگا جو تم چاہتی ہو کیونکہ تمہاری خواہش بالکل جائز ہے۔ بس اپنے ساس سسر کی بہت خدمت کرو۔ اور دیگر معاملات میں خاموشی رکھو، تم دیکھنا جلد خیر ہوگی۔

□ نسیمہ۔ کراچی

☆ بیٹی نسیمہ! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ بیٹے کے لیے تعویذ منگوالو۔ پچھلا تعویذ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ بیٹے کو اب سیٹل ہو جانا چاہیے ورنہ تمہارے گھر کا ماحول بہت تکلیف دہ ہو جائے گا۔ شوہر کے لیے میں کچھ نہیں کہوں گا ان کو اُن کے حال پر چھوڑ دو، اللہ رحم کرے گا۔

□ مینا خان۔ ملتان

○ محترم بابا جان! عرض یہ ہے کہ ہم نے تین سال پہلے یہ گھر خریدا تھا۔ جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں، ہمیں شدید نقصان ہو رہا ہے، جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں، بنتے بنتے کام بگڑ جاتے ہیں، نہ ہی بچوں کو کوئی جاب مل رہی ہے نہ ہی کوئی کام ہو رہا ہے۔ دو چار عالموں سے پتا کروایا ہے، کوئی کہتا ہے کہ آپ کے رشتے دار آپ سے بہت حسد کرتے ہیں۔ آپ رشتے داروں سے دور چلے جائیں تو آپ کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ پر کسی نے کالا جادو کروایا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ کی فیملی پر ہوائی چیزوں کے اثرات ہیں۔ اب کسی نے بتایا ہے کہ آپ کا گھر قبرستان کے پاس ہے، آپ کے گھر جنات کا سایا ہے، آپ فوراً یہ گھر بیچ دیں۔ بابا جی! ہمیں سمجھ نہیں لگ رہی کہ کیا کریں؟ پچھلے سال میں نے اپنے بیٹے عظیم کے کاروبار کے لیے تعویذ بھی منگوایا تھا لیکن اس سے بھی کوئی کام کا سلسلہ نہیں بنا، جو بھی کام کیا ہے، اس میں نقصان ہی ہوا ہے۔ اپنے ذاتی 23، 22 لاکھ کا نقصان ہوا ہے اور اوپر سے دس پندرہ لاکھ کا قرضہ بھی چڑھ گیا ہے۔ بابا جی! میں نے تقریباً گیارہ ماہ حَسبُنَا اللّٰہُ وَنِعمَ الوکیل کا وظیفہ تہجد کے ٹائم 450 مرتبہ یہ بھی کیا ہے۔ آخر میں روزانہ فجر کے بعد سورۃ یٰسین، سورۃ رحمٰن اور سورۃ مزمل پڑھتی ہوں۔ عشاء کے بعد سورۃ واقعہ بھی پڑھتی ہوں لیکن پھر بھی کوئی کام نہیں ہو رہا۔ ہمیں کسی نے بتایا ہے کہ آپ پر جو اثرات ہیں، اس کی وجہ سے آپ کے ہر کام میں رکاوٹ آ رہی ہے۔ بابا جی! ہماری تمام رکاوٹیں ختم ہو جائیں اس کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیں اور یہ بھی بتائیں کہ اگر ہم گھر بیچ کر لاہور شفٹ ہو جائیں تو کیا ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے؟ ہمارے لیے کیا لاہور جانا بہتر رہے گا؟ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا اس سال سی ایس ایس کے پیپر دے رہا ہے اس کے لیے دعا کر دیں کہ اس کا سی ایس ایس کلیئر ہو جائے اور اس کو بہت اچھی جاب بھی مل جائے، اس کو پڑھنے کے لیے کچھ بتا دیں۔ بابا جی! ہمارے پانچ سال پہلے انگلینڈ کے ویزے لگے تھے جو کہ فروری 2016ء میں ختم ہو رہے ہیں۔ بابا جی! ہم نے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے دوبارہ اپلائی کیا تھا لیکن انہوں نے ہماری فیملی کے ویزے refuse کر دیے ہیں۔ بابا جی! ہمارے تمام مسائل کے حل کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیں۔

☆ بیٹی مینا! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ لاہور شفٹ ہونے میں ابتدا میں تو مسائل ہوں گے مگر بعد میں حالات قابو میں آ جائیں گے۔ تم جو کچھ پڑھ رہی ہو پڑھتی رہو بس کچھ دنوں کے لیے سورۃ یٰسین پڑھنا ترک کر دو۔ بیٹے پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر دن میں 5 بار ضرور دم کیا کرو۔

□ اقراء۔ کلر سیداں

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! ''سچی کہانیاں'' میں لوگوں کے مسائل اور آپ کے بتائے ہوئے حل پڑھ کر میں نے سوچا کہ میں بھی اپنا مسئلہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ ہم تین بہن بھائی ہیں۔ ہمارے ابو اور پھوپی چاہتے ہیں کہ ہماری شادی پھوپی کے گھر ہو جبکہ وہ لوگ بالکل جاہل اور اَن پڑھ ہیں۔ ہم بھی اتنے زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں مگر اچھے برے کی تمیز کر سکتے ہیں۔ میری امی، خالہ اور ماموں چاہتے ہیں کہ ہماری شادی خالہ کے گھر ہو۔ خالہ نے ہمارے رشتے کی بات کی بھی تھی مگر یہ بات طے نہ ہو سکی۔ میرے ابو نے صاف انکار کر دیا۔ پلیز، آپ کوئی ایسا تعویذ دیں جس سے ہمارے من کی مرادیں پوری ہو جائیں۔ میں اور میری بہن نماز کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ اگر ہمارا یہ مسئلہ حل ہو گیا تو میں تمام عمر آپ کو دعائیں دیتی رہوں گی۔

☆بیٹی! نماز کی پابندی رکھو اور ذرود شریف بہت پڑھا کرو تعویذ منگوانے کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔ نماز عشاء کے بعد سورۃ واقعہ تین بار پڑھو اور دعا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

☐ صفیہ احمد۔کراچی

○ محترم بزرگ بابا جی! السلام علیکم! میں نے اس وقت آپ سے مدد کی درخواست کی تھی جب میرے سسرال والے میرے شوہر پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کرلیں کیونکہ شادی کے آٹھ سال بعد بھی میری گود ہری نہیں ہوئی تھی اور مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا دی جارہی تھی۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ اولاد نہ ہونے کی سزا صرف عورت کو دی جاتی ہے۔ خیر' اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔ میں نے آپ سے رجوع کیا اور آپ نے مجھے جو وظیفہ اور تعویذ دیا' اسے خلوص دل سے مکمل کیا تو اللہ پاک نے میری دعائیں قبول فرمائیں۔ آپ کا بہت شکریہ بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے تاکہ آپ اسی طرح ضرورت مندوں کے کام آتے رہیں۔

☆بیٹی صفیہ! اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں اولاد نرینہ عطا فرمائے۔ بیٹی! میں تو اس رحیم وکریم کا عاجز اور عاصی بندہ ہوں۔ جو بھی کرتا ہے' وہی مہربان آقا ہی کرتا ہے، اس لیے میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا نہ بھولنا اور نماز پابندی سے جاری رکھنا۔

☐ زرینہ بیگم۔کوٹ لکھپت

○ السلام علیکم! بابا جی! میں نے اپنے شوہر کے روزگار کے لیے آپ سے جو تعویذ منگوایا تھا' اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے تعویذ نے کام دکھایا اور میرا شوہر جو دو سال سے بے روزگار تھا' اسے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں بابا جی! اب آپ کو ہمیشہ دعا دیتی رہوں گی۔

☆بیٹی زرینہ! اللہ تعالیٰ تمہیں شاد وآباد رکھے۔ بیٹی! بگڑے کام وہی غفور الرحیم بناتا ہے جو ہم سب کا مہربان آقا ہے اس لیے میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور نماز باقاعدگی سے پڑھتی رہنا۔

☐ شفق۔اسلام آباد

○ محترم بابا جی! آداب! اللہ آپ کو صحت دے۔ (آمین!) محترم بابا! میں اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ خدا کے لیے' اس کا حل بتا کر مجھے ذہنی اذیت سے نجات دلائیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے ذہن پر ایک جمود ہے' میرے اندر لوگوں کا خوف ہے' میں کسی کو ڈانٹ بھی نہیں سکتی ہوں' میں بزدل نہیں ہوں' میں حق بات کہنا چاہتی ہوں مگر وقت پر میرے ہونٹ سل جاتے ہیں' میں خاموش ہوجاتی ہوں۔ میں ایک چھوٹے سے بچے کو بھی نہیں ڈانٹ سکتی ہوں۔ بابا جی! میں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی ہوں کہ میرے اندر اس قدر برداشت کیوں ہے؟ میرا ذہن وقت پر کام نہیں کرتا ہے' بعد میں معاملہ میری سمجھ میں آتا ہے۔ خدا کے لیے' کوئی ایسی دعا مجھے پڑھنے کو بتائیں کہ میں حق بات کہنا چاہوں تو بلا خوف کہہ دوں۔ میں غلط بات برداشت نہ کروں' فوراً غلط بات کا response دوں۔ میرے اندر لوگوں کا خوف ختم ہو جائے۔ میرے ذہن کا جمود ٹوٹ جائے' میری خاموشی ختم ہوجائے۔

☆بیٹی شفق! یہ بات دماغ سے نکال دو کہ یہ بدعملیات ہیں بلکہ تم میں خود اعتمادی کی بہت کمی ہے۔ لوگوں سے ملا جلا کرو' اچھی کتب کا مطالعہ کرو اور رات کو سونے سے قبل 7 بار سورۃ فلق پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ یہ عمل انسان کو بہت سی مشکلات سے بچاتا ہے۔

☐ فریدہ جہاں۔جھنگ

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! رَبِ کریم آپ پر اپنی رحمتوں کا سایہ فرمائے۔ ''سچی کہانیاں'' میں آپ لوگوں کے مسائل حل فرماتے ہیں۔ ایک مسئلہ میرا بھی ہے کہ میرے چہرے پہ کالا رواں ہے' جس کی وجہ سے چہرہ خراب لگتا ہے۔ برائے کرم کوئی ایسا علاج بتائیں جس سے یہ ختم ہو جائیں اور میرے چہرے کو کوئی نقصان بھی نہ ہو۔ میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔ جنوری کے شمارے میں میرے مسئلے کا حل بتا دیں'

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی ! تمہارا مسئلہ ایسا کوئی سنگین نہیں' کسی بھی اچھے پارلر سے رابطہ کرو۔

□ سیما۔ فیصل آباد

○ محترم بزرگ! السلام علیکم! امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ ربّ العزت آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ اس سے پہلے بھی آپ کو کئی خط پوسٹ کروائے مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ڈاک کی خرابی ہے' آپ تک تو پہنچ جاتے ہیں مگر پھر نہیں پتا؟ بہرحال اب مجھے رسالے میں ہی جلد از جلد جواب دے دیں۔ حالات بہت سنگین ہیں۔ میری عمر 35 سال ہوچکی ہے' اب تک رشتے آئے اور ختم ہوگئے۔ کافی عالموں کو دکھایا۔ تمام حالات بتانے بیٹھ گئی تو کئی کاپیاں بھر جائیں گی۔ اصل مسئلہ جو کھل کر سامنے آیا' وہ یہ ہے کہ میری امی کے ساتھ کوئی سایہ ہے جو کہ شادی سے پہلے کا ہے' اس نے مجھے (بچپن سے)' میری چھوٹی بہن اور ایک بھائی ہم تینوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر کام میں بہت رکاوٹیں ہیں۔ صحت تقریباً ختم ہوچکی ہے۔ کسی سے بھی علاج کرواؤ تو وقتی فائدہ ہوجاتا ہے اور رشتے آنا شروع ہوتے ہیں' یہ وقتی فائدہ مہینہ بھر رہتا ہے۔ کبھی خواب میں دیکھتی ہوں کہ بہت بڑی 5 منزلہ بلڈنگ ہے' وہاں سے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہوں' آگے سیڑھیاں تنگ ہیں اور ابھی میں یہی سوچ رہی ہوں کہ گھر اتنا اچھا ہے اور سیڑھیاں کیسی بنائی ہیں کہ وہ بلڈنگ مجھ پر آگرتی ہے اور آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ اس وقت فجر کی اذان ہورہی تھی اور بھی اسی طرح کے بہت خواب ہیں۔ امید ہے کہ اللہ ربّ العزت آپ کے ہاتھوں اس شیطان سے جان چھڑائیں گے۔ کوئی بہت جلالی وظیفہ اور جو بھی ہدایت دیں' عطا فرمائیں۔ جس بہن اور بھائی کے ساتھ مسئلہ ہے' اُن کا نام بھی لکھ رہی ہوں۔ جلد از جلد جواب دیں۔ بابا جی! ہم بہت پریشان ہیں۔

☆ بیٹی سیما! تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا' بس اللہ سے دُعا کرو اور والدہ سے کہو کہ اپنے نام سے تعویذ منگوا کر گھر میں محفوظ مقام پر رکھیں۔ انشاء اللہ مسائل حل ہوں گے۔

□ سارہ ناز۔ چمن

○ قابلِ احترام بابا جی! السلام علیکم! میں بہت ہی دکھی لڑکی ہوں مگر اپنے دکھ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی کیونکہ والدین جیسے رشتوں کے دکھ کسی اور کو کیسے بتائے جاسکتے ہیں؟ میرے ابو نے دوسری شادی کی ہوئی ہے۔ میں پہلی بیوی سے ہوں۔ اس وقت دادی کے گھر میں رہتی ہوں۔ میرے ابو کو مجھ سے کوئی دلچسپی پیار نہیں' صرف دوسری امی کے بچوں کو پیار کرتے ہیں اور وہ اگر بیمار ہوجائیں تو ان کا علاج توجہ سے کراتے ہیں۔ مجھے کئی سال سے دانتوں اور مسوڑھوں کی بیماری ہوگئی ہے۔ مسوڑھوں سے خون آتا ہے' دانت پیلے اور منہ میں بدبو ہوگئی ہے۔ ٹوتھ پیسٹ وغیرہ سے فرق نہیں پڑتا۔ اس وجہ سے بہت فکرمند اور لوگوں سے دور دور رہتی ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بچپن میں ایک جگہ منگنی کردی گئی تھی۔ وہ لڑکا بری عادتوں میں پڑ گیا ہے مگر اپنا رشتے دار ہے جبکہ غیروں میں رشتہ کرتے نہیں۔ خاندان میں دوسرا لڑکا دکھائی نہیں دیتا۔ ابو کبھی کہتے ہیں' رشتہ کریں گے' کبھی کہتے ہیں' نہیں کریں گے۔ میں بہت فکرمند ہوں۔ کوئی اچھا انسان اللہ تعالیٰ نصیب کرے۔ بابا جی! انٹر کا امتحان دیا ہے۔ میڈیکل میں جانے کی خواہش ہے۔ کوئی دعا بتائیں کہ اچھے نمبر آئیں۔ بابا جی! اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی یتیم کی طرح ہوں۔ ماں دوسرے گھر ہے اور باپ کے گھر میں باپ کا پیار نصیب نہیں۔ سوتیلی ماں کی نوکر بنی ہوئی ہوں۔

☆ بیٹی ! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ سرسوں کا تیل اور نمک ہم وزن ملا کر رکھو اور انگلی کی مدد سے دانتوں میں اچھی طرح لگاؤ پھر نہ تو کلی کرو اور نہ آدھے گھنٹے تک کچھ کھاؤ پیو۔ لعاب تھوک دیا کرو۔ یہ عمل دن میں دو تین دفعہ کرو۔ مکمل افاقہ ہوگا۔ بیٹی! تم معصوم بچی ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہیں زندگی میں بہت خوشیاں عطا فرمائے۔ نماز فجر اور عصر کے بعد 3-3 تسبیح یَانَافِعُ کی پڑھو۔ کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ فرخندہ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا چھوٹا بچہ پیدائشی بیمار ہے۔ اب اس کی عمر چار برس ہے۔ ہم نے اس کا بہت علاج کرایا ہے۔ جب سے پیدا ہوا ہے، کوئی نہ کوئی بیماری لگی رہتی ہے۔ دو تین سال پہلے اس کے کان میں ایک گلٹی ہوئی۔ لوگوں نے کہا کہ اسے اسلام آباد لے جاؤ۔ وہاں سے کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ مختلف قسم کے علاج کراتے کراتے وہ اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ چل پھر نہیں سکتا۔ ایسے لگتا ہے جیسے ڈیڑھ سال کا بچہ ہو۔ ہم اس کو پورے تین مہینے پشاور لے کر جاتے رہے۔ اب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کو دماغ کی بیماری ہوگئی ہے۔ ہم نے اس کے دماغ کا C-T اسکین بھی نکلوایا ہے۔ پشاور والے ڈاکٹروں کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر اس کو دَم دُرود کرائیں تو یہ اور زیادہ خراب ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کون سی بیماری ہے۔ میں نے دُعائے مستجاب کے بارے میں پڑھا تا کہ جس مریض کا علاج ڈاکٹر، حکیم نہ کرسکیں تو اس پر یہ دَم کرو۔ میں نے ایک مرتبہ عصر کی نماز کے بعد دَم کیا اور عشاء کی نماز کے بعد ابھی اس کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کو جھٹکے لگے۔ اس کی حالت بگڑ گئی۔ اس نے پوری رات جھٹکوں میں گزاری۔ ایک دورہ تقریباً تین گھنٹے کا تھا۔ اس کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ ہمیں اسے ہسپتال داخل کرنا پڑا۔ اب اسے ایک بزرگ سے دَم کرا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، اس پر کوئی سایہ ہے۔ بچہ جب ماں کے پیٹ میں تھا، تب اسے سایہ ہوا ہے۔ برائے کرم کوئی حل بتائیں۔

☆ بیٹی فرخندہ! اللہ تعالیٰ بچے کو مکمل شفا دے۔ تم مجھے اگر ڈاکٹری رپورٹس بھیج دو تو میں یہاں ڈاکٹرز سے معلومات کروں گا۔ تمہارے لیے کراچی آنا شاید ممکن نہ ہو۔ ایک دفعہ مرض کا پکڑا جانا ضروری ہے۔ بچے پر صرف سورۃ الناس 9-7 بار نماز عصر اور نماز مغرب کے بعد پڑھ کر دَم کردیا کرو۔ زیتون کے تیل کی مالش ترک کردو۔ اللہ تعالیٰ ضرور کرم فرمائے گا۔

□ ارم۔ کشمیر

○ محترم باباجان! السلام علیکم! کئی سال سے میں "سچی کہانیاں" پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھ نہ سکی۔ میرا پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میری شادی کو 18 سال ہوگئے ہیں۔ پہلے میرے شوہر کڑھائی کی دکان کرتے تھے مگر گھریلو مسئلے کی وجہ سے وہ دکان چھوڑنا پڑی پھر وہ سرکاری محکمے میں کلرک ہوگئے۔ باباجی! میرے پانچ بچے ہیں۔ میرا مہینے کا آخر اتنا پریشان کن گزرتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ دوسرا کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کر نہیں پاتے۔ کئی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے بھی وظیفہ بتا دیں جس سے ہماری پریشانی دور ہوجائے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ باباجی! میں چاہتی ہوں کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جائیں لیکن ان کی پڑھائی میں دلچسپی بہت کم ہے۔ باباجی! میں نماز پڑھتی ہوں۔ بچیاں بھی پڑھتی ہیں مگر میری فجر کی نماز اکثر قضا ہوجاتی ہے جس کا مجھے بہت ملال ہوتا ہے۔ کسی نے میرے شوہر کو نمازِ فجر کے بعد سورۃ رحمٰن اور عشاء کے بعد سورۃ واقعہ پڑھنا بتایا تھا، میں وہ پڑھتی ہوں۔

☆ بیٹی ارم! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ سورۃ رحمٰن پڑھنا جاری رکھو۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر ضرور دَم کردیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔ اللہ تعالیٰ حامی وناصر ہو۔

□ طلحہ احمد۔ گوجرانوالہ

○ باباجان! السلام علیکم! باباجان! اللہ آپ کی عمر لمبی کرے اور اسی طرح آپ لوگوں کے کام آئیں۔ بڑی امید لے کر حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ میرا نام طلحہ احمد ہے۔ والدہ کا نام آمنہ (مرحومہ) ہے۔ میرے والدین کا انتقال ہوچکا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری بہن امریکہ میں رہتی ہے۔ وہ مجھے وہاں بلا کر میری شادی کرانا چاہتی ہے اور میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ گزشتہ ایک سال میں بہن نے جہاں جہاں میرا رشتہ ڈالا، وہاں سے انکار ہوجاتا ہے اس لیے آپ مجھے ایسا وظیفہ دیں جس کے ذریعے میرا مسئلہ ایک مہینے میں حل ہوجائے۔ اس سے پہلے بھی میں نے کئی عاملوں سے رابطہ کیا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ آپ جو وظیفہ دیں، وہ نمازِ عشاء یا فجر کے بعد کا ہو۔ میرے مسئلے کا حل جنوری کے شمارے میں ضرور

شائع کیجیے گا۔ میں آپ کو بہت دُعائیں دوں گا۔

☆ بیٹے طلحہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ مناسب ہوگا‘ تم مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تعویذ کے ہمراہ مختصر سا ورد بھی دوں گا۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ خط کے ساتھ جوابی لفافہ ضرور ارسال کرو جس پر واضح اپنا پتا تحریر کرو۔

☐ فصیحہ۔ کشمور

o محترم بابا جی! السلام علیکم! جب سے میری شادی ہوئی ہے‘ میں نے تکلیف اور پریشانی ہی دیکھی ہے۔ میرا پہلے بیٹا ہوا تھا جو کہ مر گیا اور اس کے بعد 7-6 بیٹیاں ہوئیں جن میں سے 4 زندہ ہیں۔ چار میں سے تین کی شادی ہوگئی ہے اور ایک ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس زمانے سے اب تک میرے شوہر نے کچھ کام کاج نہیں کیا۔ بابا جی! جوانی میں تو مجھے کچھ پتا نہیں چلا‘ اِدھر اُدھر کام کاج کر کے گھر کی ضرورتیں پوری کر لیا کرتی تھی اور شوہر بھی مجھے مار پیٹ کر مجھ سے پیسے لے لیا کرتا تھا۔ اب بھی میرا شوہر کام نہیں کرتا ہے۔ میں پانچ سال تک اپنی بیٹی کے پاس رہی ہوں‘ اب اس سے علیحدہ ہوئی ہوں۔ وہ صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور رات کو 3-4 بجے تک آتا ہے۔ گھر کا سارا سامان بک چکا ہے۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں اس سے علیحدہ ہو جاؤں۔ یٰسین شریف میں مکمل روزانہ پڑھتی ہوں۔ آپ مجھے کوئی آسان سا وظیفہ بتائیں جو میں پڑھ سکوں۔ نماز پابندی سے پڑھتی ہوں۔ تمام عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی فصیحہ! اب بہت دیر ہو چکی ہے‘ علیحدگی کا فیصلہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہاری ذمے داریاں خوش اسلوبی سے مکمل فرمائے۔ نماز عشاء کے بعد 33 بارہ سورۃ اللھب پڑھو اور دعا کرو۔ کرم ہوگا۔ مدت 3 ماہ ہے۔

☐ انیلا۔ کینیڈا

☆ بیٹی انیلا! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نجات صرف نماز میں ہے۔ اللہ کے سامنے سر جھکاؤ اور گڑگڑا کر دعا کرو۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھو یَا اَرحمُ الرّٰحمین مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔

☐ فرخ خان۔ صادق آباد

o بابا جی! عرصہ 15 سال سے آپ کا کالم پڑھ رہا ہوں۔ بہت سے مسائل کا حل بھی آپ ہی کی بدولت ملا۔ بابا جی! اَب جو مسئلہ ہے‘ وہ کافی سنگین ہے۔ میری دو بیٹیاں ہیں‘ دونوں خوش شکل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ بڑی بیٹی کی میں نے اپنے بہت اچھے جاننے والوں میں شادی کی جو صرف 15 دن چلی۔ بیٹی گھر واپس آ گئی اور پھر بچی کی ضد کی وجہ سے ہم نے خلع لے لی۔ لڑکے والے طلاق کے لیے تیار نہیں تھے۔ بیٹی نے کیوں ایسا کیا‘ ہمیں سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت پوچھنے پر بھی اس نے بھی کوئی بات نہیں بتائی۔ اِس بات کو اَب 3 سال ہو گئے۔ وہ اَب ایک گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے لیے بالکل تیار نہیں۔ اکیلے ہی بہت خوش رہتی ہے۔ اَب میں دوسرے مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ چھوٹی بیٹی جو بڑی بیٹی سے 2 سال چھوٹی ہے‘ اُس کی شادی اس سے پوچھ کر مارچ کے مہینے میں کی اور بابا جی! اِس رمضان وہ بھی واپس آ گئی اور کسی طرح واپس جانے کو تیار نہیں۔ بابا جی! ہم میاں بیوی بہت پریشان ہیں۔ چھوٹی بیٹی کے سسرال والے بھی مسئلہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اُس کا شوہر کئی بار گھر یات کرنے آ چکا ہے مگر وہ بہت ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ بابا جی! آپ کو اللہ رسول کا واسطہ میری مدد کریں۔ آخر ہماری بچیوں کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

☆ عزیز فرخ! بعض اوقات انسان کا بڑا بول اُس کے سامنے آ جاتا ہے۔ سوچو‘ کہیں تم نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جو کسی کی دل آزاری کا سبب بنی ہو؟ نماز کی پابندی رکھو۔ دُرود شریف بہت پڑھو اور بچیوں سے کچھ مت کہو۔ خوب صدقہ خیرات کرو۔ ابھی کوئی انتہائی قدم مت اٹھاؤ۔ مناسب ہوگا‘ مجھ سے دونوں بچیوں کے لیے تعویذ منگوا لو۔ تمہاری دونوں بچیاں بدنظر کا شکار ہیں لہٰذا وہ تمہیں کوئی بھی جواب دینے سے قاصر ہیں۔ بہتر بھی یہی ہے کہ اُن سے سوال جواب مت کرو۔ یہ آزمائش ہے۔ اللہ سے مدد کے طلب گار رہو۔ وہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ جب جب یاد آئے‘ آیت الکرسی پڑھ کر بچیوں پر ضرور دَم کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ عائشہ۔ جہلم

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میں ''مسئلہ یہ ہے'' بڑی پابندی اور شوق سے پڑھتی ہوں اور پسند بھی کرتی ہوں۔ جس طرح آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور تندرستی اور لمبی زندگی عطا فرمائے اور آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ (آمین!)

میں آپ کی خدمت میں اپنی نند کا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ اُس کی شادی کو 7 سال ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ دو مرتبہ امید بندھی تھی لیکن...... اُس کا نام رابعہ اور اُس کے شوہر کا نام سلیم ہے۔ اگر آپ اُس کے لیے کوئی وظیفہ اور تعویذ تجویز کردیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وظیفہ وہ خود پڑھے گی۔ آپ محفلِ مراقبہ میں بھی اُس کے لیے دُعا کروا دیجیے گا۔ اگر آپ خط کا جواب جنوری 2016ء کے ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی عائشہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اولاد کے لیے میں تعویذ دیتا ہوں' اس کے لیے مجھ سے جوابی لفافے کے ہمراہ براہِ راست رابطہ کرو۔

□ یاسمین۔ سیالکوٹ

☆ بیٹی یاسمین! نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہارا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور وہ تم نے خود کیا ہے۔ ایک وقت میں ایک شخص ہی غصہ ور ہو تو بات سنبھلنے کی امید ہوتی ہے۔ اگر دونوں فریقین دست و گریباں رہیں تو یہ مناسب نہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہرحال عورت کو ہی قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ نماز کی پابندی رکھو اور جس قدر ممکن ہو' یَاحَافِظُ کا وِرد کیا کرو۔

□ سکینہ۔ کوٹ اڈو

☆ بیٹی سکینہ! تمہارے دو بچے ہیں پھر تم نے ڈاکٹر کی رپورٹ پر کیسے یقین کرلیا؟ نہایت ہی مضحکہ خیز بات ہے۔ بہرحال تم مجھ سے براہ راست رابطہ کرو۔ میں تمہیں تفصیل سے جواب دینا چاہتا ہوں۔ تم بھی مجھے تفصیل سے خط لکھو۔

خدا کا ذکر

ہم خدا کے بارے میں جو گمان رکھتے ہیں، وہ دراصل ہماری اپنی شخصیت کے بارے میں ہمارے گمان کا ایک عکس ہوتا ہے۔ اگر خدا کے ذکر سے ذہن میں محض الزام اور خوف ہی ابھرے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ خوف اور الزام تراشی ہمارے اپنے سینے کی گھٹن میں پنپ رہی ہے۔ اور اگر خدا ہمیں محبت اور شفقت سے چھلکتا ہوا دکھائی دے، تو یقیناً ہم بھی محبت اور شفقت سے چھلک رہے ہیں۔ اُس نے ہم سب کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے لیکن اس کے باوجود ہم سب ایک دوسرے سے مختلف اور یکتا و ممتاز ہیں۔ کوئی بھی دو انسان ایک جیسے نہیں۔ کوئی بھی دو دل یکساں طور پر نہیں دھڑکتے۔ اگر وہ چاہتا کہ سب لوگ ایک جیسے ہو جائیں، تو وہ ان کو ایک جیسا ہی بناتا۔ چنانچہ اب ان اختلافات کی توہین کرنا اور اپنے افکار کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرنا دراصل پروردگارِ عالم کی وقدر اور بلند پایہ حکمت کی توہین کے مترادف ہے

Forty Rules of Love ناول سے اقتباس

انتخاب فاطمہ عنبرین کراچی

اچھے لوگ

ہر شخص اچھا بننے سے زیادہ اچھا نظر آنے کی کوشش میں لگا ہے، اسی لئے شاید "اچھے لوگوں" کی تعداد زیادہ اور اچھائی کم ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد فاروق۔ مالدیپ

غزل

گم ہو گئے ہو غیروں کی چاہت میں اس طرح
کہ شاید تمہیں اب میری ضرورت نہیں رہی
ملتے بھی ہو تو ایسے جیسے اجنبی ہو تم
آنکھوں میں وہ پہلی سی مروت نہیں رہی
بیتے دنوں کی چاہت کا یہ ہی صلہ ہے کیا
اب حال پوچھنے کی بھی فرصت نہیں رہی
دینا ہے ساتھ گر میرا تو پھر ہاتھ تھام لو
یا کہہ دو! تم کو مجھ سے محبت نہیں رہی
دیواریں اونچی ہو گئیں دل اور گھروں کے بیچ
اک دوسرے کو ملنے کی عادت نہیں رہی
خود غرضیوں کی دلدل میں رشتے اتر گئے
اب چاہت و خلوص کی قیمت نہیں رہی
حالات نے ہی سب کو یوں بے حال کر دیا
صدمے بھی اب اٹھانے کی طاقت نہیں رہی
ہر شے اانسانی جان سے مہنگی ترین ہے
انسان اور خلوص کی وقعت نہیں رہی

شاعرہ: رضوانہ کوثر

افسانچہ

اور آخر آج میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا...... کب تب چھپو گی چوں کی آڑ میں، کبھی تو ملو گی پیارے سے لان

میں۔ یقین کرو میں نے تمہارا بے انتہا انتظار کیا۔ تمہیں بہت پیار کرتا رہا ہوں میں۔ مگر تم ظالم مجھ سے چھپتی رہیں۔ حد ہے قسم سے... مجھ سے کیوں ڈرتی ہو... بھی تو...

میری جان آج کہاں بچ پاؤ گی مجھ سے... ہاں بھاگ لو... پر یہ دیکھو میں آ گیا اور... تمہیں پکڑ لیا نہیں نہیں اب نہیں جانے دوں گا۔ لاکھ کوشش کرو خود کو چھڑانے کی آج تو ہو گی دعوت۔ اور بنے گا تمہارا روسٹ... میری بلورانی... میری پڑوسن "مرغی"

زورِ قلم: عظمیٰ شکور، اسلام آباد

شاعری

شعر میں جس بات پر ہزاروں آدمی مشاعروں میں اچھل اچھل کر داد دیتے ہیں وہی بات اگر نثر میں کہہ دی جائے تو پولیس تو بعد کی بات ہے گھر والے ہی سر پھاڑ ڈالیں (مشتاق احمد یوسفی کی تحریر سے ڈاکٹر زعیم مشتاق، اسلام آباد کا انتخاب۔)

شنگریلا جھیل

شنگریلا جھیل پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی ایک خوبصورت جھیل ہے۔ جو کہ سکردو شہر سے بیس منٹ کے ڈرائیو کے فاصلے پر ہے۔ شنگریلا جھیل کی ایک خوبصورتی یہ بھی ہے کہ اس کنارے ایک نہایت ہی دلکش ہوٹل، ٹورسٹ ریزارٹ تعمیر کیا گیا ہے جو کہ یہاں آنے والے سیاحوں کے لیے بہترین قیام گاہ ہے۔ شنگریلا ریزارٹ 1983 میں بنایا گیا اور یہ سکردو بلتستان کا پہلا ٹورسٹ ریزارٹ تھا۔ اس جھیل کا صاف شفاف پانی، خوبصورت نظارے اور فرحت بخش موسم سیاحوں کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں

حسنِ انتخاب: بنت عبدالروف۔ لاہور

چار اشعار

مری وحشتوں کو قرار دے
میں ہوں بے نوا مجھے پیار دے
تری ذات میں رہوں گم سدا
مجھے اس طرح کا خمار دے
مری زندگی ہے عذاب میں
کبھی آ کے اس کو سنوار دے
مری الجھنوں کو سمجھ کے تُو
مرے ساتھ دن گزار دے

شاعر: عامر ثاقی۔ کراچی

جھینگا

سمندری غذاؤں میں مچھلی کے بعد جھینگے بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً بڑے جھینگوں کو انگریزی میں پران اور چھوٹے جھینگوں کو شرمپس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جھینگے صاف کرتے وقت عموماً اُن کی دم، کھال اور اندر کی سیاہ نس کو نکال دیا جاتا ہے۔ جھینگے میں کیلشیم اور پروٹین وافر مقدر میں پائی جاتی ہے۔ جنوبی ایشیاء سے جھینگے پوری دنیا کو فراہم کیے جاتے ہیں۔ جھینگوں کو بریانی میں ڈال کر، تل کر، بیک کر کے یا اُبال کر شوق سے کھایا جاتا ہے۔

زورِ قلم: نبیل جاوید۔ سرگودھا

محبت ہم نے بھی کی تھی

محبت ہم نے بھی کی تھی مگر،
ناکام ہی ٹھہرے
بدنام ہی ٹھہرے
محبت میری ایسی تھی
کہ بس اسی کے نام کی خاطر
اُسی کی صبح کی خاطر
اُسی کی شام کی خاطر
مگر وہ بے وفا
نجانے کتنے لوگوں کا ہم دم تھا
ہمیشہ درد دیتا تھا
عجیب خوش رنگ موسم تھا
اِدھر یہ حال کہ وفا کر کے بھی ہارے ہوئے ہیں
اُدھر وہ رنگ کہ جفائیں راس ہیں اس کو

اِدھر یہ حال کہ سارے سمندر میرے دشمن ہیں
اُدھر وہ شان کہ سارے کنارے اُس کے اپنے ہیں
ستارے اس کے اپنے ہیں
نظارے اس کے اپنے ہیں
محبت ہم نے بھی کی تھی مگر......
ناکام ہی ٹھہرے

شاعرہ: نوشابہ صدیقی۔ کراچی

ماں کا سایہ

لمبی اڑان کے بعد چڑیا اپنے گھونسلے میں پہنچی تو اس کے بچوں نے پوچھا "ماں آسمان کتنا بڑا ہے؟"
چڑیا نے اپنے بچوں کو پروں میں سمیٹ لیا اور بولی
"سو جاؤ بچوں وہ میرے پروں سے چھوٹا ہے۔"
حسنِ انتخاب۔ یوسف لغاری، لیہ

"موت کا سوداگر مر گیا"

کہا جاتا ہے کہ یہ سُرخی 1888ء کو فرانس کے ایک اخبار میں چھپی۔ اِس کے بارے میں دلچسپ بات یہ تھی کہ مرحوم نے بھی پڑھی۔ اخبار کی اِس غلطی پر الفرڈ نوبل کس حد تک محظوظ تو ہوا ہوگا کہ اُس کے بھائی لُڈوِگ کی وفات کو اُس کی وفات سمجھ لیا گیا، مگر اِس کے ساتھ ایک تشویش اور فکر بھی لاحق ہوئی۔ کیا رہتی دُنیا میں مجھے ایسے یاد رکھا جائے گا؟
سویڈن کے اِس موجد اور صنعت کار نے بہت سے تباہ کُن مواد تو بنائے تھے (جن میں ڈائنامائٹ سرِ فہرست ہے)، اور اپنی اسلحے کی صنعت سے کمایا بھی بہت تھا، مگر دُنیا میں اپنا یوں یاد رکھے جانا اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ الفرڈ نوبل اِس واقعے کے بعد آٹھ سال تک زندہ رہا اور اِس دوران اُس نے نہایت خاموشی سے اپنی وصیت میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ جب اُس کی وفات پر یہ وصیت کھولی گئی تو اُس کے تمام عزیز و اقارب حیران رہ گئے۔ اُس نے کسی کو بتائے بغیر اپنی اربوں کی جائیداد کا نوے فیصد سے زائد حصہ ایسے سالانہ انعامات کے لیے وقف کر دیا تھا جو فزکس، کیمسٹری، میڈیکل سائنس، ادب اور امن کے شعبوں میں بہترین خدمات انجام دینے والوں کو دیے جائیں۔ الفرڈ نوبل کی وصیت کے اِس نتیجے کو اب دنیا بھر میں نوبل پرائز کے نام سے جانا جاتا ہے۔
نوبل پرائز۔ الفرڈ نوبل کی وصیت سے اقتباس۔

ابن مُنیب۔ سویڈن

بھلا دیا اُس نے

یہ کیا ہوا مجھ کو بھلا دیا اُس نے
پیغام میری موت کا سنا دیا اُس نے
ایسی بھی کیا خطا تھی اس نازک دل کی
اک آنسو سمجھ کر آنکھ سے گرا دیا اُسی نے
ہم نے تو ہر حال میں پرستش اس کی کی
لیکن یہ کیسا محبت کا صلہ دیا اس نے
اب تو دل میں ہر طرف سناٹوں کا راج ہے
ہر جذبہ جیسے خون میں نہلا دیا اس نے
اب تو یہ خواہش ہے اس دلِ ناتواں میں
تُو بھی اس کو بھول جا تجھے بھلا دیا جس نے
شاعرہ: شمسہ قمر۔ کراچی

ڈزنی ورلڈ کی آسیب زدہ حویلی

ہاؤنٹڈ مینشن نامی آسیب زدہ حویلی میں پورے نو سو ننانوے بھوت آپ کے استقبال کے منتظر ہوں گے۔
یہاں رولر کوسٹر کی رفتار بہت ہی سست ہوگی اس لیے آپ اس قدیم حویلی میں چمگادڑوں کے اڑنے اور بدروحوں کے چیخنے کی آواز بھی صاف سنائی دے گی۔ یہاں ایک میوزیم روم بھی ہے۔ یہاں کئی ہیولے آپ کو موسیقی سنائیں گے۔ جلتی بجھتی موم بتیاں دروازوں کی چرچراہٹ اور نامعلوم نسوانی چیخیں سن کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس آسیب زدہ حویلی میں چھوٹے بچوں کو نہ لے جانا ہی بہتر ہوگا۔ ورنہ وہاں آپ کا ہونے والا نقصان قانون پورا نہیں کرے گا۔
انتخاب: رانا حبیب الرحمٰن۔ سینٹرل جیل لاہور

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یادرہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

ثنا ابڑو.........جیکب آباد

ہماری یاد کا سر پر یہ آنچل کیوں نہیں رہتا
بہت ہی دیر تک آنکھوں میں بادل کیوں نہیں رہتا
میں ہنستی ہوں تو میری آنکھ سے آنسو چھلکتے ہیں
مری آنکھوں کی جھیلوں میں یہ کاجل کیوں نہیں رہتا۔

مور شاہد حسین.........قمبر شہداد کوٹ

عشق کا ظرف بھی کتنا اعلیٰ ہوتا ہے
یہ کم ظرف کو بھی اعلیٰ ظرف بنا دیتا ہے۔

جمیل احمد.........چنزل آباد

آسمان میرا مستقل ٹھکانا ہے
مگر زمیں پہ بھی صدیوں سے آنا جانا ہے
میں پچھلی بار یہاں قیس بن کے آیا تھا
نجانے اب کے محبت نے کیا بنانا ہے

ملک محمد اکرم آحیر.........میانوالی

ہمارے پاس تو اشکوں کی کچھ کمی ہی نہیں
مگر پھر بھی ہم آنکھوں میں نمی رکھا نہیں کرتے

ایم افضل آزاد.........ساہیوال

خون میں نہائے ہوئے جسموں سے پوچھو
اِس زمیں میں جان لٹانے کا مزہ ہے کیا

محمد ندیم عباس میواتی.........چھوکی

کیا خبر دن کی وہ نکلے کہ نہیں
سب چراغوں کو بجھا مت دینا

ارم خان.........ڈی جی خان

نہ پوچھ تقدیر میری کیسی ہے
جیسی ہے

جیسی ہوتی ہے قسمت آنسوؤں کی
میری تقدیر کی قسمت ویسی ہے

عظمیٰ شکور......اسلام آباد

اک بار تو کہا ہوتا...... میرے ہو......
میں زندگی جی لیتی......

یاسر وکی......اوکاڑہ

اس کی عادت وہی ہر بات ادھوری کرنا
اور پھر بات کا مفہوم بدلتے رہنا
جانے کس عمر میں جائے گی یہ عادت اس کی
روٹھنا ہم سے تو اوروں سے الجھتے رہنا

نزاہت انشال.........مہورہ فتح جنگ

میرے الفاظ کی ترتیب پہ برہم کیوں ہے؟
میرے الفاظ میں پوشیدہ ہے جوبات سمجھ
اپنے شاداب حسیں چہرے پہ مغرور نہ ہو
زرد چہروں پہ لکھے ہیں جو سولات سمجھ

نازیہ ناصر خان.........کراچی

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

سید ملازم حسین شیرازی.........ڈسٹرکٹ جیل کوہاٹ

زمانہ لذتِ غم سے آشنا ہی نہیں
کرے گا کیا کوئی سن کر میرے فسانے کو

ایم اشفاق بٹ.........لالہ موسیٰ

گونگے بنے رہے تو بھی مانتے تھے بات
بولے تو، ہم کسی کو بھی قائل نہ کر سکے

روبینہ ناز روبی........فیصل آباد

اشک کی بوند کو مٹی سے بچا کر رکھنا
یہ ٹپک جائے تو مشکل ہے اٹھا کر رکھنا
وہ جو پیتے رہے آنسو وہ بھلا کیا جانیں
قطرۂ اشک کو مژگاں پہ سجا کر رکھنا

منزل خان........کراچی

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

رانا حبیب الرحمن........سینٹرل جیل لاہور

بہت ہی سادہ ہے تُو اور زمانہ ہے عیّار
خدا کرے کہ تجھے شہر کی ہوا نہ لگے
عجیب خواب دکھاتے ہیں ناخدا ہم کو
غرض یہ ہے کہ سفینہ کنارے جا نہ لگے

شاہانہ احمد........کراچی

اب وہ ہرجائی کسی اور سے کہتا ہوگا
تُو میری جان ہے میں تجھ کو بھلا سکتا نہیں

محمد امتیاز عاصم........ساہیوال

گر محبت چاندنی ہے، روشنی ہے، مہر ہے
تو عداوت سازشوں کے جنگلوں کا زہر ہے

صائمہ بشیر........سرگودھا

وقت کے پاؤں میں زنجیر نہیں ہوتی
انسان کے ہاتھ میں تقدیر نہیں ہوتی
پھر کیوں تیری آرزو میں جیے جا رہے ہیں ہم
جب خواب کے مقدر میں تعبیر نہیں ہوتی

کنول جی تنہا........گوگو منڈی

لوگ جس درد سے گریزاں ہیں کنول
میں نے وہ درد سینے میں پال رکھا ہے

ریاض حسین تبسم چوہان........فیصل آباد

سفر نصیبوں کو آخر یہ کون سمجھائے
کہیں اندھیرے میں منزل سجھائی دیتی ہے؟

شعبان کھوسہ........کوئٹہ

لیلیٰ مجنوں کی کہانی، ہو چکی پرانی
آؤ نئے سال میں، نئی محبت کا آغاز کریں ہم

اسامہ بلال اعوان........داروغہ والا

پہلے دیکھا ہوا نہیں ہوتا
کوئی منظر نیا نہیں ہوتا
کہہ رہا ہے یہ شہرِ خاموشاں
کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا

عظیم الدین انصاری........کراچی

عیش آرام نہ دولت دونگا
میں تجھے سچی محبت دونگا
بس ترے ایک تبسم کے عوض
میں تجھے دل کی حکومت دونگا

واصف نبی خان........دھیران۔ سعودی عرب

ہنسنے نہیں دیتا کبھی رونے نہیں دیتا
یہ دل تو کوئی کام بھی ہونے نہیں دیتا
وہ کون ہے؟ اُس سے تو میں واقف بھی نہیں ہوں
جو مجھ کو کسی اور کا ہونے نہیں دیتا

صلاح الدین........ٹنڈو آدم

اِن ہی خوش گمانیوں میں کہیں جاں سے بھی نہ جاؤ
وہ جو چارہ گر نہیں ہے، اسے زخم کیوں دکھاؤ

شازیہ علی........گجرات

درد دل بانٹ کر، دعاؤں سے
کون جھولی کو روز بھرتا ہے

میرا یہ پسندیدہ شعر ''سچی کہانیاں'' کی نذر ہے

نام:

پتا:

کوپن برائے

تیر نیم کش

جنوری 2016ء